احمد ندیم قاسمی نمبر

دنیائے فلم کے عظیم ڈائریکٹر **جیمز کیمرون** کی ناقابل یقین داستان

اُردو ڈائجسٹ

/urdudigest.pk

جولائی 2013ء

احمد ندیم قاسمی

کی زندگی سے بھرپور باتیں اور یادیں

ایوب خاور، جاوید چوہدری، ڈاکٹر خورشید رضوی اور عطاالحق قاسمی کی دل کو چھو لینے والی تحریریں

اسامہ بن لادن ؟

کا سراغ کیسے ملا

امریکی کمانڈو کے سنسنی خیز انکشافات

قیمت: 100 روپے

دماغی طاقت بڑھانے والی 10 غذائیں

انسانی جسم میں طاقت کے عظیم مرکز کی ضرورتوں کا مفید تذکرہ

میرے 450 لوگوں میں سے کوئی دھوکا نہیں دیتا

گھر کے پچھواڑے میں چھوٹے سے ربر پلانٹ لگانے سے 120 ایکڑ میں پھیلی فیکٹری تک کا سفر۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ کا قرآن

ہدایت کی کھلی نشانیاں

اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے تا کہ تم پرہیز گار بنو۔ O (سورۃ البقرہ:183:2)

رمضان کا مہینا (ہے) جس میں قرآن (اول اول) نازل ہوا جو لوگوں کا رہنما ہے اور (جس میں) ہدایت کی کھلی نشانیاں ہیں اور (حق و باطل کو) الگ الگ کرنے والا ہے۔ تو جو کوئی تم میں سے اس مہینا میں موجود ہو تو چاہیے کہ پورے مہینا کے روزے رکھے اور جو بیمار ہو یا سفر میں ہو تو دوسرے دنوں میں ان کا شمار پورا کرلے۔ (سورۃ البقرہ:185:2)

رسول ﷺ کا فرمان

زبان کی حفاظت

رسول کریم ﷺ نے فرمایا: ''قسم اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، روزہ دار کے منہ کی بُو اللہ کے نزدیک مُشک کی خوشبو سے زیادہ پسندیدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''روزے دار میری خاطر کھانا پینا اور شہوت نفس کے تقاضے پورے کرنا چھوڑتا ہے۔ اس لیے روزہ ایک ایسا عمل ہے جو خالصتاً میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا اجر دیتا ہوں اور نیکی کا بدلہ دس گنا دیا جاتا ہے۔'' رسول کریم ﷺ نے فرمایا: ''روزہ ڈھال ہے اور روزہ دار کو چاہیے کہ نہ فحش کلامی کرے اور نہ جاہلوں جیسا (کوئی فضول) کام کرے اور اگر کوئی شخص اس سے لڑے یا اسے گالی دے تو اسے چاہیے کہ اس سے کہہ دے: میں روزے سے ہوں۔'' (بخاری کتاب30: باب:2 مسلم کتاب الصیام۔ باب29)

فہرست

جولائی 2013ء

اس شمارے میں خاص

خدا کرے کہ میری ارضِ پاک پر اُترے

ڈاکٹر خورشید رضوی

161

قاسمی صاحب کی رنگین مزاجی

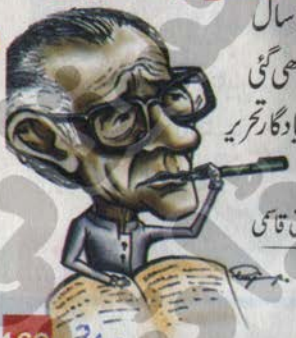

35 سال
پہلے لکھی گئی
ایک یادگار تحریر

عطاالحق قاسمی

169

آئیڈیل پبلک لائبریری
0334-9630911

اسلم خان

100 سال کی کہانی

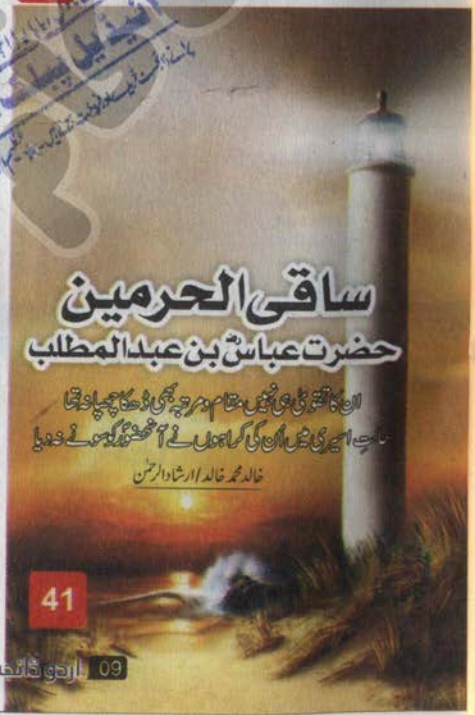

برسوں سے لڑتی اکیسویں صدی کی مہذب دنیا

111

ساقی الحرمین
حضرت عباسؓ بن عبد المطلب

ان کا تقویٰ ہی نہیں مقام و مرتبہ بھی ڈھکا چھپا نہ تھا
حالتِ اسیری میں ان کی کراہوں نے آنحضورؐ کو سونے نہ دیا

خالد محمد خالد / ارشاد الرحمٰن

41

گوشہ رمضان

رمضان المبارک کی قدیم روایات
مصریوں نے خوش ہوکر توپ کا نام ہی "حجہ فاطمہ توپ" رکھ دیا
معظم علی
115

رمضان آرہا ہے
کیا خود کھٹے اور طاری کردہ مشکلیں سہنے سے اللہ زیادہ خوش ہوتا ہے؟
نوید اسلام صدیقی
120

کور اسٹوری

میرے 450 لوگوں میں سے کوئی دھوکا نہیں دیتا
اختر عباس
49

ہم کہاں کھڑے ہیں
بجٹ سازوں کو اپنی سوچ میں تبدیلی لانا، عوام کے زخموں پر فوری طور پر مرہم رکھنا جب کہ قوم کو بھی نئی حکومت کو اچھے نتائج کی آبیاری کے لیے مناسب وقت دینا ہوگا
الطاف حسن قریشی
16

طب و صحت

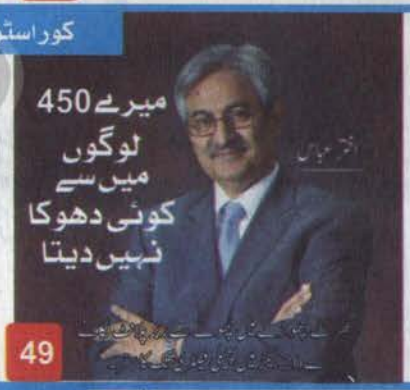

صحت نہیں وزن کم کریں
انوکھے ذائقے اور انوکھی بیماریاں
نوشین ناز
263

دماغی طاقت بڑھانے والی غذائیں
انسانی جسم میں طاقت کے عظیم مرکز کی ضرورتوں کا مفید تذکرہ
ڈاکٹر شائستہ خان
65

طنز و مزاح

خوش دامن
بہو بیگم کی وسعتِ بیاں اور درازیٔ زبان کا حقیقت افروز ماجرا
مبشر الحق عباسی
81

انتخابِ ارسطو پانچ سال بعد
نجی و درباری ماہرینِ تعلیم کا تذکرہ
محمد عمر احسن
86

فیچر

قائداعظم لائبریری
جنرل جیلانی نے فوجی عدالت کو لائبریری میں بدل دیا
حنا انور
254

جیمز کیمرون
اُسے ناکامیوں نے بہت غوطے دیے
124

اردو ادب

زیور کا ڈبا
اُس کی قیمت اور چمک نے دو آنکھیں روشن کر دی تھیں تو وہ بجھا دی تھیں
پریم چند
194

جہاز بیتی
ایک معصوم سے سوال کا زندگی بخش ماجرا
حسن رزاقی
97

فہرست جولائی2013ء

ادارِیہ
15 کچھ اپنی زبان میں — الطاف حسن قریشی

اسلامی زندگی کی کہکشاں
33 اپنے پروانوں کو پھر ذوق خود افروزی دے — عائشہ عباسی
ان کے لیے خاص جو اپنے محسن کو نہیں بھولتے

37 بیٹی نے میری آنکھیں کھول دیں — مریم زین
نرم خو اور نیک نفس بیٹی کی پسند اور جذبے کا سچا ماجرا

طب و صحت
75 9 بازاری غذاؤں سے پرہیز کیجیے — ڈاکٹر نصیر علی
چسکے دار غذائیں ہمارے بدن کو فائدہ کیوں نہیں دیتیں

طنز و مزاح
92 اردو دنیا کے شہنشاہِ ظرافت — شکیل فاروقی
ایک خوش کلام شاعر کا پُر لطف احوال

گوشۂ رمضان
118 قطب شمالی کے آخری شہر ترومسو میں رمضان — محمد ارشد فخرالدین
یہاں یہ سوال سر اٹھاتا ہے کہ فجر اور مغرب کب پڑھیں؟

گوشہ احمد ندیم قاسمی
129 قاسمی صاحب کی کھڑاویں — اختر عباس
اُردو کا 2006ء میں بند ہونے والا دبستان

135 ایلیا کا سردار — جاوید چودھری
ہم یونان کے باسیوں سے 5ہزار سال پیچھے کیوں ہیں

145 کپاس کا پھول — احمد ندیم قاسمی
ایک کرموں جلی مائی کی دل فگار داستان

155 میرے بڑے — ایوب خاور
خوابوں کے شہر لاہور میں بسے ایک خاندان کے سربراہ کا ماجرا

فیچر
207 مفادات کی جنگ — ایرک ونی کوف رفیضان اللہ خان
ایک اور سیارے پر پائی جانے والی زندگی کا احوال

246 خواہشوں کے بے آباد قصبے — رُخسانہ بشیر
خواہشوں کے آگے بند نہ باندھنا بے سکونی کا باعث کیوں بنتا ہے؟

سفر نامہ
225 خان یونس — اختر عباس
غزہ ڈسٹرکٹ کے شہر "خان یونس" کے سفر کا ایک حیران کن باب

شکاریات
216 جنگل سے جنگل تک — حامد مشہود/عزیز احمد لیل
ایک نوخیز شکاری کی سنسنی خیز سچی داستان

241 الاسکا کا بھالو — صبا شفیق
پہاڑوں کے بادشاہ کا خوفناک قصہ

اُردو ادب
177 گھنٹی — نیلوفر اقبال
ایک بے بس گھنٹی کا عبرت اثر قصہ

204 میں اُداس ہوں — غلام مصطفی سولنگی
ایک منتظر ماں کے انتظار کا دلدوز ماجرا

212 آہ کا اثر — عامر سلیم
ایک دُکھی دل سے نکلی آہ اور بددعا کا قصہ

251 تدبیر — بشیر احمد بھٹی
تدبیر جو حیرت انگیز طور پر کام کر گئی

104 یوں تو چھوٹی ہے ذات بکری کی — صالحہ محبوب
سب کے دلوں میں جگہ بنانے والی پالتو بکری کا تذکرہ

108 اپنی تاریخ کا عنوان بدلنا ہے تجھے — مدیحہ انور
کیا نوکری سب لڑکیوں کے لیے عذاب ہے اور توقیر گھٹاتی ہے

258 نورنگر — محمد نورالحسن
اٹھ بلھیا چل خیر منالے نمیں تے بازی لے گئے کتے

261 کڑی دھوپ کا سفر — نبیلہ ثقلین
جس کو دیکھ کر، لوگوں کو اللہ یاد آجائے، وہ دنیا کا خوش نصیب ترین انسان ہے

مستقل سلسلے
قصہ کوتہ (غلام سجاد)، بوجھیں تو جانیں (ادارہ)، چمن خیال (خطوط)، ماہ رواں کی شخصیات (چودھری خلیل)، کتابوں کی کہکشاں (غلام سجاد)، در دل پہ دستک (اختر عباس)

آئیڈیل پبلک لائبریری
0334-9630911

جنابِ وزیرِ اعظم! قائدانہ کردار ادا کیجیے

جمہوری قوتیں بہت شاداں تھی کہ پُر امن انتقالِ اقتدار کے ذریعے مرکز میں ایک مستحکم حکومت قائم ہو گئی اور بلوچستان میں قومیت پرست جماعتیں اقتدار میں آ گئی ہیں۔ مسلم لیگ نون کے قائد جناب نواز شریف نے انتخابی کامیابیوں کے بعد دور رس فیصلے کیے جن کے تحت خیبر پختونخواہ میں پاکستان تحریکِ انصاف کے لیے حکومت سازی کا راستہ ہموار کیا اور بلوچستان میں وزارتِ اعلیٰ کا تاج جناب ڈاکٹر عبدالمالک بلوچ کے سر پر رکھ دیا۔ قائد ایوان منتخب ہونے کے بعد انھوں نے تمام سیاسی جماعتوں کو زیتون کی شاخ پیش کرتے ہوئے انھیں ایک قومی ایجنڈا ترتیب دینے اور وطنِ عزیز کو گردابِ بلا سے نکالنے کی خاطر یکجا ہونے کی دعوت دی۔ حکومت کا آغاز جناب وزیرِاعظم کے اِس ولولہ انگیز بیان سے ہوا کہ سادگی اور کفایت شعاری اختیار کی جائے گی، امانت میں خیانت کی جائے گی نہ اقربا پروری کی کوئی گنجائش ہو گی۔ انھوں نے کابینہ کے پہلے اجلاس میں دوٹوک الفاظ میں کہا کہ مجھے وہی وزیر نہایت عزیز ہو گا جو اپنے فرائض کمال دیانت داری اور ذمے داری سے ادا کرے گا اور عوام کی زیادہ سے زیادہ خدمت بجا لائے گا۔ جناب وزیرِاعظم نے قوم کو یقین دلایا کہ وہ لوڈشیڈنگ سے پیدا ہونے والے اندھیروں کو اجالوں میں تبدیل کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں گے اور کرپشن کو جڑ سے اکھاڑ کر دم لیں گے اور حق وصداقت کی حکمرانی قائم کرنے کی جدوجہد کرتے رہیں گے۔

عوام جو گزشتہ پانچ برسوں سے بدترین حکمرانی، روح کھینچنے والی بدعنوانی، معاشی زبوں حالی اور بڑھتی ہوئی بیروزگاری، مہنگائی، بجلی اور گیس کی لوڈشیڈنگ کے ہاتھوں جاں بلب تھے، انھوں نے قیادت کی تبدیلی پر سکھ کا سانس لیا اور فطری طور پر یہ توقعات بھی وابستہ کر لیں کہ آنے والا بجٹ ان کے زخموں پر مرہم رکھے گا اور ان کے دکھوں کا مداوا ثابت ہو گا۔ مگر حکومت کے ابتدائی دس پندرہ دنوں ہی میں کچھ ایسے واقعات رونما ہوئے جن سے اُمید کی بلند و بالا عمارت میں شگاف پڑنا شروع ہو گئے۔ بجٹ جو بڑی عجلت میں تیار کیا گیا تھا، اس کا تصوراتی فریم ورک بہت خوشنما اور طرحدار تھا اور اس میں طویل المیعاد اہداف کا بصیرت کے ساتھ تعیّن کیا گیا تھا، مگر عام آدمی کو فوری ریلیف دینے پر بہت کم توجہ دی گئی جب کہ جی ایس ٹی کی شرح میں ایک فی صد کے اضافے اور اس میں روزمرہ استعمال میں آنے والی اشیا کی شمولیت سے قیمتوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ دوسری طرف سرکاری ملازمین نے تنخواہوں میں اضافہ کے لیے مظاہرے شروع کر دیے۔ پوسٹ بجٹ بریفنگ میں اخبار نویسوں اور وزیرِ خزانہ اسحٰق ڈار کے مابین ان موضوعات پر سخت مکالمہ ہوا۔ ڈار صاحب یہی کہتے رہے کہ سرکاری ملازمین کی تنخواہوں میں دو ماہ پہلے ہی اضافہ ہو چکا ہے، اس لیے نئے مالی سال میں اضافے کی کوئی گنجائش نہیں۔ لیکن جونہی عوامی دباؤ میں شدت پیدا ہوئی،

جناب وزیرِ خزانہ سرکاری ملازمین کی تنخواہوں میں دس فیصد اضافے کا چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر اعلان کرنے پر مجبور ہو گئے اور اس اعلان پر بھی کہ بے نظیر انکم سپورٹ پروگرام کا نام تبدیل نہیں کیا جائے گا جب کہ اس کا نام بجٹ تقریر میں بدل دینے کا عندیہ دیا گیا تھا۔ اس پورے قضیے میں جناب وزیرِ اعظم کا قائدانہ کردار نظروں سے اوجھل رہا۔ جناب وزیرِ خزانہ نے ایک نجی ٹی وی پر سرکاری ملازمین اور ہائی بریڈ کاروں کے بارے میں جو وضاحت پیش کی، اس نے ان کی اخلاقی حیثیت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا ہے اور حکومت کی ساکھ پر بڑے بڑے سوالات اٹھا دیے ہیں۔

جون کے وسط میں زیارت میں قائدِ اعظم کی آخری رہائش گاہ کو بلوچستان لبریشن آرمی نے نذرِ آتش کر دیا اور یہ پیغام دینے کی ناکام کوشش کی کہ وہ پاکستان کی تاریخ اور نظریے کے نقوش مٹا دینا چاہتی ہے اور بلوچستان میں جن سیاسی جماعتوں نے انتخابات میں حصہ لے کر اقتدار کی ذمے داریاں سنبھالی ہیں، ان کے ساتھ پوری قوت سے جنگ جاری رہے گی۔ اس اندوہناک واقعے کے بعد کوئٹہ میں طالبات کی بس میں خودکش دھماکہ ہوا۔ درجنوں طالبات لقمۂ اجل بنیں اور دہشت گرد بولان میڈیکل کمپلیکس میں جا گھسے اور ان کی بہیمانہ کارروائیوں سے نرسیں، ایف سی کے جوان اور کوئٹہ کے بلند حوصلہ اور فرض شناس ڈپٹی کمشنر جناب عبدالمنصور کاکڑ جامِ شہادت نوش کر گئے۔ ان حملوں کی ذمے داری لشکرِ جھنگوی نے قبول کی ہے جو اس سے قبل ہزارہ قبیلے کے سیکڑوں افراد کو موت کی نیند سلا چکا ہے اور اہلِ تشیع سے بڑی عداوت رکھتا ہے۔ قائدِ اعظم کی ریذیڈنسی کو نذرِ آتش کر دینے اور طالبان کو خون میں نہلا دینے کے خلاف پورے ملک میں احتجاج کا ایک طوفان اُمڈ آیا اور ہر گوشے سے بلوچستان کے ساتھ گہری وابستگی کا اظہار ہوا جو قومی یک جہتی کے مضبوط بندھنوں کا عکاس ہے۔ چار پانچ دنوں پر محیط ان سانحات میں جناب وزیرِ اعظم کچھ دوسری مصروفیتوں میں سرگرداں نظر آئے۔ ان کی طرف سے فقط مذمت کا بیان سامنے آیا جب کہ انھیں قومی اسمبلی میں پالیسی بیان دینا اور قوم کو راہنمائی فراہم کرنا چاہیے تھی۔ غالباً ان کی ہدایت پر وزیرِ داخلہ جناب چودھری نثار علی خاں اور وزیرِ اطلاعات ونشریات جناب پرویز رشید کوئٹہ اور زیارت تشریف لے گئے، مگر واپسی پر جناب وزیرِ داخلہ نے جو کھولتا ہوا بیان پارلیمنٹ میں دیا، اس نے معاملات کو ایک ایسا رخ دے دیا ہے جس کے ناخوشگوار نتائج نکل سکتے ہیں۔

بلاشبہ وفاقی وزراء کا مشکل وقت میں کوئٹہ جانا ایک اچھا اقدام تھا اور بعض حلقے اس خواہش کا اظہار کرتے رہے کہ خود وزیرِ اعظم کو بلوچستان جانا اور صورتِ حال کا نہایت گہرائی سے جائزہ لینا چاہیے تھا۔ لیکن دہشت گردی کے واقعات کی تفتیش مقامی انتظامیہ بہتر طور پر کر سکتی ہے جس کا اسے پورا موقع نہیں ملا اور جناب وزیرِ داخلہ تمام حقائق کی تہہ تک پہنچے بغیر کچے پکے تاثرات کے ساتھ واپس چلے آئے اور لرزہ خیز حوادث کو روکنے میں ناکامی کی تمام تر ذمے داری خفیہ ایجنسیوں اور سیکیورٹی فورسز پر ڈالتے اور فوج کے ذیلی اداروں کو بھی ہدفِ تنقید بناتے رہے۔ ان سے زیادہ درشت لہجے میں جناب محمود خاں اچکزئی نے ''گل افشانی'' فرمائی۔ گویا دہشت گرد طاقتوں کے خلاف

مشترکہ محاذ بنانے کے بجائے فوج اور خفیہ ایجنسیوں پر سنگ باری کا سلسلہ پوری ہیبت ناکی اور یک رخی کے ساتھ شروع ہو گیا۔ وہ بلوچستان، جسے انتخابی عمل میں شامل کرنے اور وہاں استحکام لانے کے لیے اعلیٰ فوجی قیادت نے جو قابلِ تحسین کردار ادا کیا، اسے ایک بار پھر دشمن کی ریشہ دوانیوں کے حوالے کیا۔ یہ نشان دہی تو کی جا سکتی ہے کہ مختلف ایجنسیوں اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کے درمیان انٹیلی جنس شیئرنگ کا کس قدر فقدان ہے اور ان کی پیشہ ورانہ کارکردگی اعلیٰ معیار پر پورا نہیں اترتی، مگر انھیں تمام تر صورتِ حال کا ذمے دار ٹھہرانا اور یہ تاثر دینا کہ ان کے اندر دہشت گردوں کے ''پاسبان'' موجود ہیں، آگ سے کھیلنے کے مترادف ہے۔

وطن کے محافظوں پر تند و تیز حملوں کا سلسلہ ابھی پارلیمنٹ میں جاری تھا کہ لندن سے ایم کیو ایم کے قائد انتہائی کریہہ آواز میں عسکری قیادت پر برس پڑے اور صاف صاف کہہ دیا کہ اگر ہمیں دیوار سے لگایا گیا اور ہم سے قومی شناخت چھین لینے کی گھناؤنی سازش کی کوشش کی گئی تو (خاکمِ بدہن) پاکستان کے ٹوٹ جانے کا اعلان ہو جائے گا۔ چند روز ہی میں حالات کہاں سے کہاں جا پہنچے ہیں۔ بدقسمتی سے خیبر پختونخواہ میں بھی دہشت گردی کے ہولناک واقعات ظہور پذیر ہو رہے ہیں، جہاں ارکانِ اسمبلی ٹارگٹ کیے جا رہے ہیں۔ غالباً تحریکِ انصاف کے جناب عمران مہمند کو موت کی نیند سلانے کے لیے نمازِ جنازہ پر خودکش حملہ کیا گیا جس میں چونتیس شہری شہید اور ساٹھ کے لگ بھگ زخمی ہوئے۔ مذہبی انتہا پسندی اور خونخوار دہشت گردی کے خلاف چونکہ پوری قوم ایک عزم کے ساتھ اُٹھ کھڑی ہوئی ہے، اس لیے وہ آخری دموں پر ہے۔ نئی حکومت کو اس نازک موڑ پر بڑی احتیاط سے قدم اٹھانا اور تمام صحت مند قوتوں کو اپنے ساتھ لے کر چلنا ہوگا۔ ماضی کا گند صاف کرنا بلاشبہ بہت ضروری ہے، مگر سب سے پہلے سامنے کی بلاؤں سے نپٹنا اپنی بقا کے لیے اتنا ہی لازم ہے۔ ہم اس ضمن میں چند تجاویز پیش کرتے ہیں:

1۔ پارلیمانی طرزِ حکومت میں پارلیمنٹ عوام کی طاقت کا سرچشمہ اور قوم کی امنگوں کا محور سمجھی جاتی ہے، چنانچہ جناب وزیرِ اعظم اور ان کے رفقائے کار کو اس کی آواز کو بنیادی اہمیت دینا ہوگی۔ اُن کا قومی اسمبلی سے بالعموم غائب یا غیر متعلق رہنا، ان کی سیاسی طاقت میں کمی کا باعث بنتا جائے گا۔ بھارتی وزیرِ اعظم زیادہ تر پارلیمنٹ ہی سے آپریٹ کرتے اور عوامی نمائندوں کے ساتھ مشاورت میں رہتے ہیں، جب کہ ہمارے بیشتر حکمران یہ تاثر دیتے آئے ہیں کہ وہاں جوتیوں میں دال بٹتی ہے اور وقت فضول باتوں میں ضائع کر دیا جاتا ہے۔ ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ جب اعلیٰ سیاسی قیادت باقاعدگی سے پارلیمنٹ میں آتی رہتی ہے تو ایوان میں نظم بھی قائم رہتا ہے اور بحث کا معیار بھی خوب تر جاتا ہے۔ یہ امر باعثِ تشویش ہے کہ بجٹ کے سیشن میں وزیرِ اعظم بھی زیادہ تر غیر حاضر رہے اور وزیرِ خزانہ بھی مایوس دکھائی دیتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرکاری بینچوں پر براجمان ارکان کے اندر بجٹ کا دفاع کرنے میں بہت کم جوش وخروش دیکھنے میں نہیں آیا، جب کہ مخالف آوازیں پہلو بدل بدل کر حملہ آور ہوتی رہیں۔ کپتان کے بغیر جہاز ڈگمگاتا رہتا ہے۔

2۔ پارلیمنٹ میں ہونے والے مباحث کی روشنی میں کابینہ فیصلے کرتی اور وزرائے کرام ان پر عمل درآمد کے ذمے دار ہوتے ہیں۔ انھیں اپنا بوجھ خود اٹھانے اور آزادی سے کام کرنے کی تربیت دینا ضروری ہے۔ ان کے اہداف کا واضح تعین کرنے کے بعد ان کی کارکردگی کا جائزہ لیا جاتا رہے اور انھیں حکومت کی بنیادی پالیسیوں کے ساتھ منسلک رکھا جائے۔ سیاسی جماعتوں کے اندر اقتدار کی داخلی کشمکش کسی حد تک ایک فطری عمل ہے لیکن اسے محاذ آرائی کی شکل اختیار کرنے کی اجازت نہیں دینا چاہیے۔ جناب سرتاج عزیز اور جناب طارق فاطمی کے درمیان کھلی محاذ آرائی کا جو احوال روزنامہ ڈان میں بیان ہوا ہے، وہ ایک خطرناک رجحان کی غمازی کرتا ہے۔ کابینہ کے باقاعدگی سے اجلاس ہونے چاہئیں تاکہ اجتماعی ذمے داری کا شعور پختہ ہوتا جائے اور دہشت گردی کے خاتمے اور معیشت کی بحالی کے اہداف جلد سے جلد حاصل کیے جاسکیں۔ یہ روایت بھی قائم ہونی چاہیے کہ مہینے یا دو مہینے میں کابینہ کا اجلاس بلوچستان کے کسی بڑے شہر ے میں منعقد ہو اور سندھ کو بھی اہمیت دی جائے۔

3۔ جناب وزیراعظم اور ان کے وزرائے کرام کو سیاسی جماعتوں پر تنقید کرنے سے گریز کرنا چاہیے۔ اس وقت جنگ سیاسی طاقتوں اور نان اسٹیٹ ایکٹرز کے درمیان جاری ہے جس میں سیاسی قوتوں کی فتح یابی حد درجہ لازمی ہے۔ پیپلز پارٹی اور ایم کیو ایم کا کردار سینیٹ اور سندھ اور بالخصوص کراچی کے حوالے سے غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ انھیں قومی امور سے بے دخل کردیے جانے کا احساس ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔

4۔ جناب وزیراعظم کو دباؤ میں آکر جلد بازی میں فیصلے کرنے کے بجائے توازن اور میانہ روی سے کام لینا اور عملی فراست کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ لوگ جانتے ہیں کہ خزانہ خالی ہے اور صنعتیں دم توڑ رہی ہیں۔ اسی لیے بہتری کے لیے کچھ وقت لگے گا۔ اگر ان کے چھوٹے چھوٹے مسائل حل کردیے جائیں تو وہ اچھے دنوں کا خوش دلی سے انتظار کرسکتے ہیں۔ گڈ گورننس کی شکل ابھرتی ہوئی دکھائی دینے لگے تو ان میں نامساعد حالات سے نمٹنے کا حوصلہ پیدا ہوتا رہے گا۔ عوام کو تو بے ہنگم ٹریفک نے بے دم کر رکھا ہے اور ضروری اشیا کی بڑھتی ہوئی قیمتیں ان کے لیے وبال جان بنی ہوئی ہیں۔ قیمتوں پر کنٹرول کا ایک موثر نظام قائم کردینے اور جی ایس ٹی کے پورے فلسفے پر نظرثانی کرنے سے حالات میں قدرے بہتری آسکتی ہے۔ دراصل ہمارے حکمرانوں کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ انھوں نے ایک زمانے سے ملکی معیشت چارٹرڈ اکاؤنٹنٹوں اور فنڈز مینیجروں کے حوالے کر رکھی ہے جن میں ندرت فکر اور سماجی شعور کا بڑا فقدان ہے۔ ہمیں فوری طور پر معیشت دانوں کی طرف رجوع کرنا اور مالی وسائل میں اضافے کے لیے ڈائریکٹ ٹیکسوں کا نظام انصاف کی بنیادوں پر مستحکم کرنا چاہیے۔ اس امر کی اشد ضرورت ہے کہ قومی وسائل کا رخ امیروں سے غریبوں کی طرف موڑ دیا جائے اور بتدریج وہ تمام اقدامات بروئے کار لائے جائیں جن سے عام شہری کی زندگی میں سہولت اور فراخی پیدا ہو۔ بلاشبہ سرمایہ کاری کے لیے سازگار ماحول ازبس ضروری ہے، مگر ملکی وسائل سے فیض یاب ہونے والے صنعت کاروں، بینک کاروں اور بڑے بڑے تاجروں کو ٹیکس نیٹ میں لانا وقت کا اہم ترین تقاضا ہے تاکہ

انسانی وسائل کو ترقی دینے کے لیے وافر سرمایہ دستیاب ہوتا رہے۔

5۔ جناب وزیراعظم کو ایک فعال اور مؤثر قائدانہ کردار ادا کرنے کے لیے منکسر المزاج ہونا اور اس گھمنڈ سے مکمل اجتناب کرنا ہوگا کہ انھیں انتخابات میں عظیم الشان فتوحات حاصل ہوئی ہیں۔ انھیں عظیم کامیابیوں پر اپنے رب کریم کا شکر بجالاتے رہنا اور عوام کا ممنونِ احسان رہنا ہوگا۔ خدا خوفی اور احسان شناسی انھیں فرعون بن جانے سے محفوظ رکھے گی اور انھیں یہ فکر لاحق رہے گا کہ انھیں اقتدار پاکستان کو مسائل کے بھنور سے نکالنے اور اسے شاہراہِ ترقی گامزن کردینے کے لیے ملا ہے۔ انھیں اعلیٰ روایات قائم کرنے کے لیے قرابت داروں اور پیرانِ تسمہ پا سے فاصلہ رکھنا اور انھیں حکومتی امور میں شامل کرنے سے پرہیز کرنا ہوگا۔ انھیں یہ تاثر قائم کرنا ہوگا کہ ان کی جماعت میں تازہ خون رواں دواں ہے اور ہر صوبے سے اہل اور دیانت دار لوگ ان کی ٹیم کا حصہ ہیں۔ اس اہتمام سے قومی یک جہتی کو فروغ ملے گا اور مرکز اور صوبوں کے باہمی رشتے بھی مستحکم ہوں گے۔

6۔ اٹھارہویں ترمیم نے صوبوں کو مالیاتی لحاظ سے مالا مال اور مرکز کو پہلے کے مقابلے میں قلاش کردیا ہے جب کہ وفاق کی ملکی اور غیر ملکی ذمے داریاں آج بھی حد درجہ اہم اور وسیع البنیاد ہیں۔ نئے حالات اس امر کے متقاضی ہیں کہ مرکز اور صوبوں کے روابط خوشگوار بھی ہوں اور ایک دوسرے کے لیے مددگار بھی۔ یہ عجب اتفاق ہے کہ حالیہ انتخابات کے نتیجے میں صوبوں اور مرکز کے اندر مختلف جماعتیں برسرِاقتدار آئی ہیں جن کا سیاسی کلچر اور فکری نہج ایک دوسرے سے خاصی مختلف ہیں۔ پاکستان کو متحد، منظم اور خوشحال رکھنے کے لیے جناب وزیراعظم بہت کلیدی کردار ادا کرسکتے ہیں۔ انھیں ایک تواتر کے ساتھ صوبائی حکومتوں کو یہ احساس دلانا ہوگا کہ وہ ان کے جائز مفادات کے نگہبان اور ان کی ترقی اور خوش حالی کے لیے حقیقی طور پر دلچسپی لے رہے ہیں۔ انھیں خاص طور پر سندھ اور بلوچستان پر توجہ دینا ہوگی اور خیبر پختونخواہ کی قیادت کی طرف دست تعاون دراز کرنا ہوگا۔ اس مقصد کے لیے انھیں بار بار صوبوں کے دورے کرنا اور انھیں یک جہتی کی لڑی میں پروئے رکھنا ہوگا اور صوبائی رابطے کی وزارت اور مشترکہ مفادات کونسل کو حد درجہ فعال بنانا ہوگا۔

7۔ پنجاب کے سوا تینوں صوبے دہشت گردی اور سنگین مسائل کی لپیٹ میں ہیں۔ بلوچستان میں فرقہ وارانہ دہشت گردی کے علاوہ لاپتا افراد اور مسخ شدہ لاشوں کا معاملہ گھمبیر اور پیچیدہ ہوتا جارہا ہے۔ ایک اخباری رپورٹ کے مطابق جسٹس (ر) جاوید اقبال کی سربراہی میں لاپتا افراد پر جو کمیشن قائم ہوا تھا۔ اس نے ایف سی، خفیہ ایجنسیوں اور پولیس کے حاضر سروس حکام پر فوجداری کے مقدمات قائم کرنے کی سفارش کی ہے۔ سندھ میں کراچی کا زخم ناسور بنتا جارہا ہے اور آئے دن لوگ قتل اور اغوا کیے جارہے ہیں اور بدامنی تیزی سے پھیلتی جارہی ہے۔ خیبر پختونخواہ میں بھی حالات بڑے سنگین ہوتے جارہے ہیں۔ ادھر وفاقی دارالحکومت اسلام آباد لینڈ مافیا کے نرغے میں ہے اور ایک انتظامی افراتفری مچی ہوئی ہے۔ ان حالات میں جناب وزیراعظم پر لازم آتا ہے کہ وہ آگے بڑھ کر

قیادت فراہم کریں اور صوبوں میں امن و امان قائم کرنے کے لیے مثبت قوتوں کو قومی پلیٹ فارم پر جمع کریں اور اپنی خوئے دلنوازی سے انھیں شیر وشکر کر دیں۔ اب مشکل یہ آن پڑی ہے کہ اٹھارہویں ترمیم کی رو سے امن کا قیام صوبوں کی ذمہ داری ہے جس میں وفاق مداخلت نہیں کر سکتا جب کہ واقعات کی سنگینی تقاضا کرتی ہے کہ اس عفریت کا مقابلہ مرکز اور صوبے اپنی تمام تر صلاحیت اور وسائل کے ساتھ کریں۔ امریکا میں ریاستوں کو وہ خودمختاری اور آزادی حاصل ہے جس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے، مگر وہاں کی سطح پر ایف بی آئی، سی آئی اے اور ہوم انٹیلی جنس اور متعدد ادارے بہت سرگرم ہیں جو پورے ملک پر نگاہ رکھتے اور معاملات کی چھان بین کرتے رہتے ہیں۔ ہم بھی اگر آئی بی اور ایف آئی اے کو داخلی سلامتی کے تحفظ کے اختیارات سونپ دیں اور قومی سلامتی کی ایک واضح پالیسی وضع کر لیں تو بدامنی پر قابو پانے میں بڑی مدد مل سکے گی اور دہشت گردی کا سدِ باب بھی ممکن ہو سکے گا۔ سیاسی زعماء کے ساتھ مشاورت سے جناب وزیراعظم اس ضمن میں ایک فیصلہ کن قدم اٹھا سکتے ہیں اور اگر ضرورت محسوس ہو تو دستور میں ترمیم بھی کی جا سکتی ہے۔

8۔ اس وقت نئی حکومت کو چند بڑے بڑے چیلنجوں کا سامنا ہے۔ پہلا یہ کہ ڈرون حملے جو ہماری قومی خودمختاری کو پامال کر رہے اور بے گناہ شہریوں کی ہلاکت کا باعث بنے ہوئے ہیں، ان کی روک تھام کیونکر ممکن ہے۔ دوسرا یہ کہ طالبان سے مذاکرات کے ذریعے دہشت گردی پر قابو پانے کے امکانات کس قدر ہیں۔ تیسرا یہ کہ صدر مشرف کے خلاف بغاوت کا مقدمہ چلانے پر عسکری اداروں کا ردِعمل کیا ہوگا۔ چوتھا یہ کہ توانائی کے بحران کا حل تلاش کرنے میں کتنا وقت لگے گا اور اس دوران عوام کی قوت برداشت کا حال کیا ہوگا۔ پانچواں یہ کہ ملک کی لوٹی ہوئی دولت واپس لانے میں کیا کیا خطرات پوشیدہ ہیں۔ ہمارے وزیراعظم انہی گہرے سوالات کا تسلی بخش جواب تلاش کرنے میں سرگرداں ہیں اور تفکرات کے گہرے سائے ان کے چہرے پر ہویدا ہیں۔ انھوں نے وزیراعظم منتخب ہونے کے بعد اسمبلی میں جو تقریر کی، اس میں قطعیت کے ساتھ کہا تھا کہ امریکہ کو ہماری قومی خودمختاری کا احترام کرتے ہوئے ڈرون حملے بند کرنا ہوں گے۔ ان الفاظ پر قومی اسمبلی میں سب سے زیادہ اور بڑی دیر تک ڈیسک بجتے رہے تھے۔ نئی حکومت کے قیام کے چند ہی روز بعد جو ڈرون حملہ ہوا اس پر ہمارے دفتر خارجہ نے پہلی بار امریکی ناظم الامور کو طلب کر کے احتجاجی مراسلہ ان کے حوالے کیا تھا۔ مشیرِ خارجہ جناب سرتاج عزیز نے پارلیمنٹ میں پالیسی بیان دیتے ہوئے اعلان کیا ہے کہ ہم ڈرون حملے روکنے کے لیے تمام تر وسائل بروئے کار لائیں گے۔ ان کی طرف سے یہ اشارے بھی ملے ہیں کہ امریکا اپنی پالیسی پر نظرِ ثانی کے لیے قدرے آمادہ نظر آتا ہے۔ دریں اثنا اقوام متحدہ میں ڈرون حملوں کے قانونی جواز پر بھی بحث چل نکلی ہے۔ غالب امکان یہ ہے کہ پاکستان اپنا مطالبہ امریکا سے منوا لینے میں کامیاب ہو جائے گا، تاہم نئی قیادت کو پبلک ڈپلومیسی کو ازسرِنو منظم کر کے بڑی احتیاط سے قدم آگے بڑھانا اور خارجہ پالیسی میں غیر معمولی توازن قائم رکھنا ہوگا۔

9۔ پاکستانی طالبان سے مذاکرات کی بات بیشتر سیاسی قائدین کرتے آئے ہیں، مگر اس کا ایک قابلِ عمل روڈ

میپ تیار کرنے میں بعض رکاوٹیں حائل ہوتی رہی۔ ایک بڑا سبب یہ ہے کہ عسکری قیادت کے علاوہ ملک میں ایک بڑا طبقہ ان عسکریت پسندوں سے مذاکرات کے حق میں نہیں جو دستور پاکستان کو تسلیم نہیں کرتے، جمہوریت کو اسلام کے خلاف سمجھتے ہیں اور ملک میں ایک ایسی شریعت نافذ کرنا چاہتے ہیں جسے عامۃ المسلمین قبول کرنے کو تیار نہیں۔ یہ بھی ایک تکلیف دہ حقیقت ہے کہ دہشت گردوں نے ہمارے ہزاروں فوجی جوان اور افسر شہید کیے ہیں اور چالیس ہزار سے زائد شہری موت کی نیند سلا چکے ہیں۔ ان کے ہاتھوں مسجدیں محفوظ ہیں نہ امام بارگاہیں، نہ جنازے کی نماز ادا کرنے والے غم گسار۔ ایسے میں نکتہ آغاز کی تلاش جوئے شیر لانے کے مترادف ہے، تاہم صورت حال میں جوہری تبدیلی یہ آئی ہے کہ امریکا افغان طالبان سے قطر میں باقاعدہ مذاکرات کا سلسلہ شروع کرنے والا ہے۔ اس بنیاد پر پاکستانی طالبان کو تشدد کی روش چھوڑنے پر تیار کیا جا سکتا ہے۔ فوج نے جنوبی وزیرستان میں ان کی طاقت پر کاری ضرب لگائی ہے اور اس امر کا امکان پیدا ہو چلا ہے کہ انھیں افغانستان سے کمک پہنچنا بند ہو جائے۔ پاکستانی طالبان چوں چوں کا مربہ ہیں اور ان کی باقاعدہ ہائی کمان موجود نہیں۔ اس کا قوی امکان ہے کہ ان میں سے ایک خاصی بڑی تعداد علمائے کرام کے سمجھانے سے راہ راست پر آجائے اور ہارڈ کور تنہا رہ جائیں۔ انھیں یہ ضمانت دی جا سکتی ہے کہ پاکستان کے دستور میں جو اسلامی اصول درج ہیں، ان کے مطابق معاشرے کی تعمیر کی جائے گی۔ مذاکرات کی کامیابی کے لیے اعلیٰ حوصلگی کے ساتھ ساتھ ریاست کی موثر طاقت بھی دستیاب ہونی چاہیے۔ قرین قیاس ہے کہ عسکری قیادت مذاکرات کی حوصلہ افزائی کرے گی اور امن کی اجتماعی کوششوں کو کامیابی سے ہم کنار کرنے میں اپنا کردار ادا کرے گی۔

10۔ صدر پرویز مشرف کے قومی جرائم بڑے خوں آشام اور دل دہلا دینے والے ہیں۔ ان کے خلاف بلوچستان میں شدید نفرت پائی جاتی ہے اور ان کو قرار واقعی سزا دینے سے وہاں پائی جانے والی شورش میں بڑی کمی آسکتی ہے۔ غالب گمان یہ ہے کہ فوجی ادارے کو بھی ان سے کوئی ہمدردی نہیں۔ کیونکہ ان کی غلط پالیسیوں کے سبب ان کی ساکھ اور اعتبار میں بڑے بڑے شگاف پڑے ہیں اور عوام کی حمایت سے محروم دکھائی دیتا ہے۔ جس کے فوری ازالے کے لیے جنرل اشفاق پرویز کیانی کی طرف سے ایک دانش مندانہ جمہوریت دوست حکمتِ عملی اختیار کی گئی۔ ان سنجیدہ کوششوں کے خاطر خواہ اچھے نتائج برآمد ہوئے اور چار پانچ سال سے عوام اس کی پشت پر کھڑے ہیں۔ فوجی آمر پر مقدمہ چلانے کے سلسلے میں یہ پہلو قابل قدر ہے کہ پاکستان میں آج تک ایک بھی جرنیل کا مواخذہ نہیں ہوا، یہاں تک کہ جنرل یحییٰ خاں بھی فوجی سلامی کے ساتھ دفن کیے گئے جو مشرقی پاکستان میں فوج کی شرمناک شکست اور پیارے وطن کو دولخت کرنے کے ذمے دار تھے۔ جناب نواز شریف نے تو انھیں معاف کر دیا ہے مگر شاید قوم انھیں معاف کرنے پر آمادہ نہ ہو۔ بہتر یہ ہے کہ فیئر ٹرائل کے لیے ایک مناسب ماحول پیدا کیا جائے اور قانون کو اپنا فطری راستہ بنانے دیا جائے۔ یہ بڑا ہی نازک معاملہ ہے جو غیر معمولی احتیاط اور فہم و فراست کا تقاضا کرتا ہے۔ اس میں جلد بازی اور ہیجان انگیزی

سے جس قدر اجتناب کیا جائے وہ اتنا ہی مستقبل کی صورت گری کے لیے بہتر ثابت ہوگا۔

11۔ لوڈشیڈنگ اور توانائی کے بحران سے ہمارے اندر ایک عجیب وغریب نفسیات پرورش پا رہی ہے۔ جس کے بنیادی اجزا ہیں بے یقینی، بے چینی، بے اعتمادی اور مایوسی اور شدید جھنجھلاہٹ شامل ہیں۔ انسانی رویوں میں درندگی اور وحشت بڑھتی جا رہی ہے، انسانی رویے سخت ہوتے جا رہے ہیں اور خودکشی کے رجحانات ایک بیماری کی طرح پھیل رہے ہیں۔ اس نے ہماری معیشت کی بنیادیں ہلا کر رکھ دی ہیں۔ حکومت نے بجٹ میں اس بحران سے نمٹنے کے لیے دو سو ارب سے زائد رقم رکھی ہے اور مختلف اداروں اور تنظیموں سے تجاویز اور سفارشات کی بارش ہو رہی ہے۔ بجلی کی لوڈشیڈنگ میں شبانہ روز محنت سے کس قدر کمی دیکھنے میں آ رہی ہے۔ چوری اور لائن لاسز پر قابو پانے کے لیے دیانت دار اور قابل افراد کو آگے لانا اور کرپٹ عناصر کو عبرت ناک سزائیں دینا وقت کی اہم ضرورت ہیں اور سرکلر ڈیٹ ادا کر دینے سے حالات مزید بہتر ہوتے جائیں گے۔ تاہم دکھ کی بات یہ ہے کہ لاہور جو ہمارے وزیراعظم اور وزیراعلیٰ پنجاب کا شہر ہے، اس میں بجلی چوری ایک باقاعدہ کاروبار کی حیثیت اختیار کر چکی ہے جس میں واپڈا کے ملازمین بھی شامل ہیں۔ صرف اگر لاہور کو بجلی چوری کی لعنت سے نجات دلا دی جائے تو انقلاب کی ابتدا ہو جائے گی۔ حیرت اس بات پر ہے کہ خواجہ آصف کوئی مثبت اور حوصلہ افزا بات کہنے کے بجائے یہ کہتے چلے آ رہے ہیں کہ ہم لوڈشیڈنگ ختم کرنے کی تاریخ نہیں دے سکتے۔ معلوم نہیں کہ ان کے اندر امید کی شمع کیوں مدھم پڑ گئی ہے۔ وہ ابھی تک اپنی وزارت میں ایک بھی شخص کو تبدیل نہیں کر سکے اور پرانے لوگوں ہی پر تکیہ کیے ہوئے ہیں۔ قوم کے اندر مایوسی کے بجائے امید کی جوت جگانا قیادت کا سب سے بڑا کام ہے اور جناب وزیراعظم کو قلب ونظر میں آرزوؤں کی لہریں اٹھانے والی سکون بخش چاندنی کی طرح امید اور یقین کی روشنی پھیلانا ہوگی۔

12۔ وطن کی لوٹی ہوئی دولت کی بازیابی سے ہمارے مالی وسائل میں بے حساب اضافہ ہوگا اور کرپشن کے کلچر پر بہت کاری ضرب لگے گی۔ عوام کے اندر اعتماد پیدا ہوگا کہ ملک میں قانون سب سے زیادہ طاقت ور ہے۔ اس میں کوئی شک ہی نہیں کہ گزشتہ پانچ برسوں میں قومی وسائل کی جو لوٹ کھسوٹ ہوئی ہے وہ ہزارہا گھروں تک پہنچی ہے جس کی واپسی سے عوام کی اقتصادی اور معاشرتی معیار بہت بلند ہو سکتا ہے۔ اس کے لیے جناب وزیراعظم کو ایک آزاد اور خودمختار ادارہ فوری طور پر قائم کرنا اور اسی کے ذریعے بے لاگ مواخذہ کرنا ہوگا۔ مواخذے کا عمل اس قدر شفاف اور انصاف پر مبنی ہو کہ سیاسی انتقام کا شائبہ تک نہ ہونے پائے۔ وزیراعلیٰ پنجاب شہباز شریف نے اپنی جماعت کی رکن اسمبلی نگہت شیخ کا فوری طور پر محاسبہ کر کے ایک اچھی مثال قائم کی ہے۔ قوم یہ اُمید رکھتی ہے کہ جناب وزیراعظم اپنے وطن کے مستقبل پر اعتماد میں اضافہ کرنے کے لیے اپنے صاحبزادگان کا اور اپنا کاروبار پاکستان میں منتقل کرنے کی ایک قابل تقلید مثال کا نقش ثابت کرنے کی خاطر یہ کام بھی کر لیں گے۔ قیادت کا ایسے ہی وقتوں میں امتحان ہوتا ہے۔ اس سے اعتماد کے رشتے فروغ پاتے ہیں۔

الطاف حسن قریشی

کڑے حالات میں امکانات کا بجٹ

بجٹ سازوں کو بھی اپنی سوچ میں تبدیلی لانا، عوام کے زخموں پر فوری طور پر مرہم رکھنا جب کہ قوم کو بھی نئی حکومت کو اچھے نتائج کی آبیاری کے لیے مناسب وقت دینا ہوگا

الطاف حسن قریشی

بجٹ آیا ہے تو اچھے جذبوں کے جلو میں احتجاج کے قافلے بھی نکلے ہیں۔ پانچ سال کی فاقہ مستی کے بعد عوام نے بجٹ سے بہت ساری توقعات وابستہ کر لی تھیں اور وہ فوری ریلیف کی آس لگائے بیٹھے تھے، مگر بجٹ سازوں نے معاشیات کی سمت درست کرنے، اہل پاکستان کو توانائی کے بحران سے نکالنے اور اچھی حکمرانی کا ماحول پیدا کرنے پر زیادہ توجہ دی جس کے دور رس نتائج برآمد ہوں گے، مگر فوری طور پر بجٹ کے اعلانات اور عوام کی توقعات میں ایک خلا نظر آتا ہے اور کچھ ایسے واقعات بھی رونما ہوئے جن سے بجٹ کی نمود سے پہلے ہی ایک سوگوار فضا پیدا ہو چکی تھی۔ ہم دس بارہ صحافی اسلام آباد جانے کے لیے لاہور ایئرپورٹ پہنچے اور موسم کی خرابی کے باعث ہمیں پانچ چھ گھنٹے وہاں انتظار کرنا پڑا۔ اس دوران ہم نے ٹی وی پر فیصل آباد میں پولیس کے مظالم کے اندوہناک مناظر دیکھے جو لوڈشیڈنگ کے خلاف مظاہرہ کرنے والوں کو عبرت کا نشان بنا دینے پر تُلی ہوئی تھی۔ ان واقعات نے ہمیں ہلا کے رکھ دیا۔

12 جون کی سہ پہر ٹھیک پانچ بجے اجلاس شروع ہوا۔ وزیر خزانہ کو اپنی جماعت کے ویژن کے مطابق معاشی فلسفے کی تیاری کے لیے صرف سات روز میسر آئے، مگر انھوں نے اور ان کی ٹیم نے شب و روز کی ذہنی کاوش سے بدترین حالات میں امکانات سے لدھا پھدا بجٹ پیش کر دیا۔ اس میں کچھ خامیاں بھی تھیں، لیکن زیادہ تر جرأت مندانہ فیصلے جھلک رہے تھے جو ایک روشن مستقبل کی خوشخبری دے رہے تھے۔ وہ صوابدیدی اختیارات اور وہ اربوں کے صوابدیدی فنڈز جو وزیراعظم اور وزرائے کرام کو طویل مدت سے دستیاب تھے اور جن کی وجہ سے پورا نظام اچھی حکمرانی سے محروم چلا آ رہا تھا۔ وہ بیک جنبش قلم ختم کر دیئے گئے۔ جناب وزیراعظم نواز شریف

نے ذاتی مثال قائم کرتے ہوئے وزیراعظم ہاؤس آفس کے اخراجات میں 45 فیصد کمی کا اعلان کر دیا اور بجٹ میں غیر ترقیاتی اخراجات میں 30 فیصد تخفیف تجویز کی گئی ہے۔ میرے نزدیک یہ غیر معمولی اہمیت کے انقلابی اقدامات ہیں جو نظم حکومت کا بگاڑ ختم کرنے کے ساتھ ساتھ ہماری قومی زندگی میں ایک بہت بڑی صحت مند تبدیلی لا سکتے اور ملکی تعمیر میں زبردست کردار ادا کرنے کی عظیم صلاحیت رکھتے ہیں۔ ہم تصور ہی نہیں کر سکتے تھے کہ حکمران اپنے شاہانہ صوابدیدی اختیارات اور وسائل اپنے ہم وطنوں کو لوٹا سکتے ہیں۔ مجھے بجٹ میں یہ انقلابی روح بھی نظر آئی کہ معیشت کی دستاویز بندی کا بھی اہتمام کیا جا رہا ہے۔ اس میں کچھ ایسے اقدامات اور فیصلے تجویز کیے گئے ہیں جن کے ذریعے ہماری معیشت کو ڈوکومینٹیشن (Documentation) بالآخر تکمیل پذیر ہو جائے گی اور بہت بڑی تعداد میں اہل ثروت ٹیکس نیٹ میں آجائیں گے۔

ہماری پارلیمانی تاریخ میں ایک عرصے بعد یہ خوشگوار منظر دیکھنے میں آیا کہ بجٹ کے دوران کوئی ہنگامہ ہوا نہ بجٹ کی کاپیاں تار تار کی گئیں اور بجٹ تقریر پوری دلجمعی اور کامل سنجیدگی سے سنی گئی۔ درمیان میں بعض نکات پر ہلکا پھلکا احتجاج بھی ہوا جو شائستگی کے دائرے میں رہا اور بعض اعلانات ایسے تھے جن پر حکومت اور اپوزیشن کے بینچوں پر بیٹھے ارکان اسمبلی نے دل کھول کر داد دی۔ جب وزیر خزانہ کی طرف سے اعلان ہوا کہ ہم سرکلر ڈیٹ دو ماہ کے اندر اندر ادا کر دیں گے جو ساڑھے پانچ سو ارب کے لگ بھگ ہے تو ایوان میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ دوسرے روز پوسٹ بجٹ بریفنگ میں ان پر بڑے تند و تیز سوالات ہوئے جن کا جواب انھوں نے کمال حساب کتاب سے دیا، مگر اس مطالبے کی گونج پھیلتی گئی کہ سرکاری ملازمین کی تنخواہوں میں گرانی کے تناسب سے اضافہ کیا جائے اور دودھ، چینی، گھی، دواؤں اور بجلی پر جو 17 فیصد جی ایس ٹی نافذ کیا گیا ہے۔ اس پر نظر ثانی ضروری ہے۔ جناب اسحٰق ڈار جو اقتصادی معاملات پر کامل دسترس رکھتے اور امریکی ڈکٹیشن کو مسترد کرنے کی روایت کے حامل ہیں، انھوں نے میڈیا اور سیاسی جماعتوں سے بار بار دردمندانہ اپیل کی کہ مشکل وقت میں قومی یک جہتی اور بالغ نظری سے کام لینا اور پوائنٹ اسکورنگ کے بجائے معیشت کی بحالی کے لیے ہم سب کے لیے کمر بستہ ہو جانا ضروری ہے۔ ان کی اپیل میں بڑا کرب بھی تھا اور ناقابل تسخیر عزم بھی۔ میرے دل سے آواز اٹھی کہ قوم کو ان کی اپیل پر لبیک کہتے ہوئے جلد بازی کے مقابلے میں صبر و تحمل کا ثبوت دینا چاہیے۔ کیونکہ ہم جس جہاز پر سوار ہیں اسے ساحل مراد تک بخیر و خوبی پہنچانے کے لیے ہمیں ایثار اور عزم کے ساتھ جت جانا ہوگا۔ اس پریس بریفنگ سے میں نے یہ تاثر لیا کہ ہمارے وزیر خزانہ

کو خوش دلی اور خوش مزاجی کو اپنا شعار بنا لینا چاہیے۔ کیونکہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ جن سیاسی قائدین کو عظیم کارنامے سرانجام دینا ہوتے ہیں وہ دلوں کو مسخر کرنے والے رویے اختیار کرتے ہیں۔

ملکی ترقی کے لیے فزیکل انفراسٹرکچر بڑی اہمیت کا حامل ہے، مگر اس سے کہیں زیادہ اہم وہ شخص ہے وہ اس انفراسٹرکچر کو بروئے کار لانے کی صلاحیت رکھتا ہے، چنانچہ ہمیں صحت مند سماجی رویوں کی تشکیل اور ذہن کی لامحدود صلاحیت کی نشوونما پر سب سے زیادہ دینا ہوگی۔ اس پس منظر میں احسن اقبال نے کہا کہ ہم چھ ماہ کے اندر اندر پلاننگ کمیشن کو کاغذات کے انبار سے نجات دلا دیں گے اور مانیٹرنگ اور فیصلہ سازی کے لیے جدید ٹیکنالوجی استعمال کی جائے گی۔ انھوں نے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے بتایا کہ ہماری معیشت کی صحت یابی کے لیے کڑوی گولی کا استعمال ناگزیر ہو گیا تھا۔ ہم نے سمت کا وضاح تعین کر لیا ہے اور حکومت کی کریڈیبلٹی بحال کرنے کے لیے ٹھوس اقدامات کیے ہیں۔ لہٰذا ہمیں امید ہے کہ قوم ہمارے خلوص کو جواب تعاون کے جذبے سے دے گی۔

میرا داخلی احساس یہ ہے کہ سرکاری ملازمین کے جائز مطالبات مان لینے اور جی ایس ٹی کی مد سے کھانے پینے کی اشیا نکال لینے اور ڈائریکٹ ٹیکس نافذ کرنے سے ایک توازن پیدا کیا جا سکتا ہے۔ ایک زمانے میں ویلتھ ٹیکس، کیپٹل گین ٹیکس اور گفٹ ٹیکس نافذ تھے، ان کی بحالی سے دولت مند لوگوں سے اربوں وصول کیے جا سکیں گے اور امیر اور غریب کا فرق بھی کم ہوگا۔ اس طرح ہمارے شناس وزیر اطلاعات و نشریات جناب پرویز رشید نے یہ اعلان کر کے ہمیں ایک سہانے خواب کی نوید سنائی ہے کہ پی ٹی وی کو پی بی سی کی طرح ایک آزاد اور بلند پایہ ادارہ بنا دیا جائے گا۔ ان کے اس اعلان کے اثرات ہمیں خوش اخلاق اور بلند نگاہ پی آئی او جناب عمران گردیزی کی گفتگو میں پوری طرح محسوس ہوئے جو صحافیوں کے ساتھ ایک بامعنی رشتے کے ارتکاز اور صحت مند سماجی رویوں کی نشوونما کرنے کو بنیادی اہمیت دے رہے تھے۔ حقیقی تبدیلی کی تہریں بلند ہوتی جا رہی ہیں اور عظیم روایات کی بنیادیں رکھی جا رہی ہیں۔ ایسے میں حکومت کے لیے یہ نہایت مناسب ہوگا کہ گھسے پٹے بینک کاروں پر انحصار کرنے کے لیے اعلیٰ دماغ اقتصادی ماہرین کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھائے جو مطلوبہ وسائل کے حصول کے بہتر طریقے تجویز کر سکتے ہیں۔ وزیراعظم نواز شریف کو پوری قوم کے لیے رول ماڈل بننا اور مثبت رویوں کو تقویت فراہم کرنا ہوگی اُدھر قائداعظم ریزیڈنسی زیارت پر حملہ پاکستان پر حملے کے مترادف ہے جس نے قلب و دل بُری طرح زخمی کر دیئے ہیں۔ اہلِ بلوچستان نے بھی یہ دکھ اسی طرح شدت سے محسوس کیا ہے جیسا کہ ملک بھر کے محبِ وطن عوام دکھی ہوئے ہیں۔ ■■■

کوئی دن آسان نہیں

امریکی کمانڈو کی تازہ ترین کتاب سے دلچسپ اور سنسنی خیز واقعات پہلی بار اردو پڑھنے والے قارئین کے لیے

عمیر محمود

رات اپنے نام کی طرح تاریک ہے۔ سیاہ عقاب بھی اسی تاریکی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ اسے ایبٹ آباد کے ایک وسیع و عریض کمپاؤنڈ پہنچنا ہے۔ شہر کی حدود شروع ہو چکی ہیں، یہاں بھی لوڈ شیڈنگ کی وجہ سے اندھیرے کا راج ہے۔

''ہم ایک منٹ میں منزل پر پہنچنے والے ہیں۔''

سیاہ عقاب نامی ہیلی کاپٹر میں سوار کمانڈوز کا وائرلیس سیٹ کھڑکھڑاتا ہے۔ وہ چوکنا ہو جاتے ہیں۔ ایک کمانڈو کورسی کے ذریعے کمپاؤنڈ کے صحن میں اترنا ہے، وہ ہیلی کاپٹر کے دروازے میں پوزیشن لے لیتا ہے۔ ہر چیز پلان کے مطابق ہو رہی ہے، کہ اچانک ہیلی کاپٹر ڈگمگانے لگتا ہے۔ انجن کا شور گڑگڑاہٹ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

''مجھے چھلانگ لگا دینی چاہیے'' کمانڈو خود کلامی کرتا ہے۔

''ہمیں دوسری طرف جانا ہوگا'' اس بار وائرلیس پر آنے والی آواز میں گھبراہٹ ہے۔

سیاہ عقاب کا انجن چیخ رہا ہے۔ آہنی پرندہ ہوا میں اپنا توازن برقرار رکھنے کی کوشش میں ہے۔ کنٹرول سنبھالتے پائلٹوں کے ماتھے پر پسینہ ہے۔

کمانڈو بے چینی سے باہر کی جانب دیکھتا ہے۔

اچانک اسے زمین قریب آتی محسوس ہوتی ہے۔

وہ خود سے کہتا ہے،''اوہ میرے خدا، کیا میں مرنے لگا ہوں۔''

یہ تذکرہ ہے امریکی نیوی کمانڈو کی کتاب ''کوئی دن آسان نہیں'' کا۔ امریکی نیوی کمانڈوز کو عرف عام میں سیل کہا جاتا ہے۔ کتاب کا مصنف اسامہ بن لادن کو مارنے والی ٹیم میں شامل تھا۔ اس نے مشن کی تفصیلات تمام جزئیات کے ساتھ بیان کی ہیں۔

اسامہ بن لادن کا سراغ کیسے ملا؟

امریکی خفیہ ادارہ سی آئی اے نائن الیون دہشت گردی میں ملوث ایک سعودی شہری محمد ابوالقحطانی سے تفتیش کر رہا تھا۔ القحطانی کو امریکا داخلے پر مشکوک جان کر پکڑا گیا، اور واپس دبئی بھیج دیا گیا۔ دسمبر 2001 میں تورا بورا کی لڑائی میں القحطانی پھر پکڑا جاتا ہے اور گوانتانامو بے جیل بھیج دیا جاتا ہے۔ اس سے اسامہ بن لادن کے بارے میں تفتیش کی گئی تو اس نے اسامہ کے پیغام رساں احمد الکویتی کے بارے میں بتایا۔

اسی دوران خالد شیخ محمد بھی امریکا کے ہاتھ لگ گیا۔ خالد شیخ محمد کو نائن الیون حملوں کے ماسٹر مائنڈ کے طور پر جانا جاتا ہے۔ اس نے بھی تفتیش میں اعتراف کیا کہ وہ الکویتی کو جانتا ہے، تاہم اس نے بتایا کہ الکویتی القائدہ کا رکن نہیں ہے۔

2004 میں ایک شخص حسن گل کو پکڑا گیا، جس نے بتایا کہ الکویتی اسامہ بن لادن کا قریبی ساتھی ہے۔

الکویتی کے بارے میں معنی خیز خاموشی

تفتیشی ادارے جانتے تھے کہ احمد الکویتی کا بھائی ابرار الکویتی بھی اسامہ بن لادن کے لیے کام کرتا رہا ہے۔ 2005 میں خالد شیخ محمد کا ایک اور قریبی ساتھی ابوفراج اللبی پکڑا گیا۔ اس سے بھی احمد الکویتی کے بارے میں پوچھ گچھ کی گئی۔ ابوفراج نے بتایا کہ الکویتی کی کوئی اہمیت نہیں۔ اس سے پہلے خالد شیخ محمد بھی اسی قسم کی بات کہہ چکا تھا۔ تفتیش کاروں کو دال میں کالا نظر آیا۔ انہوں نے احمد اور ابرار دونوں کے گھر والوں پر نظر رکھنا شروع کر دی۔

مشکوک ٹیلی فون کال

2010 میں احمد الکویتی کا اپنے گھر والوں سے ٹیلی فونک رابطہ ہوا۔ جاسوس اداروں نے گفتگو سننے کا اہتمام کر رکھا تھا، گھر والوں نے احمد سے پوچھا، وہ آج کل کیا کر رہا ہے؟ احمد نے جواب دیا، وہی جو وہ ہمیشہ کرتا ہے۔ اب جاسوسوں کا شک پکا ہو گیا کہ احمد الکویتی اسامہ بن لادن کے ساتھ ہی ہے۔ انہوں نے ٹیلی فون سگنلز کی مدد سے اسے کھوجنا شروع کر دیا اور آخر کار ڈھونڈ نکالا۔

الکویتی کا ایک بڑے سے گھر میں آنا جانا

جاسوس احمد الکویتی کے تعاقب میں رہتے۔ وہ دیکھتے کہ الکویتی سفید رنگ کی جیپ میں ایبٹ آباد کے ایک وسیع و عریض گھر میں باقاعدگی سے آتا جاتا ہے۔

یوں اسامہ بن لادن کے ایبٹ آباد والے گھر کا سراغ ملا۔

دلچسپ کمپاؤنڈ

امریکی خفیہ ادارے سی آئی اے کے اہلکاروں کو ایبٹ آباد کا وہ کمپاؤنڈ بہت دلچسپ لگا۔ وہ علاقے میں موجود تمام مکانوں سے کہیں بڑا تھا۔ اس میں ٹیلی فون یا انٹرنیٹ کنکشن موجود نہیں تھا، گھر کے مکینوں کا علاقے میں کسی سے بھی ملنا ملانا نہ تھا۔ وہ اپنا کوڑا کرکٹ بھی گھر

کے اندر ہی جلا دیتے۔ گھر کی دیواریں اونچی تھیں، اور سب سے اہم بات یہ کہ تیسری منزل پر موجود بالکونی کی دیوار بھی سات فٹ تک اٹھائی گئی تھی۔ شاید کسی طویل قامت شخص کو چھپانا مقصود تھا۔

چہل قدمی کرنے والا

امریکی اداروں نے ڈرون طیاروں اور سیٹلائٹ کی مدد سے اس کمپاؤنڈ کی نگرانی شروع کر دی۔ انہوں نے دیکھا کہ کمپاؤنڈ میں موجود ایک شخص گھنٹوں صحن میں چہل قدمی کرتا رہتا ہے۔ انہوں نے اس شخص کو ''چہل قدمی کرنے والا'' یعنی Pacer کہنا شروع کر دیا۔ انہوں نے غور کیا، کہ چہل قدمی کرنے والا اکثر اوقات اکیلا ہی ٹہلتا ہے، بعض اوقات اس کے ساتھ کچھ خواتین یا بچے ہوتے ہیں۔ چہل قدمی کے دوران وہ گھر میں کام کرنے والے مختلف افراد کے پاس رک کر ان سے باتیں کرتا ہے، لیکن ان کی مدد نہیں کرتا۔ جب جانوروں کا ڈاکٹر گھر میں موجود بھینس کو دیکھنے آیا، تو بھینس کو دور کے صحن میں باندھا گیا اور معائنہ کرایا گیا۔ گھر والے اس بات کی کوشش کرتے نظر آئے کہ چہل قدمی کرنے والے پر کسی کی نظر نہ پڑے۔ اس سے انہوں نے اندازہ لگایا کہ چہل قدمی کرنے والے کو کوئی بہت اہم مقام حاصل ہے۔

کیا چہل قدمی کرنے والا ہی اسامہ بن لادن ہے؟

نگرانی کرنے والوں کو یقین ہونے لگا کہ چہل قدمی کرنے والا ہی اسامہ بن لادن ہے۔ اس کے بعد سے ایبٹ آباد کے کمپاؤنڈ پر حملے کی منصوبہ بندی شروع کر دی گئی۔ اس کی ذمہ داری امریکی نیوی کمانڈوز کے ایک دستے کو دی گئی اور ان کی تربیت کا عمل شروع ہو گیا۔

تفصیلی تربیت؟

کمانڈوز کی تربیت میں وسائل کا انبار لگا دیا گیا۔ پہلے پہل تو ایبٹ آباد کمپاؤنڈ کی طرز کا ایک ماڈل بنایا گیا، جو اتنا تفصیلی تھا کہ صحن میں لگے درخت اور ڈرائیوے میں کھڑی گاڑیاں بھی دکھائی دیتی تھیں۔ ماڈل میں یہ بھی واضح تھا کہ کمپاؤنڈ کے دروازے کہاں کہاں ہیں، چھت پہ پانی والی ٹینکی کہاں ہے اور پڑوس میں کتنے گھر ہیں اور وہ کہاں کہاں واقع ہیں۔

جو سوال پوچھو گے، جواب ملے گا

کمانڈو اس ماڈل کے تحت حملے کی حکمت عملی وضع کر رہے تھے۔ اس مقصد کے لیے جو معلومات انہیں چاہیے ہوتیں، فوراً سے پہلے فراہم کر دی جاتیں۔

جہاں یہ ساری تیاری کی جا رہی تھی، اس جگہ کو آپریشنز سینٹر کا نام دیا گیا تھا۔ آپریشنز سینٹر میں سبھی کچھ تھا، علاقے کی معلومات، اسامہ بن لادن پر خفیہ اداروں کی رپورٹس، ڈرون طیاروں سے حاصل کی گئی تصاویر، سیٹلائٹ سے لی گئی تصاویر۔ یعنی ہر قسم کی اور ہر زاویے سے تصاویر۔

اندازہ لگائیے

اب اتنی معلومات کی موجودگی میں بھی اگر کسی کے ذہن میں کوئی سوال پیدا ہو جائے، تو جواب دینے کو ایک عملہ موجود تھا۔ اندازہ لگائیے، انہوں نے یہ تک دیکھ رکھا تھا کہ گھر کے داخلی دروازے اندر کی جانب کھلتے ہیں یا باہر کی جانب۔ اسامہ بن لادن کہاں کہاں چہل قدمی کرتا ہے، کمپاؤنڈ میں کون کون رہتا ہے، دروازے کس میٹیریل سے بنائے گئے ہیں اور وہ عموماً لاک رہتے ہیں یا نہیں، گاڑیاں کہاں پارک کی جاتی ہیں۔ سیٹلائٹ اور ڈرون طیاروں سے لی گئی تصاویر گھر کے باہر کی تمام تفصیلات جزئیات کے ساتھ واضح کرتی تھیں۔

حیران کرو، اور مار ڈالو

حملے کی منصوبہ بندی شروع ہو گئی۔ حکمت عملی یہ رکھی گئی کہ اچانک ہلّا بولو، حیران کرو، اور مار ڈالو۔ طے ہوا کہ دو ہیلی کاپٹر مشن میں حصہ لیں گے۔ ایک ہیلی کاپٹر تیسری منزل پر کمانڈوز اتارے گا، دوسرا زمینی منزل پر۔ دو طرفہ حملے میں دونوں ٹیمیں اپنے اپنے اہداف کو نشانہ بنائیں گی۔

یہ بھی پرکھا گیا کہ ایک منصوبہ کسی وجہ سے ناکام ہو جاتا ہے تو فوری طور پر متبادل منصوبہ کیا ہوگا۔ اگر پولیس یا فوج آن پہنچی تو اس سے کیسے نمٹا جائے گا۔ مشن کے دوران عملے کی حفاظت کیسے یقینی بنائی جائے گی، وغیرہ وغیرہ۔ دونوں ہیلی کاپٹروں کے ساتھ ساتھ ایک سنائپر بھی تعینات کیا گیا تاکہ وہ خطرے کو دور سے ہی نشانہ بنا سکے۔

ثبوت مٹ جاتا ورنہ بم باری ہونی تھی

وائٹ ہاؤس نے یہ منصوبہ بھی بنایا کہ فضائیہ کی مدد سے بمباری کر کے کمپاؤنڈ کو ملیامیٹ کر دیا جائے۔ منصوبہ یہ تھا کہ دو ہزار پاؤنڈ وزن کے بتیس سمارٹ بم گرائے جائیں جو سب کچھ تہس نہس کر دیں۔ ان بموں نے زمین کے اندر بھی تیس فٹ تک تباہی مچانی تھی، تاکہ اگر سرنگیں بنائی گئی ہیں تو انہیں بھی ختم کیا جا سکے۔ امریکی حکام کے نزدیک اس کا فائدہ یہ تھا کہ امریکی فوجیوں کو پاکستان میں قدم نہ دھرنے پڑتے اور ان کی جانیں محفوظ رہتیں۔

لیکن پھر یہ منصوبہ قابل عمل نہ سمجھا گیا، کہ اس قسم کی تباہی کے بعد لاشیں شناخت کے قابل نہ رہتیں اور امریکا ثبوت چاہتا تھا کہ مارے جانے والا بن لادن ہی ہے۔

ایک کمپاؤنڈ امریکا میں بھی

کمانڈوز کی تربیت کے لیے پہلے تو اسامہ بن لادن کمپاؤنڈ کا ایک ماڈل بنایا گیا تھا، لیکن جب منصوبہ بندی کر لی گئی اور فیصلہ ہوا کہ حملہ ہیلی کاپٹر کے ذریعے ہی کیا جانا ہے، تو اسامہ بن لادن کے کمپاؤنڈ جیسا ایک کمپاؤنڈ تربیت گاہ میں بھی بنا دیا گیا۔ اس میں حقیقی ہیلی کاپٹروں کے ذریعے حملہ کیا جاتا۔ کمانڈوز رسیوں کے ذریعے اس پر اترتے اور پلان کیے ہوئے اہداف کے مطابق عمل کرتے۔ تفصیل کا خاص خیال رکھا گیا۔ پریکٹس کے لیے بنائے گئے ماڈل کے گرد درخت لگائے گئے۔ ایبٹ آباد کمپاؤنڈ کے صحن میں آلو کاشت کیے گئے تھے، اس تربیتی کمپاؤنڈ میں بھی اسی طرز پر مٹی پھیلا دی گئی۔

کمانڈوز کی درخواست پر کمپاؤنڈ کے ماڈل میں ضروری تبدیلیاں بھی کی جاتیں۔ کمانڈوز نے درخواست کی انہیں کمپاؤنڈ کی تیسری منزل پر بالکونی بنا کر دی جائے، بنا دی گئی۔۔ کہا فلاں دروازہ ادھر نہیں اُدھر بناؤ، بنا دیا گیا..... ان سے سوال نہیں کیے جاتے تھے، جو وہ کہتے تھے، کر دیا جاتا تھا۔ جب بنیادی حملے کی ہر طرح سے پریکٹس کر لی گئی تو پھر اس میں قطع برید کر کے بھی دیکھا گیا۔ مثلاً سوچا گیا کہ گھر کے اوپر اترنے کے بجائے باہر اتر جائے اور حملہ کیا جائے تو کیسا ہو۔ اگر کوئی بھاگنے کی کوشش کرے تو اسے کیسے نشانہ بنایا جائے۔

جلدی کرو، اور انتظار کرو

جلدی کرو اور انتظار کرو بظاہر دو مختلف باتیں ہیں، لیکن اس مشن میں یہی ہو رہا تھا۔ کمانڈوز کو اپنی تمام تیاریاں جلدی جلدی مکمل کرنے کے احکامات تھے، لیکن امریکی انتظامیہ کی جانب سے مشن کی منظوری ہی نہیں آ رہی تھی۔ کمانڈوز اتنی زیادہ ٹریننگ کر چکے تھے کہ تھکنے لگے تھے۔ معاملے پر تفصیلی بریفنگ میں یہ سوالات بھی اٹھائے گئے کہ اگر پاکستانی اہلکاروں سے ٹاکرا ہو گیا تو کیسے نمٹا جائے۔ اس بات پر اتفاق ہوا کہ

طاقت کا استعمال آخری حربہ ہوگا۔ یہ ہدایت بھی جاری کی گئی کہ اگر اسامہ بن لادن نہتا ہوا، اور اس نے خطرہ بننے کی کوشش نہ کی تو اسے زندہ گرفتار کیا جائے گا۔

''آئیڈیاز'' کی بھرمار

جب مشن پلان کرلیا گیا، تربیت مکمل ہوگئی، تو ضمنی چیزوں پر غور ہونے لگا۔ اتنے زیادہ غوروفکر سے ''آئیڈیاز'' کی بھرمار ہوگئی۔ کسی نے کہا کہ ریڈ کے دوران کمپاؤنڈ میں کھڑی گاڑیوں میں سے ایک باہر کھڑی کر کے اس پر پولیس کی لائٹ لگا دی جائے، تاکہ لوگ سمجھیں پاکستانی پولیس ہی کوئی آپریشن کر رہی ہے۔ لیکن جب سوال کیا گیا کہ گاڑی کی چابیاں کہاں سے آئیں گی، اور اسے باہر لے جا کر کھڑا کرنے کا وقت کس کے پاس ہوگا، اور آج کل پاکستانی پولیس کون سی لائٹ استعمال کرتی ہے، تو یہ آئیڈیا دم توڑ گیا۔

ہم ڈرون ڈھونڈنے آئے ہیں

پاکستانی فوج سے ٹاکرے کی صورت بچاؤ کا یہ ''نادر'' آئیڈیا بھی سامنے آیا۔ کمانڈوز سے کہا گیا کہ اگر وہ پاکستانی فوج کے نرغے میں آجائیں تو انہیں بتائیں کہ ہمارا ڈرون گر گیا ہے اور ہم اس کی تلاش میں آئے ہیں۔ یعنی سوچیے۔ جدید ساز وسامان اور اسلحے سے لیس بائیس نیوی سیل دو ہیلی کاپٹروں پر ڈرون ڈھونڈنے آئے ہیں..... اس بات پر خوب قہقہہ پڑا۔

65 ہزار ڈالر کی نائٹ وژن گوگل

آپ نے فلموں میں دیکھا ہوگا، کہ امریکی فوجی ہیلمٹ پہنے پھر رہے ہوتے ہیں، جن میں چار آنکھیں لگی ہوتی ہیں۔ دراصل یہ چار آنکھیں ایک جدید آلہ ہے جو فوجی کو رات کی تاریکی میں بھی واضح دکھاتا ہے۔ اسے نائٹ وژن گوگل کہتے ہیں، یعنی رات کی تاریکی میں دیکھنے کے قابل بنانے والی عینک۔ کتاب پڑھتے ہوئے معلوم ہوا، ایسی ایک عینک 65 ہزار ڈالر مالیت کی ہوتی ہے۔

اسامہ لڑائی کے لیے تیار نہیں تھا

ایک بات نے حیران کیا، اسامہ بن لادن کے کمرے کی تلاشی کے دوران دو ہتھیار ملے، ایک اے کے 47 کلاشنکوف تھی اور ایک مکارو پستول۔ لیکن دونوں ہتھیاروں میں ہی گولیاں موجود نہیں تھیں۔

حملہ ہوا تو منصوبہ بندی کے برعکس حیران کرو اور مار ڈالو والی تدبیر نے کام نہ کیا۔ ایک ہیلی کاپٹر گر گیا، جس سے دھماکا ہوا، کمانڈوز کو اسامہ بن لادن تک پہنچنے کے لیے پہلی دو منزلوں پر مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا، جس سے تاخیر ہوئی، لیکن اتنے وقت کے باوجود اسامہ بن لادن نے اپنے ہتھیار تیار نہ کیے۔ آخر کیا وجہ تھی؟

حرف آخر

کتاب کا نام ''کوئی دن آسان نہیں'' یوں رکھا گیا، کہ امریکی سیلز کے مطابق آسان دن وہ تھا، جو گزر گیا۔ کتاب پر مصنف کا نام مارک اوون درج ہے، لیکن دیباچے میں بیان کیا گیا ہے کہ شناخت چھپانے کے لیے تمام نام تبدیل کر دیے گئے ہیں، یہاں تک کہ مصنف کا نام بھی اصلی نہیں۔ کتاب کے ابتدائی باب انتہائی بور کرتے ہیں جب مصنف اپنی آپ بیتی بیان کرتا ہے۔ بھئی ایک مصنف جو اپنا نام تک چھپا رہا ہے، اس کے حالات زندگی میں کسے دلچسپی ہوگی۔ اسامہ بن لادن کے مشن سے پہلے دیگر مہمات کی تفصیلات بھی بیان کی گئی ہیں جو میرے جیسے ''ٹو دی پوائنٹ'' خبروں کے عادی شخص کو پسند نہیں آئی۔

کتاب کی قیمت 1345 روپے ہے اور یہ ہر بڑے بک اسٹور پر دستیاب ہے۔ ■■■

احساسات کی دنیا

اپنے پروانوں کو پھر ذوقِ خود افروزی دے

ان قیمتی احساسات کا تذکرہ جو بے شک دل کے اندر تو ہوتے ہیں مگر ان کا اظہار تو کیا اقرار بھی نہیں ہو پاتا ان کیلئے خاص جو اپنے محسن کو نہیں بھولتے

عائشہ عباسی

عجب اتفاق ہے کہ صبح و شام جس کی عظمت کے گن گاتے اور جس سے محبت کے بلند بانگ دعوے کرتے ہیں اس کے بارے میں اپنے احساسات قلم بند کرنے کے لیے بیٹھی ہوں تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیا لکھوں۔

اگر سوچنے کا یہی انداز رہا

آج یوں لگ رہا تھا کہ اگر سوچنے کا یہی انداز رہا تو پھر ہمیں غزوۂ تبوک میں پیچھے رہ جانے والے صحابیوں جیسا حال نہ ہو، لیکن الحمدللہ! بہت دن سوچنے کے بعد احساس ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے لیے احساسات تو بے شک موجود تھے، لیکن کبھی سوچا ہی نہ تھا کہ انھیں مسلسل تازہ و بیدار رکھنے کے غور وفکر کا کس قدر فائدہ ہوگا۔ بہرحال میری تحریر مجھے مزید احساس دلانے اور شرمندہ کرنے کے لیے کافی ہوگی کہ جب میں خود ہی ان احساسات کو سپردِ قلم کر کے ان کا جائزہ لوں گی، تو یقیناً احساس ہوگا کہ اتنا عرصہ میں نے مسلسل اپنے آقائے حقیقی کے بارے میں نہ سوچ کر جو گناہِ عظیم کیا ہے اس کا انجام کیسے بھگت پاؤں گی۔

ایک ایک ذرے پر غوروفکر

اللہ تعالیٰ آج کے بعد مجھے توفیق دے کہ میرے احساسات ہمیشہ زندہ رہیں۔ کائنات کے نظام پر، چاند، سورج، ستاروں پر، رات اور دن کے بروقت آنے جانے پر، بادلوں کے برسنے، بجلی کے چمکنے، غرض ایک ایک ذرے پر غور وفکر کر کے میں محسوس کرتی ہوں کہ میرا اللہ اس عظیم کائنات کا اکیلا خالق و مالک ہے۔ اس کی طاقت اس قدر عظیم ہے کہ اس کائنات کی تخلیق میں اور پھر اس کا انتظام سنبھالنے میں اسے کسی قسم کی مدد کی قطعاً ضرورت نہیں۔ وہ کُن کہتا ہے تو ہر چیز خود بخود ہو جاتی ہے، کائنات کے ذرے ذرے پر اس کی حکومت ہے۔

اپنے آپ کو دیکھتی ہوں تو اپنے اللہ کا احسان عظیم یاد آتا ہے کہ میں کچھ بھی نہ تھی، وہ مجھے

عدم سے وجود میں، نیستی سے ہستی میں لایا۔

ترجمہ: (کیا انسان پر لامتناہی زمانے کا ایک وقت ایسا بھی گزرا ہے جب وہ کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا۔)

میرے اللہ نے نہ صرف مجھے پیدا کیا بلکہ مکمل اور خوبصورت انسان کی صورت عطا کی۔ وہ چاہتا تو مجھے جانور یا کچھ اور بنا سکتا تھا، لیکن اس نے مجھے بہترین صلاحیتیں دے کر اس خوبصورت دنیا میں بھیجا تاکہ میں اس کی نعمتوں سے لطف اندوز بھی ہوں اور ہر نعمت سے استفادہ کرنے کے بعد دل کی گہرائیوں سے اس کی حمد وثنا اور شکر بھی ادا کروں۔

وہ مجھ سے بہت پیار کر رہا ہے

میرے اللہ نے میرے لیے ہر قسم کا رزق مہیا فرمایا اور پھر وہ اس قدر رحم کرنے والا ہے کہ میں گناہ کرتی ہوں، اس کے احکام سے غفلت و بے اعتنائی برتتی ہوں، لیکن میرا رحم کرنے والا مہربان آقا نہ میرے رزق میں کمی کرتا ہے نہ مجھ پر ہوا اور روشنی بند کرتا ہے بلکہ اس کی رحمت وشفقت میرے دل کے اندر گناہ کرنے پر ندامت وشرمندگی کے جذبات پیدا کرتی ہے پھر جب میں رو کر اس کے حضور اپنے گناہوں کی معافی مانگتی ہوں تو وہ مجھے اپنی رحمت کے دامن میں سمیٹ لیتا ہے۔ میرے دل کو سکون واطمینان کی نعمت لازوال سے بھر دیتا ہے۔ اس وقت شدت سے احساس ہوتا ہے کہ میرا اللہ واقعی مجھ سے بہت پیار کرتا ہے، لیکن میں اس کی محبت کا حق ادا کرنے میں ہمیشہ کوتاہی کرتی ہوں۔ یہ حق ادا کر ہی نہیں سکتی۔

میں اس کی ملکیت ہوں

میرا اللہ تمام کائنات کا مالک ہے، لیکن اپنی بے پناہ محبت کے سبب، باوجود اس کے کہ میں خود اس کی ملکیت ہوں، اس نے بہت ساری چیزیں میری ملکیت میں دے دی ہیں۔ سوچتی ہوں بھلا اس میں کیا مصلحت ہوگی تو محسوس ہوتا ہے کہ میرا مالک مجھے اپنی محبت کا یقین دلاتا ہے کہ میں نے کائنات تمھارے لیے پیدا کی ہے۔ لیکن تمھیں یعنی عائشہ کو صرف اور صرف اپنے لیے پیدا کیا ہے کہ تم اپنے مالکِ حقیقی کی نعمتوں اور بخششوں کا ہر دم شکر ادا کرتی رہو۔ قربان جاؤں اپنے اللہ کی رحمت کے۔ پھر اس نے میرے اندر یہ احساس بھی رکھا کہ اگر میں واقعی اس کی بندگی اور اس کا شکر ادا نہیں کروں گی، تو وہ مجھ سے روٹھ جائے گا اور روزِ محشر اپنے دیدار سے بھی محروم رکھے گا، اس کی رضا میرا مقدر نہ بنے گی۔

مجھے شدت سے احساس ہوتا ہے کہ میرا اللہ تو اتنا عظیم ہے کہ میری اطاعت یا نافرمانی اسے نہ کوئی فائدہ دے سکتی ہے اور نہ نقصان، لیکن پھر وہی تقاضائے محبت، میرا اللہ نہیں چاہتا کہ عائشہ دوزخ کا ایندھن بنے، چنانچہ اس نے مجھے محبت سے، نرمی سے، ڈانٹ کر، غرض ہر طریقے سے دوزخ کے برے انجام سے ڈرا کر بار بار جھنجھوڑا کہ عائشہ بُری بن کر بُرے انجام سے دوچار ہونے سے بچ جا۔ پھر اس نے میرے لیے اس کا پورا پورا انتظام بھی کر دیا کہ اگر میں خود کو سنوارنا چاہوں تو آسانی سے سنوار لوں۔

دو نگہبان

میرے لیے قرآن جو سراپا نورِ ہدایت ہے اور پھر معلّم قرآن، جو سراپا رحمت وشفقت ہیں، بھیجے۔ مجھ پر میرے مالک کا بے حد احسان ہے کہ اس نے مجھے اپنے پیارے نبی ﷺ کا اُمتی بنایا۔ اُس نبی ﷺ کی امت میں پیدا کیا جسے اس نے اپنا محبوب کہا۔ جسے عبدیت کا انتہائی مقام بخشا۔ مجھے اس پیارے رسول ﷺ کا امتی

بنایا جس کی اطاعت واتباع کروں تو میرا مالک خود بخود مجھ سے راضی ہو جائے اور مجھ سے محبت بھی کرے۔

ہاں! آج جب اپنے احساسات کا جائزہ لے رہی ہوں تو شدت سے یہ بھی محسوس کر رہی ہوں کہ اگر اللہ چاہتا تو مجھے ایمان واسلام کی نعمت سے بھی تو محروم رکھ سکتا تھا۔ لیکن مجھے بغیر کسی محنت وکوشش کے میرے اللہ نے ایمان واسلام عطا کیا اور پھر یہ شعور بھی بخشا کہ میں صرف نسلی مسلمان رہنے پر ہی قناعت نہ کر بیٹھوں بلکہ شعوری مسلمان بننے کی کوشش کروں۔

جب میں کوئی کام کرنے لگتی ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ ایک عظیم قوت کی مالک ہستی میرے قول وفعل پر نگاہ رکھے ہوئے ہے، اس نے میرے ساتھ دو نگہبان لگا دیئے ہیں جو میری باتوں اور کاموں کا ریکارڈ تیار کر رہے ہیں۔ یہ احساس مجھے برائی سے روکتا ہے۔

مجھے اللہ تعالیٰ کی ستاری وغفاری کا بھی اکثر احساس رہتا ہے۔ بشری تقاضے سے کوئی گناہ کر بیٹھتی ہوں تو ڈرتی ہوں کہ لوگ اس پر مطلع نہ ہو جائیں۔ پھر اللہ کے حضور گڑگڑاتی ہوں تو میرا اللہ مجھے اپنے در سے دھتکار نہیں دیتا، بلکہ مجھ پر رحم کھاتا ہے۔ میری دعا قبول کرتا ہے اور میرے عیب چھپا لیتا ہے۔

وہ غصے میں کیوں نہیں آتا

جب اپنے اللہ کے عدل کے بارے میں سوچتی ہوں تو اچھے کاموں کے لیے دل میں زیادہ رغبت پیدا ہوتی ہے۔ میرا ایمان ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ دنیا وآخرت میں مجھ سے راضی ہو کر جنت الفردوس، یعنی اپنی رضا والا مقام عطا فرمائے گا تو یہ صرف اور صرف اس کی رحمت ہوگی۔ میرے اعمال تو میرے لیے محض مصیبت کا باعث ہی بن سکتے ہیں۔ چنانچہ جب اللہ تعالیٰ کے عدل کا خیال دل میں آتا ہے تو یہی خیال کرتی ہوں کہ اگر میں نے اچھا بننے کی کوشش نہ کی، تو قیامت کے دن میرا عادل مولا کہے گا کہ عائشہ نے بھلا کوشش بھی کتنی کی تھی کہ آج میں اسے ویسا ہی اچھا مقام دے دوں جیسا اچھا کام کرنے کی کوشش کرنے والوں کو دیا ہے تو یہ احساس بھی اطاعت پر آمادہ کرتا ہے۔

مجھے اپنے اللہ کے علم وبرداشت کا بھی بے حد احساس ہوتا ہے۔ میرے اعمال کا تقاضا تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے فوراً سزا دے دے اور اسے اس کی قدرت بھی حاصل ہے، لیکن تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں کہ وہ مجھ گنہگار کو میرے مجرم ہونے کے باوجود سزا نہیں دیتا وہ نہ غصے میں آتا ہے نہ غضب میں، بلکہ میری خطاؤں سے چشم پوشی فرماتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی مجھ پر اس قدر نعمتیں اور احسانات ہیں کہ پوری زندگی اس کا شکر ادا کرتی رہوں، تو حق ادا نہیں کر سکتی، لیکن نعمتوں کی افراط سے اپنے اللہ کے لیے محسوس کرتی ہوں کہ وہ شکور ہے، میں تھوڑی سی اطاعت کرتی ہوں تو وہ خوش ہو کر اور عطا کرتا ہے اور پھر وعدہ بھی فرماتا ہے: اور ساتھ ہی کفرانِ نعمت سے ڈرا بھی دیتا ہے۔

(اگر شکر گزار بنو گے تو میں تم کو اور زیادہ نوازوں گا اور اگر کفرانِ نعمت کرو گے تو میری سزا بہت سخت ہے۔)

شہ رگ سے بھی قریب

اللہ تعالیٰ نے مجھے بتایا کہ اے عائشہ! میں حسیب بھی ہوں۔ میں قیامت کے روز تمھارے ایک ایک عمل کا حساب لوں گا، لہٰذا تم ابھی سے اپنے اعمال میں محتاط ہو جاؤ، ایسا نہ ہو کہ اس دن مجرموں کے کٹہرے میں کھڑی ہو اور کچھ عذر پیش نہ کر سکو۔ حساب کے بارے

میں سوچتی ہوں تو خوف کے ساتھ ساتھ بہترین احساسات میرے اندر پیدا ہوتے ہیں کہ میں حتی المقدور اچھے کام کروں اور برائی سے اپنے آپ کو روکے رکھوں۔ حساب دینے کا احساس اکثر اوقات برائی سے روک دیتا ہے۔

جب کوئی دعا مانگتی ہوں تو دل میں اس قدر یقین ہوتا ہے کہ میرا آقا میری دعا ضرور قبول کرے گا۔ پھر وہ میری پکار کا جواب دیتا ہے اور مجھے بتاتا ہے:

نَحنُ اَقرَبُ اِلَیہِ مِن جَبلِ الوَرِید

(ہم اس انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس سے قریب ہیں۔)

جب کوئی دعا پوری نہ بھی ہو تو احساس رہتا ہے کہ میرے آقا نے مجھے یقین دلایا ہے کہ میری جو دعا پوری نہ ہوئی وہ آخرت میں میرے لیے محفوظ ہوگئی، یا مجھ پر کوئی مصیبت آنی تھی جو اس دعا کی بدولت ٹل گئی تو دعا کا قبول نہ ہونا بھی اطمینان کا باعث بن جاتا ہے۔

عام طور پر مجھے اللہ تعالیٰ کی محبت جو اسے مجھ سے ہے، کا بے حد احساس رہتا ہے۔ اس کی ہر صفت پر جب غور کرتی ہوں تو اس میں محبت کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور نکلتا ہے۔ اگر وہ مجھے بتاتا ہے کہ میں قہار، جبار، عزیز و منتقم، مہیمن اور متکبر ہوں تو درحقیقت یہ بھی اس کی محبت کا تقاضا ہے کہ اگر اس نے مجھے رحیم و کریم جیسی محبت بھری صفات کے ذریعے ہدایت کی راہ دکھائی ہے اور میں نہیں مانی، تو اس کی محبت مزید جوش میں آتی ہے اور وہ مجھے ڈرا کر اپنی نافرمانی سے روکتا ہے۔ غرض ان دنوں جب خوب غور و خوض سے اللہ تعالیٰ کے بارے میں اپنے احساسات کو ٹٹولا تو احساس ہوا کہ درحقیقت میرے تمام احساسات و جذبات صرف اور صرف اللہ کے لیے ہونے چاہئیں۔ ایم اے عربی کی کلاس میں بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کے لیے بہت پیارے احساسات دل میں پاتی ہوں کہ اگر وہ فضل نہ فرماتا تو آج کسی اوٹ پٹانگ شعبے میں مصروف کار ہوتی۔

اگر کچھ عرصہ اپنی غفلت کی وجہ سے ان احساسات کو تازہ نہیں رکھا تو لگتا تھا کہ صرف چند احساسات ہی اللہ کے لیے ہیں اور جب صحیح معنوں میں ان کا جائزہ لیا، کوشش سے انھیں زندہ و بیدار کیا اور از سر نو انھیں پیدا کیا، تو یوں لگ رہا ہے کہ اتنے ڈھیر سارے احساسات کے اظہار کے لیے کاغذ کے چار صفحات تو بالکل ہی ناکافی ہیں، کیونکہ زندگی کے ہر لمحے میں اللہ تعالیٰ کے ان وافر احسانات، انعامات اور تعلق و واسطے میں کہ اگر کسی قسم کی گفتگو نہ بھی کی جائے، تو موضوعِ سخن کے لیے ان احساسات کا اظہار ہی کافی ہے۔ جیسا کہ اس وقت اس نعمت کا احساس بھی شدت سے ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی گنہگار بندی عائشہ پر یہ بھی تو رحمتیں کی ہے کہ اسے اتنا شعور و فہم عطا کیا اسے بہترین پیارے پیارے دوست دیئے جو اللہ کی راہ میں اس کے ساتھی و معاون ہیں۔ اپنے اللہ کے بارے میں اپنے احساسات سپردِ قلم کرتے ہوئے جائزہ لے کر اندازہ کر سکتی ہوں کہ درحقیقت میرے احساسات کس حد تک اللہ کے لیے ہونے چاہئیں تھے اور اب کس حد تک ہیں۔ ■■■

اس محبت بھرے موضوع پر آپ بھی اپنے دل و ذہن سے مکالمہ کریں اور پھر اپنے جذبات اور احساسات ہم تک پہنچائیے تاکہ ہم بھی اپنے قارئین کو محبت اور قربت کی اس خوشبو سے روشناس کرائیں۔ بہترین تحریر پر انعامی تحفہ بھی دیا جائے گا۔ (ایڈیٹر)

سچا واقعہ

بیٹی نے میری آنکھیں کھول دیں

نرم خو اور نیک نفس بیٹی کی پسند اور جذبے کا سچا ماجرا
تبدیلی کبھی یوں بھی دل دروازے پر آ کر بیٹھ جاتی ہے

مریم زین

میں آٹھ برس سے شوہر کے ساتھ دبئی میں مقیم ہوں۔ فیس بک یا سکائپ کے ذریعے پاکستان میں رشتے داروں سے رابطہ رہتا ہے۔ چند دن قبل میں دبئی ہی میں مقیم اپنی ایک سہیلی کا فیس بک صفحہ دیکھ رہی تھی کہ اچانک میری نگاہ اس کی لکھی تحریر پر پڑی۔ لکھا تھا:

''ہم فطرتاً قرآن پاک کی طرف راغب ہوتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کو جاننے کی تمنا کرنا ہماری فطرت میں شامل ہے۔ لیکن انسان جوں جوں بڑا ہوتا ہے، دنیاوی اشیا اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لیتی ہیں۔ مثلاً ٹیلی ویژن، موسیقی، کمپیوٹر اور دیگر سرگرمیاں۔ تب قرآن مجید ہمیں بور لگنے لگتا ہے۔ اُسے کوئی پڑھے بھی تو صرف مذہبی فرض جان کر یا حصولِ برکت کے لئے پڑھتا ہے۔

''والدین کا فرض ہے کہ وہ اپنے بچوں کو قرآن پاک کی جانب راغب کریں۔ لیکن انہیں بھی دنیاوی سرگرمیوں کی طرف سے سخت مقابلے کا سامنا رہتا ہے۔ بچے جیسے جیسے بڑے ہوں، دنیاوی چیزیں اور سرگرمیاں انہیں اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں۔ رفتہ رفتہ وہ پھر اپنی معصومیت کھو بیٹھتے ہیں۔''

مجھے یہ تحریر بہت پسند آئی اور میں نے ''لائک'' (پسند) کا بٹن دبا دیا۔ لیکن سہیلی کی چشم کشا تحریر نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر ڈالا۔ میں سوچنے لگی کہ آج قرآن پاک میری زندگی میں کیا کردار ادا کر رہا ہے، خصوصاً جب میں تین بچوں کی ماں بن چکی؟

کیا میں باقاعدگی سے قرآن پڑھتی اور ہر آیت میں پوشیدہ معنی سمجھنے کی سعی کرتی ہوں؟ کیا قرآن سے کوئی نئی بات سیکھنے پر مجھ میں جوش و جذبہ جنم لیتا ہے؟ میں چند بٹن کلک کر کے فیس بک تک پہنچ جاتی ہوں، لیکن دن میں کبھی اپنی مرضی سے قرآن پاک کھولنے اور اُسے سمجھنے کی کوشش کی؟

میں نے درج بالا سوالات کے الٹے سیدھے جواب دے کر خود کو مطمئن کرنا چاہا۔ پھر میں اپنے بچوں کا سوچنے لگی۔ میری چھ سالہ بڑی بیٹی مطالعے کی شوقین ہے۔ بچوں کے انسائیکلو پیڈیا سمیت ہر قسم کی کتب و رسائل پڑھتی اور پھر مجھ سے بڑے دقیق سوالات کرتی ہے۔ میں نے سوچا، وہ قرآن پاک پڑھ کر اُس سے کیا پائے گی؟

میں چھوٹی ہی تھی کہ امی نے ایک استانی لگوا دی۔ وہ مجھے قرآن پاک پڑھانے باقاعدگی سے آنے لگیں۔ میرے والدین نے سبھی بچوں کو بڑے اہتمام سے قرآن پاک پڑھایا اور اسلامی تعلیمات سے روشناس کرایا۔ میں بھی ایک کمپیوٹر پروگرام ''الفرقان'' کی مدد سے بیٹی کو قرآن پاک پڑھنا سکھا رہی تھی۔ یہ کمپیوٹر پروگرام بتاتا ہے کہ قرآنی الفاظ صحیح مخرج کے ساتھ کیونکر ادا کیے جائیں۔

بیٹی کو قرآن مجید پڑھنا سکھاتے ہوئے مجھے شدت سے احساس ہوا کہ میری عربی بہت کمزور ہے۔ گو میں نے اپنے سبھی بہن بھائیوں کی طرح قرآن پاک کے کچھ پارے حفظ بھی کیے تھے، لیکن میں بیشتر الفاظ کا مطلب نہیں جانتی تھی۔ اور مجھے شرمندگی تھی کہ میں آیات میں موجود معانی سے بھی نا آشنا تھی۔

جب میں اپنی بیٹی کو الفرقان پروگرام کی مدد سے قرآن پاک پڑھانے لگی، تو اس نے بڑی دلچسپی لی۔ مجھے یہ جان کر حیرت اور خوشی ہوئی کہ وہ توقع کے برعکس بڑی آسانی سے قرآن پاک پڑھنے لگی۔ یہ نازک مرحلہ سہل بنانے کی خاطر میں نے ایک عرب قاریہ کی خدمات بھی حاصل کرلیں۔

ایک دن کتابوں کی دکان میں مجھے بچوں کے لیے انگریزی میں تفسیر کی کتب نظر آئیں۔ ان میں آسان زبان میں آیات قرآنی کے معنی سمجھائے گئے تھے۔ نیز چھوٹے بچوں کے لیے پُرلطف سرگرمیوں کا سامان بھی موجود تھا۔ میں نے فوراً قرآن کی پہلی سورۃ (سورۃ فاتحہ) اور آخری دس سورتوں کی تفاسیر خرید لیں۔ پاکستان میں بچوں کو پہلے یہی مختصر اور آسان سورتیں پڑھائی اور حفظ کرائی جاتی ہیں۔

اللہ کا شکر ہے کہ میری بیٹی جلد ہی روانی سے قرآن پاک کا آخری پارہ پڑھنے لگی۔ اس نے کئی آیات یاد بھی کرلیں۔ دراصل وہ عربی بولنے والے ماحول میں پیدا ہوئی تھی۔ مجھے بعد میں احساس ہوا کہ اسی ماحول کے باعث بیٹی قرآن پاک رواں اور شستہ انداز میں پڑھنے لگی۔ لیکن یہ بھی تو حقیقت ہے کہ بچے بڑے معصوم اور سادہ ہوتے اور صاف و شفاف دل رکھتے ہیں۔

جب کچھ عرصہ گزر گیا، تو بیٹی قرآن پاک سے روشناس ہوگئی۔ تب تفاسیر سے مسلح ہوکر میں شام کو بیٹی کے ساتھ ہر آیت تفصیل سے پڑھنے لگی۔ اس کا جوش و جذبہ دیکھنے والا ہوتا۔ مطالعے سے قبل وہ تفاسیر کی اپنی کتب قطار میں سجا دیتی۔ تب خوشی اور احساس فخر سے اس کا چہرہ تمتما رہا ہوتا۔ چونکہ ہم والدین کو کتب خریدنے کا شوق تھا، لہٰذا گھر میں لائبریری بن چکی تھی۔ لیکن تفاسیر کی کتب پر بیٹی سب سے زیادہ فخر کرتی۔

ہم ایک کتاب لیتے اور ساتھ بیٹھ کر پڑھنے لگتے۔ وہ ہر جملے پر رکتی، آنکھیں کھول کر غور کرتی اور پھر چکرا دینے والے مزید سوالات پوچھتی جن کے جواب مجھے دینے ہوتے۔ کبھی وہ چھوٹے بھائی کے ساتھ معمے حل کرتی یا

رنگ بھرتی۔ کبھی صرف مطالعہ اُسے تسکین بخش دیتا۔

جب میری بیٹی قرآن پاک کی گہرائی میں اتر رہی تھی، مجھ پر ایک انکشاف ہوا۔۔۔ مجھے احساس ہوا کہ بیٹی کی نسبت اللہ کی کتاب سے شناسا ہونے کا میرا جذبہ کہیں ادنیٰ ہے۔ وہ لہک لہک کر بڑے مزے سے آیات پڑھتی اور ان کے معنی دل میں اتارنے کی سعی کرتی۔ جب کسی آیت کا مفہوم سمجھ نہ آتا، تو بڑے جذبے سے خوب غور و فکر کرتی اور مطلب تک پہنچ کر ہی دم لیتی۔

مجھ میں ضمیر کی چبھن اس وقت عروج پر جا پہنچی جب ہم نے مل کر سورۃ اللہب کا مطالعہ کیا۔ بیٹی نے کرید کرید کر مجھ سے اسلام کے کٹر دشمن، ابولہب کی داستان سنی اور جانا کہ دنیا میں ایسے شیطان نما انسان بھی بستے ہیں۔

یوں چھ سالہ معصوم بچی نے پہلی بار دنیا کا نیا اور منفی پہلو دیکھا۔ شیطان اور اس کے شر کے متعلق جان کر بیٹی جلد سمجھ گئی کہ دنیا میں ابولہب جیسے شر انگیز اور گناہ گار بھی بستے ہیں۔ تب اس نے ایک غیر متوقع فیصلہ کیا جو مجھے حیران کر گیا۔۔۔ بیٹی نے طے کیا کہ وہ مستقبل میں ابولہب جیسے انسانوں کا مقابلہ کرنے کی خاطر اللہ تعالیٰ سے مدد لے گی اور اسی سے اپنی حفاظت چاہے گی۔

رفتہ رفتہ مجھے احساس ہوا کہ وہ محض چھ برس کی عمر میں قرآن پاک کی شیدائی بن چکی ہے۔ سونے سے قبل من پسند آیات پڑھتی۔ کھانے کے وقت جب ہم محو گفتگو ہوتے، تو قرآن کی آیات کے بروقت حوالے دے کر ہمیں دم بخود کر دیتی۔ وہ پھر ہمیں پُریقین نظروں سے دیکھتی جیسے جاننا چاہ رہی ہو کہ اس نے متعلقہ آیت کو درست سمجھا ہے نا!

میرے قلب کی گہرائیوں میں یہی تمنا بسی ہے کہ میری بچی خوب دل لگا کر قرآن پاک پڑھے، اس کے معنی اپنے اندر جذب کرلے اور اُسے ساری زندگی کے لیے مشعل راہ بنالے۔ مجھے یقین ہے کہ بہت سے مسلم والدین اپنے بچوں کے لیے ایسا ہی خواب دیکھتے ہیں۔

لیکن جیسا کہ میری سہیلی کی تحریر نے افشا کیا، جوں جوں مسلمان بڑے ہوں، وہ دنیاوی آلودگیوں کا شکار ہوکر سیدھی راہ سے بھٹک جاتے ہیں۔ اور جب قلب لذت و شہوت کا مرکز بن جائے، تو آہستہ آہستہ قرآن پاک سے رغبت و محبت کم ہو جاتی ہے، خصوصاً جب بدی کے کام کرتے ہوئے لطف بھی آئے۔

ہم نے اپنے بچوں کو خاصی آزادی دے رکھی ہے۔ لیکن جب میں بیٹی کو قرآن پڑھانے لگی، تو مجھے محسوس ہوا کہ مکروہات دنیا سے بچانے کے واسطے ان پر کچھ پابندیاں لگانا بھی ضروری ہے۔ چناں چہ انہیں ٹی وی تو دیکھنے دیا، مگر وہ بچوں کے پروگرام ہی دیکھ سکتے تھے۔ میں نے اس بات کو یقینی بنایا کہ ان کی زیادہ سے زیادہ سرگرمیاں قرآنی احکامات کے دائرے میں رہتے ہوئے ہی انجام پائیں۔

قرآن کو طاق پر نہ رکھیے

میں ایسے خاندانوں سے واقف ہوں جنھوں نے کبھی قرآن پاک گھر میں نہیں رکھا۔ لہٰذا وہاں قرآن سے انجان نئی نسل پروان چڑھی۔ اس نسل کا جو حشر ہوا، وہ بھی میری نگاہوں کے سامنے سے گزرا۔ گو ایسے لوگ بظاہر مسلمان تھے، مگر انھیں کبھی قرآن پڑھنے کی توفیق نہ ہوئی۔

اسی طرح ہزارہا ایسے مسلم گھرانے بھی ہیں جہاں قرآن پاک صرف طاق پر دھرنے کی شے بن چکا۔ گو

سورتیں اور آیات نصاب کا حصہ ہیں، مگر بچے رٹا لگا کر انہیں یاد کرتے ہیں، سمجھنے کی سعی نہیں کرتے۔ بعض والدین تو ایسے بھی ہیں کہ وہ اپنے معصوم بچوں کے نوخیز ذہنوں پر قرآن فہمی کا بار نہیں ڈالنا چاہتے۔

حقیقت یہ ہے کہ میری بیٹی نے جس ولولے اور ترنگ سے قرآن پاک پڑھا، اس نے میری آنکھیں کھول دیں۔ مجھ پر یہ بات اِلقا ہوئی کہ اللہ تعالیٰ صرف انہی انسانوں سے ہمکلام ہوتے ہیں جو نرم دل، نیک خُو، معصوم اور متجسّس ہوں۔۔۔ ان سے نہیں جو نفسانی خواہشات کی دلدل میں دھنسے ہوئے ہوں۔

اللہ تعالیٰ ان انسانوں کے قلوب میں ایمان کی حرارت اور نورِ حق پیدا نہیں کرتا جو مکروہات دنیا میں لتھڑ جائیں اور عارضی خوشیوں کے خواہاں ہوں۔ اللہ نے تو مکمل طرزِ حیات اپنی کتاب میں بیان فرما دیا ہے۔ اب یہ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ طاق پر رکھا قرآن اٹھائے، اس کا مطالعہ کرے اور ہدایت پائے۔

آج جب بھی میں یہ منصوبہ بندی کرنے بیٹھوں کہ مستقبل میں بچے کیسے پڑھیں گے، تو قرآن پاک کی تعلیم سرفہرست ہوتی ہے۔ یہ تبدیلی میری معصوم بیٹی کی بدولت ہی آئی ہے جس کے مشکل سوالات عموماً میں گوگل سرچ کی مدد سے حل کرتی ہوں۔

بیٹی کے ساتھ قرآن فہمی کے اس سفر سے مجھے بڑی خیر و برکت حاصل ہوئی۔ اور خوشی و فرحت کا یہی احساس مجھے قرآن مجید کے قریب لے گیا۔۔۔ وہ مقدس کتاب جو انسانیت کے لیے سب سے بڑی برکت کی حیثیت رکھتی ہے۔ یوں قرآن پاک سے میری محبت اور قربت پھر سے بڑھ گئی جسے وقت نے دھندلا دیا تھا۔ ■■■

اللہ کے بارے میں میرے احساسات

اے محمد ﷺ کہہ دو کہ اے لوگو! تمھارے پاس رب کی طرف سے حق آچکا ہے، اب جو سیدھی راہ اختیار کرے گا، اس کی راست روی اسی کے لیے مفید ہے اور جو گمراہی اس کے لیے تباہ کن۔
(سورہ یونس: آیت نمبر 108)

☆☆☆

''اگر کوئی شخص کہتا کہ میں خدا سے محبت کرتا ہوں اور وہ اپنے بھائی سے نفرت کرتا ہے، تو وہ جھوٹا اور مکار ہے کیونکہ جب وہ آنکھوں سے نظر آنے والے انسان سے بُرا سلوک کرتا ہے تو نادیدہ خدا سے محبت کس طرح کر سکتا ہے؟ اصل میں مخلوق کی محبت ہی خالق کی محبت ہے۔''

☆☆☆

''خدا تعالیٰ کی تنبیہہ کو حقیر مت جان اور اس کی تادیب سے بیزار مت ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ جس کو پیار کرتا ہے اسے تنبیہہ کرتا ہے۔
(حضرت سلیمانؑ)

☆☆☆

''عارف اللہ کے قُرب پر، عقل مند اللہ کے حکم پر اور گنہگار اس کی رحمت پر زندگی بسر کرتے ہیں۔

☆☆☆

''حقیقی تقویٰ یہ ہے کہ جو کچھ تیرے دل میں ہے، اگر تو اس کو کھلے ہوئے طباق میں رکھ دے اور اس کو لے کر بازار کا گشت لگائے تو اس میں ایک چیز بھی ایسی نہ ہو جس کو اس طرح آشکار کرنے میں تجھے شرم آئے یا کوئی اس پر حرف گیری، نکتہ چینی یا انگشت نمائی کر سکے۔
(امام جعفرؑ صادق)

ساقی الحرمین
حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب

ان کا تقویٰ ہی نہیں مقام و مرتبہ بھی ڈھکا چھپا نہ تھا
حالتِ اسیری میں اُن کی کراہوں نے آنحضورؐ کو سونے نہ دیا

خالد محمد خالد / ارشاد الرحمٰن

ہلاکت کے سال ''عام الرمادہ'' میں جب انسان وحیوان اور نباتات و جمادات سخت قحط کا شکار ہو گئے تو امیر المومنین حضرت عمرؓ کھلی فضا میں مسلمانوں کے ساتھ نماز استسقا پڑھنے اور اللہ رحیم و کریم سے باران رحمت کے لیے گڑگڑا کر دعا کرنے کے لیے باہر نکلے۔

پھر حضرت عمرؓ ایک مقام پر کھڑے ہو گئے اور اپنے دائیں ہاتھ سے حضرت عباسؓ کا دایاں ہاتھ تھام کر آسمان کی طرف بلند کر کے دعا گو ہوئے:

''اے اللہ! پہلے ہم تیرے نبی ﷺ کی وساطت سے بارش کی دعا کرتے تھے اور اس وقت نبی ﷺ ہمارے درمیان موجود تھے۔

اللہ! آج ہم تیرے نبی ﷺ کے چچا کی وساطت سے بارش طلب کرتے ہیں، اللہ! ہم پر بارش برسا!''

مسلمان ابھی یہاں سے ہل نہیں پائے تھے کی بارش آگئی اور اس قدر برسی کہ چہروں پر تازگی کی لہر دوڑا دی، ہر طرف پانی پانی کر دیا اور زمین کو سرسبز و شاداب کر ڈالا۔

صحابہؓ حضرت عباسؓ کے پاس گئے، ان سے بغل گیر ہونے لگے، ان کی پیشانی کے بوسے لینے لگے اور یہ کہتے ہوئے ان کو بابرکت قرار دینے لگے کہ:

''اے (اہل) حرمین کی پیاس بجھانے والے شکریہ!''

قارئین کرام یہ ''ساقی الحرمین'' کون ہے؟

یعنی یہ شخص کون ہے جس کو حضرت عمرؓ اللہ تعالیٰ کے حضور بطور وسیلہ پیش کر رہے ہیں اور عمر فاروقؓ بھی وہ جن کا تقویٰ وسبقت اور مقام ومرتبت اللہ و رسول ﷺ اور مومنوں کے ہاں کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔

سنیے! یہ رسول اللہ ﷺ کے چچا ''حضرت عباسؓ'' ہیں۔

یہ جس قدر رسول اللہ ﷺ سے محبت رکھتے تھے رسول اللہ ﷺ بھی اسی قدر ان کو عزت واکرام دیتے تھے۔ آپ ﷺ ان کی تعریف وستائش کرتے اور ان کی خوبیوں کا ذکر جمیل فرمایا کرتے تھے۔

آپ ﷺ فرماتے:

''یہ میرے باپ دادا کی نشانی ہیں۔''

''یہ عباس بن عبدالمطلب ہیں قریش کے سب سے بڑے سخی اور رشتوں کا سب سے زیادہ لحاظ رکھنے والے۔''

جس طرح حضرت حمزہؓ رسول اللہ ﷺ کے چچا بھی تھے اور ہم جولی بھی اسی طرح حضرت عباسؓ آپ ﷺ کے چچا بھی تھے اور ہم عمر بھی!

رسول اللہ ﷺ اور حضرت عباسؓ کی عمروں میں دو یا تین برسوں کا فرق ہے، حضرت عباسؓ رسول اللہ ﷺ سے تین برس بڑے تھے۔ اس طرح رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے چچا عباسؓ ایک ہی عمر کے بچے اور ایک ہی نسل کے جوان تھے۔

ایک اور چیز جس کو انسانیت کے پرکھنے میں نبی ﷺ کے نزدیک ہمیشہ اولین حیثیت حاصل رہی وہ حضرت عباسؓ کا اخلاق اور اچھی صفات تھیں۔

حضرت عباسؓ سخی تھے، بہت بڑے سخی..... گویا وہ ان اچھی خوبیوں کے بھی چچا ہی تھے۔ آپؓ رشتہ داروں اور اہل وعیال کے ساتھ جڑ کر رہنے والے انسان تھے۔ ان دونوں رشتوں کا لحاظ رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں آپؓ اپنے مال ومتاع یا سعی وجہد اور اثر ورسوخ میں سے کسی بھی اعتبار سے بخل نہیں کرتے تھے۔ آپؓ عام رشتہ داری اور خاندانی قرابت داری کے معاملے میں حددرجہ دانشمندی سے کام لیتے تھے۔ آپؓ کی اسی دانشمندی و ذہانت نے آپؓ کو قریش کے درمیان بلند مقام سے سرفراز کر رکھا تھا یہاں تک کہ جب رسول اللہ ﷺ نے دعوت کا برملا اظہار کیا تو حضرت عباسؓ اس قابل تھے کہ رسول اللہ ﷺ کو پہنچائی جانے والی بہت سی تکلیفوں کو آپ ﷺ سے رفع کر سکیں۔

حضرت حمزہؓ قریش کے ظلم وعدوان اور ابوجہل کی درشتیوں کا علاج اپنی ''مٹا ڈالنے والی تلوار'' کے ذریعے کرتے تھے جبکہ حضرت عباسؓ اپنی ذہانت وہوشیاری اور چالاکی کو استعمال میں لاتے تھے۔ ان دونوں بزرگوں نے اسلام کو اسی طرح نفع پہنچایا جس طرح دفاع کرنے والی تلواروں نے اسلام کی حمایت وحفاظت کا حق ادا کیا۔

حضرت عباسؓ نے قبولیتِ اسلام کا اعلان فتح مکہ کے موقع پر فرمایا جس کی بنا پر بعض مورخین نے آپؓ کو ''مؤخر الاسلام'' لوگوں میں شمار کیا ہے جبکہ دوسری تاریخی روایات اس بات کی خبر دیتی ہیں کہ آپؓ اسلام قبول کرنے والے اولین لوگوں میں سے ہیں لیکن آپؓ نے اپنے اسلام کو چھپائے رکھا۔

رسول اللہ ﷺ کے خادم حضرت ابورافعؓ کہتے ہیں:

''میں عباس بن عبدالمطلب کا نوکر تھا اور اس وقت اسلام اس گھر کے افراد میں داخل ہو چکا تھا۔ عباس مسلمان ہوگئے اور میں بھی مسلمان ہوگیا مگر عباس اپنا اسلام چھپا کر رکھتے تھے۔''

حضرت ابورافعؓ کی یہ روایت غزوۂ بدر سے قبل حضرت عباسؓ کے قبولیت اسلام کی وضاحت کرتی ہے۔ رہی بات ہجرت نبوی ﷺ کے بعد مکہ میں ان کے ٹھہرے رہنے کی تو یہ ایک ایسی حکمت عملی تھی جس نے بہترین طریقے سے اپنے اہداف کو حاصل کیا۔

قریش حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب کے ارادوں میں شکوک وشبہات کو کب چھپا رہنے دے سکتے تھے مگر مسئلہ یہ تھا کہ جناب عباسؓ کے مقابل میں آنے کا بھی ان کے پاس کوئی جواز نہ تھا۔ کیونکہ بظاہر ان کا معاملہ یہ تھا کہ وہ اسی دین اور طریقے پر تھے جس کو قریش پسند کرتے تھے۔ یہاں تک کہ غزوۂ بدر کا موقع آگیا، اور قریش کو حضرت عباسؓ کے دل میں چھپے ارادوں کا امتحان لینے کا موقع مل گیا۔ جناب عباسؓ قریش کی اس مکروہ تدبیر سے بھلا کب لاعلم رہنے والے تھے۔

آپؓ اگرچہ قریش کی حرکات وسکنات کی خبریں مدینہ میں رسول ﷺ کو پہنچانے میں کامیاب ہوگئے تھے لیکن قریش بھی عنقریب انھیں اس معرکہ میں شرکت کے لیے نکال باہر لانے میں کامیاب ٹھہرنے والے تھے۔ جس معرکہ میں شرکت پر جناب عباسؓ ایمان رکھتے تھے نہ کوئی ارادہ، تاہم یہ جنگ جناب عباسؓ کے لیے ایک مقررہ متعین کامیابی تھی جو الٹا قریش کے لیے ہی تباہی وبربادی لانے والی تھی۔

غزوۂ بدر میں دونوں طاقتیں آمنے سامنے آتی ہیں اور تلواریں ہر گروہ اور فریق کے انجام کا تعین کرتے ہوئے پوری خوفناکی کے ساتھ آپس میں ٹکرانے کے لیے تیار ہیں، رسول اللہ ﷺ اپنے اصحاب کو مخاطب فرماتے ہیں۔

ترجمہ: ''کچھ بنو ہاشم سے، اور کچھ بنو ہاشم کے علاوہ لوگ مجبور کر کے نکالے گئے ہیں، انھیں ہمارے ساتھ لڑنے کی کوئی ضرورت نہیں، ان میں سے کسی کا سامنا تم میں سے کسی کے ساتھ ہوجائے تو وہ اسے قتل نہ کرے۔

جو شخص ابوالبختری بن ہشام بن حارث بن اسد کو پائے وہ اسے قتل نہ کرے۔

اور جو عباس بن عبدالمطلب کو پالے وہ بھی ان کو قتل نہ کرے، ان کو تو مجبور کر کے جنگ میں لایا گیا ہے۔''

رسول اللہ ﷺ اس حکم کے ساتھ اپنے چچا عباس کی کسی خوبی کو مخصوص نہیں کر رہے تھے، خوبیاں بیان کرنے کا یہ موقع تھا نہ وقت! اگر رسول اللہ ﷺ کے نزدیک آپ ﷺ کے چچا مشرکین میں سے ہوتے تو آپ ﷺ ایسے نہ تھے کہ اپنے صحابہؓ کے سروں کو میدان جنگ میں متحرک دیکھتے اور پھر بھی اپنے چچا کے لیے سفارش کرتے..... اللہ اکبر

رسول اللہ ﷺ کے چچا ابوطالب جن کی آپ ﷺ اور اسلام کے لیے بہت سی قربانیاں تھیں، رسول ﷺ کو اس چچا کے لیے مغفرت کی دعا کرنے سے بھی روک دیا گیا۔ عقل وشعور کا فیصلہ یہی ہے کہ ایسا رسول غزوۂ بدر میں جائے تو اپنے مشرک آباء واخوان کو قتل کرنے والوں سے کہے کہ میرے چچا کو قتل نہ کرنا!

جب رسول اللہ ﷺ اپنے چچا کی حقیقت سے واقف تھے اور جانتے تھے کہ چچا کا سینہ اسلام کے لیے کھل چکا ہے اور اسی طرح کی نظر نہ آنے والی اور بہت سی خدمات کو بھی آپ ﷺ جانتے تھے جو چچا نے اسلام کے لیے انجام دیں اور آپ ﷺ اس آخری بات کو بھی

جانتے تھے کہ چچا کو مجبور کر کے جنگ میں لایا گیا ہے۔ لہٰذا اس وقت آپ ﷺ کا فرض تھا کہ آپ ﷺ اس شخص کی جان کو بچانے کے لیے مقدور بھر کوشش کرتے۔

اِدھر ''ابو البختری بن ہشام'' تو وہ ہے جس کے بارے میں نہ یہ مشہور تھا کہ اس نے اپنے اسلام کو چھپا رکھا ہے اور نہ اس نے اسلام کی اس طرح مدد و نصرت کی تھی جس طرح جناب عباسؓ نے کی تھی۔ ''ابو البختری بن ہشام'' کی تمام تر بڑائی اور فضیلت یہ تھی کہ وہ مسلمانوں کے اوپر قریشی سرداروں کی طرف سے ڈھائے جانے والے ظلم و ستم میں ان کا شریک نہ تھا اور نہ ان کی ان حرکتوں پر خوش تھا اور بدر میں صرف مجبور ہو کر ہی آیا تھا۔

جب ''ابو البختری'' اپنی اس روش کی بنا پر رسول ﷺ کی اس قدر پرزور سفارش کا مستحق ٹھہرتا ہے کہ اس کا خون نہیں بہایا جاسکتا اور اس کی زندگی کا خاتمہ نہیں کیا جاسکتا تو کیا ایک ایسا مسلمان جو اپنے اسلام کو چھپاتا ہو وہ اس بات کا مستحق نہیں کہ اسے رسول ﷺ کی سفارش نصیب ہو..... اور آدمی بھی ایسا کہ اسلام کے لیے اس کی نصرت و حمایت کے واقعات ایک دنیا دیکھ چکی تھی اور بہت سے لوگوں کی نظروں سے اوجھل بھی تھے۔!

آئیے ذرا تاریخ کا سفر کر کے اس دور میں داخل ہو کر جناب عباسؓ سے ملاقات کریں!

بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر موسم حج میں جب تہتر مرد اور دو خواتین انصاریوں کا وفد مکہ آیا تا کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے بیعت کریں اور رسول اللہ ﷺ کے مدینہ ہجرت کرنے کے سلسلے میں باہمی صلاح مشورہ کریں تو اس موقع پر رسول اللہ ﷺ نے اس وفد کے آنے اور بیعت کرنے کی خبر اپنے چچا عباسؓ تک پہنچائی کیونکہ رسول اللہ ﷺ کو اپنے چچا کی ہر طرح کی رائے پر اعتماد و وثوق تھا۔ ملاقات کا وقت ہوا جو خفیہ ہونی تھی تو رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے چچا عباسؓ اس جگہ پہنچ گئے جہاں انصار منتظر بیٹھے تھے۔

ہم اس گفتگو کا بیان وفد کے ارکان میں سے ہی ایک رکن پر چھوڑتے ہیں۔ یہ رکنِ وفد حضرت کعب بن مالکؓ ہیں، فرماتے ہیں:

''ہم گھاٹی کے اندر بیٹھے تھے، رسول اللہ ﷺ کا انتظار کر رہے تھے یہاں تک کہ آپ ﷺ ہمارے پاس آگئے اور آپ ﷺ کے ساتھ عباس بن عبدالمطلب تھے۔ عباس نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا: اے خزرج! تمھیں معلوم ہے کہ محمد ہم میں سے ہیں اور ہم نے ان کو اپنی قوم سے اس طرح بچا کر رکھا ہے کہ وہ اپنی قوم میں ایک معزز و باوقار حیثیت رکھتے ہیں اور علاقے میں محفوظ بھی ہیں۔ لیکن وہ یہ سب کچھ چھوڑ کر تمھارے پاس آرہے ہیں۔

اگر تم سمجھتے ہو کہ جس چیز کی طرف تم نے انھیں بلایا ہے اس سے وفاداری کرو گے اور انھیں ہر اس شخص سے بچالو گے جو ان کی مخالفت کرے گا تو پھر تم جو کر رہے ہو خوشی سے کرو۔

اور اگر تم سمجھتے ہو کہ تم ان کو اپنے پاس لے جا کر بے یارو مددگار چھوڑ دو گے اور انھیں رسوا کرو گے تو پھر ابھی سے پیچھے ہٹ جاؤ اور انھیں نہ لے جاؤ۔''

جناب عباسؓ اپنے یہ کاٹ دار اور فیصلہ کن الفاظ کہہ رہے تھے تو ان کی آنکھیں انصار کے چہروں پر گڑی تھیں۔ آپؓ اپنی باتوں کے جواب اور ان کے فوری ردعمل کا انتظار کر رہے تھے۔

حضرت عباسؓ کی عظیم ذہانت عملی ذہانت ہونے کی

بنا پر مادی میدان میں حقیقت کا احاطہ کر لیتی تھی، وہ ایک باخبر نگران اور تفتیش کار کی طرح دور دور تک حقیقت کا پیچھا کرتے تھے، لہٰذا آپؓ نے اسی گفتگو پر اکتفا نہ کیا بلکہ انصار سے ایک اہم سوال کر کے بات کو نئے سرے سے شروع کیا کہ: ''مجھے بتاؤ کہ تم اپنے دشمن سے کس طرح جنگ کرتے ہو؟''

حضرت عباسؓ اپنی ذہانت اور قریش کے ساتھ اپنے تجربے کی بنا پر یہ جانتے تھے کہ اسلام اور شرک کے درمیان جنگ ناگزیر ہے کیونکہ قریش کبھی اپنے عناد، سرداری اور دین کو چھوڑ نہیں سکتے اور اسلام جو ہمیشہ حق ہوتا ہے وہ کبھی باطل کے لیے اپنے قانونی حقوق سے دستبردار نہیں ہوسکتا۔ تو کیا انصار جو اہل مدینہ ہیں، مستقبل میں پیش آنے والی اس جنگ کے متحمل ہوسکیں گے؟ اور کیا وہ کروفر اور جنگ کے ماہر قریش کے تکنیکی اعتبار سے ہم پلہ ہوسکتے ہیں؟ یہی وجہ تھی کہ آپؓ نے انصار سے مذکورہ سوال کیا!

انصار بھی وہ لوگ تھے جو جناب عباسؓ کی گفتگو کو یوں ہمہ تن گوش ہو کر سن رہے تھے گویا وہ انسانی چٹانیں ہوں۔ حضرت عباسؓ اپنی گفتگو سے فارغ ہوئے تو انصار نے بات شروع کی۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن حرام نے جناب عباسؓ کے مذکورہ سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا:

''ہم..... اللہ کی قسم..... اہل حرب ہیں، ہمیں جنگ کی غذا دی گئی ہے، اس کا عادی بنا دیا گیا ہے اور اپنے آباء سے نسل در نسل ہمیں یہ وراثت میں ملی ہے۔

ہم پہلے تیر اندازی کرتے ہیں یہاں تک کہ تیر ختم ہو جاتے ہیں۔ پھر ہم نیزہ اندازی کرتے ہیں، یہاں تک کہ ہم میں سے جو پہلے موت کے منہ میں جانے والا ہوتا ہے وہ موت کی آغوش میں چلا جاتا ہے، یا پھر ہمارا دشمن موت کا شکار ہو جاتا ہے!''

حضرت عباسؓ نے خوش ہو کر جواب دیا: ''پھر تو تم اہل حرب ہو، کیا تمھارے پاس زرہیں بھی ہیں؟''

انصار نے جواب دیا: ہاں..... ہمارے پاس پورے جسم کو ڈھانکنے والی زرہیں ہیں!

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ اور انصار کے درمیان تاریخی اور عظیم گفتگو ہوئی۔

یہ تھا جناب عباسؓ کا بیعتِ عقبہ ثانیہ کے موقع پر موقف! اس روز وہ اسلام کی صداقت کی گواہی دل میں چھپائے ہوئے ہوں یا اس کے بارے میں مسلسل غور و فکر کر رہے ہوں، ان کا یہ عظیم موقف چھٹتی ہوئی تاریکی اور طلوع ہوتے ہوئے سورج کے درمیان ان کی حیثیت و مقام کا تعین اور ان کی مردانگی و دوراندیشی اور راسخ الفکری کی تصویر کشی کرتا ہے۔

فتح مکہ کے بعد غزوۂ حنین پیش آیا کہ اس مستقل مزاج اور نرم پہلو مرد کی فداکاری کو حق ثابت کر دکھائے اور اس طرز کی ایسی شجاعت و بسالت کو میدانِ جنگ میں نمایاں کر دے جس شجاعت کو ضرورت آواز دے تو وہ اپنے جوہر سے زمان و مکان کو بھر دیتی ہے اور اپنے اس مظاہرے سے دنیا کو خوفزدہ کر دیتی ہے۔ جبکہ یہ شجاعت بہت سے دیگر لوگوں کی پسلیوں کے اندر چھپی رہتی ہے اور روشنی کے سامنے نہیں آتی!

ہجرت نبویؐ کے آٹھویں برس یعنی اس وقت جب اللہ تعالیٰ نے مکہ کو اپنے دین اور رسول ﷺ کے لیے فتح کر دیا تھا۔ جزیرۂ عرب کے بعض سردار قسم کے قبائل پر یہ گراں گزرا کہ ایک بالکل نیا دین اس تیزی کے ساتھ اس قدر بڑی فتح حاصل کر لے۔ لہٰذا ہوازن، ثقیف، نصر، جشم اور دوسرے قبائل اکٹھے

ہوئے اور انھوں نے مسلمانوں کے خلاف ایک فیصلہ کن جنگ برپا کرنا طے کرلیا۔

یہاں لفظ ''قبائل'' سے ان جنگوں کی کیفیت کے بارے میں دھوکا نہیں کھانا چاہیے جن میں رسول اللہ ﷺ ساری زندگی مشغول رہے کہ یہ تو بس چھوٹے چھوٹے پہاڑی قبیلوں کی جھڑپیں تھیں، کوئی بڑی جنگیں نہ تھیں جو یہ قبائل اپنے قلعوں میں لڑتے تھے۔

یہ قبائل شدید ترین جنگجوؤں کی بے شمار صفوں کی صورت جمع ہوگئے۔ مسلمان 12 ہزار کی تعداد میں ان کا مقابلہ کرنے کے لیے نکلے۔

12 ہزار.....؟ کن لوگوں میں سے 12 ہزار.....؟

ان لوگوں میں سے جنھوں نے ابھی کل ہی مکہ فتح کیا تھا اور بت اور بت پرستی کو اس کی آخری اور بدترین جگہ پر پہنچا دیا تھا، ان کشور کشاؤں کے پرچم آسمان کے افق پر اس طرح بلند ہو رہے تھے کہ ان کے سامنے کوئی قوت مزاحمت نہ کر رہی تھی!

یہ سوچ کچھ غرور پیدا کر دیتی ہے اور مسلمان شر کے آخری پھیر میں آجاتے ہیں۔ اس سوچ کی وجہ سے وہ فخر و تکبّر کا شکار ہوگئے جو ان کی کثرتِ تعداد اور مکہ کی فتح نے پیدا کر دیا تھا۔ انھوں نے یہ کہہ دیا کہ: ''اب ہم قلتِ تعداد کی وجہ سے مغلوب نہیں ہو سکتے۔''

جب آسمان انھیں جنگ سے بڑے اور اعلیٰ مقاصد کے لیے تیار کر رہا تھا، اس وقت ان کا اپنی عسکری قوت اور جنگی فتح کے غرے میں آجانا ایک نامناسب عمل تھا جس سے انھیں جس قدر جلد ممکن ہو سکتا نجات دلانا ضروری تھا خواہ نجات صدمہ پہنچا کر دلائی جائے۔

یہ صدمہ شافیہ لڑائی کے آغاز میں بہت بڑی شکست کی صورت میں رونما ہوا۔ یہاں تک کہ مسلمان اللہ کے حضور سجدہ ریز ہوگئے اور آپس کے دامنوں کو چھوڑ کر اللہ کے دامن سے چمٹ گئے، اپنی قوت پر بھروسا چھوڑ کر اللہ کی قوت پر توکل کرنے لگے۔ تب جا کر یہ شکست فتح میں بدلی اور مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے قرآن کی یہ آیات نازل ہوئیں:

ترجمہ: ''اللہ اس سے پہلے بہت سے مواقع پر تمھاری مدد کر چکا ہے۔ ابھی غزوۂ حنین کے روز اس کی دستگیری کی شان تم دیکھ چکے ہو) اُس روز تمھیں اپنی کثرت تعداد کا غرہ تھا۔ مگر وہ تمھارے کچھ کام نہ آئی اور زمین اپنی وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہوگئی اور تم پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے۔ پھر اللہ نے اپنی سکینت اپنے رسول پر اور مومنین پر نازل فرمائی اور وہ لشکر اتارے جو تم کو نظر نہ آتے تھے اور منکرین حق کو سزا دی کہ یہی بدلہ ہے ان لوگوں کے لیے جو حق کا انکار کریں۔''

اس روز حضرت عباسؓ کی آواز اور ثابت قدمی سکینت و بہادری کے نمایاں ترین مظاہر میں سے ایک مظہر تھا۔ ہوا یوں کہ مسلمان اپنے دشمن کی آمد کے انتظار میں تہامہ کی ایک وادی میں جمع ہونے والے تھے کہ مشرکین ان سے پہلے ہی وادی میں پہنچ گئے اور وادی کے نشیب و فراز میں گھاتیں لگا کر بیٹھ گئے اور اچانک مسلمانوں پر بھرپور حملہ کیا اور انھیں اس قدر خوفزدگی کے عالم میں دور تک مار بھگایا کہ کوئی مسلمان پیچھے مڑ کر دوسرے مسلمان کو نہیں دیکھتا تھا۔

رسول اللہ ﷺ نے اچانک حملہ آور ہونے والے دشمن کی یہ کارروائی دیکھی تو فوراً اپنے سفید خچر پر سوار ہوئے اور بآواز بلند پکارنے لگے:

''لوگو بھاگ کر کہاں جا رہے ہو؟ میری طرف واپس آجاؤ! یہ ہرگز جھوٹ نہیں کہ میں نبی ہوں،

میں عبدالمطلب کا پوتا ہوں۔''

اس لمحے نبی ﷺ کے اردگرد ابوبکر، عمر، علی بن ابوطالب، عباس بن عبدالمطلب، عباس کے بیٹے فضل، جعفر بن ابی طالب، ربیعہ بن حارث، اسامہ بن زید، ایمن بن عبید اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کی تھوڑی سی نفری موجود تھی۔

اس موقع پر یہاں ایک خاتون تھیں جنھوں نے اپنی شجاعت و بسالت سے بہادروں کے درمیان بلند مقام پایا۔ یہ خاتون ''اُم سُلیم بنتِ ملحان'' رضی اللہ عنہا تھیں۔ انھوں نے مسلمانوں کے پاؤں اکھڑتے دیکھے تو فوراً اپنے خاوند ابوطلحہؓ کے اونٹ پر سوار ہوئیں اور اسے بھگاتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کے پاس آگئیں۔ ان دنوں یہ عظیم خاتون اپنے رحم میں کسی خوش نصیب کی پرورش کر رہی تھیں۔ اونٹ کے بھاگنے کی وجہ سے بچے نے رحم کے اندر حرکت کی تو انھوں نے اپنی چادر اتار کر مضبوطی سے پیٹ پر باندھ لی اور ہاتھ میں خنجر لہراتے ہوئے جب خدمتِ رسول ﷺ میں پہنچیں تو آپ ﷺ مسکرا دیے پھر فرمایا: ''اُم سُلیم ہے؟'' انھوں نے جواب دیا: ''ہاں..... یا رسول اللہ ﷺ آپ پر میرے ماں باپ قربان ہوں! ان لوگوں کو قتل کر ڈالیے جو آپ ﷺ کو چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں، جس طرح آپ ﷺ ان لوگوں کو قتل کرتے ہیں جو آپ ﷺ کے ساتھ جنگ کر رہے ہوں۔ یہ اسی لائق ہیں۔''

چہرۂ رسالت پر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور ام سلیم سے فرمایا: ''اے ام سلیم ان کے لیے اللہ ہی کافی ہے اور وہ جو کرتا ہے بہتر ہی کرتا ہے۔''

اس موقع پر جبکہ رسول اللہ ﷺ ایسے سخت حالات میں تھے حضرت عباسؓ آپ ﷺ کے پہلو بلکہ آپ ﷺ کے قدموں میں کھڑے آپ ﷺ کے خچر کی لگام پکڑے موت اور خطرے کو مقابلے کا چیلنج کر رہے تھے! رسول اللہ ﷺ نے آپؓ کو حکم دیا کہ لوگوں کو بلند آواز سے بلاؤ۔ چونکہ حضرت عباس بھاری جسم کے آدمی ہی نہ تھے بلکہ بلند آہنگ بھی تھے۔ آپؓ نے لوگوں کو بلانا شروع کیا: ''اے انصار یو! اے بیعت والو!''

یہ آواز جونہی اچانک حملہ سے بھاگ اٹھنے والے اور وادی میں اِدھر اُدھر منتشر ہو جانے والے لوگوں کے کانوں سے ٹکرائی تو ان سب نے بیک آواز جواب دیا: ''ہم حاضر ہیں..... ہم حاضر ہیں۔''

یہ سارے لوگ آندھی کی مانند تیزی سے واپس آئے یہاں تک کہ اگر کسی کا اونٹ یا گھوڑا اڑ گیا تو وہ اسے وہیں چھوڑ کر اپنے تیر کمان اور زرہ وغیرہ اٹھائے پیدل ہی اس طرف بھاگنا شروع ہوگیا جہاں سے جناب عباسؓ کی آواز آرہی تھی۔

اب معرکہ نئے سرے سے اپنی سختی اور خوفناکی کے ساتھ شروع ہوا۔ رسول اللہ ﷺ نے آواز بلند فرمائی: ''میدان اب گرم ہوا ہے۔''

میدان گرم ہوا تو ہوازن و ثقیف کے جنگجو ڈھیر ہوئے، اللہ کا لشکر لات کے جتھوں پر غالب آیا اور اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ اور مومنوں پر اپنی سکینت نازل فرمائی۔

رسول اللہ ﷺ اپنے چچا عباسؓ سے بے پناہ محبت کرتے تھے یہاں تک کہ جس روز غزوۂ بدر اپنے انجام کو پہنچا اور آپ کے چچا نے حالتِ اسیری میں رات گزاری تو آپ ﷺ رات بھر سو نہ سکے۔

جب آپ ﷺ سے پوچھا گیا کہ آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے فتح عظیم سے سرفراز فرمایا ہے پھر کیوں

سونہیں سکے؟ تو آپ نے جواب دیا:

''مجھے بیڑیوں میں جکڑے عباس کی کراہیں سنائی دے رہی تھیں۔''

کسی مسلمان نے آپ ﷺ کے یہ الفاظ سنے تو فوراً قیدیوں میں جا کر حضرت عباسؓ کی مشکیں ڈھیلی کر دیں اور آ کر خبر دی کہ: یا رسول اللہ ﷺ میں نے عباس کی بیڑیاں کچھ ڈھیلی کر دی ہیں!

لیکن صرف ایک عباسؓ کی ہی بیڑیاں کیوں ڈھیلی کی گئی ہیں!

آپ ﷺ نے اپنے صحابی کو حکم دیا کہ:

''جاؤ اور تمام قیدیوں کے ساتھ یہ نرمی کر دو۔''

جب قیدیوں سے فدیہ لینا طے ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے اپنے چچا سے فرمایا:

ترجمہ: ''اپنا، اپنے بھائی کے بیٹے عقیل بن ابی طالب کا، نوفل بن حارث کا، بنی حارث بن فہر کے بھائی اور اپنے حلیف عتبہ بن عمرو کا فدیہ ادا کرو، تم مالدار ہو!''

حضرت عباسؓ کا ارادہ تھا کہ بغیر فدیہ کے ہی اپنی قید ختم کرالوں، لہٰذا آپ ﷺ سے عرض کیا:

''یا رسول اللہ ﷺ میں تو مسلمان ہوں، میری قوم مجھے مجبور کر کے لے آئی!''

لیکن رسول اللہ ﷺ نے فدیہ لینے پر اصرار کیا، اس موقع پر قرآن مجید بھی نازل ہوا جو حضرت عباسؓ کے دل کی کیفیت پر ایک بلیغ تبصرہ بھی ہے اور خوشخبری بھی:

ترجمہ: ''اے نبی ﷺ، تم لوگوں کے قبضہ میں جو قیدی ہیں اُن سے کہو اگر اللہ کو معلوم ہوا کہ تمھارے دلوں میں کچھ خیر ہے تو وہ تمھیں اس سے بڑھ چڑھ کر دے گا جو تم سے لیا گیا ہے اور تمھاری خطائیں معاف کر دے گا، اللہ درگزر کرنے والا ہے اور رحم فرمانے والا ہے۔''

اس طرح حضرت عباسؓ نے اپنا اور اپنے ساتھیوں کا فدیہ دیا اور مکہ کی راہ لی۔ اس کے بعد قریش انھیں ان کی عقل و دانش اور دین و ہدایت کے معاملے میں دھوکا نہ دے سکے۔

آپ ﷺ نے اپنا مال و متاع اکٹھا کیا اور خیبر کے مقام پر رسول اللہ ﷺ سے جا ملے تاکہ قافلہ اسلام میں شریک ہو سکیں۔ اس طرح آپؓ مسلمانوں کی طرف سے عظیم اکرام و محبت کا مرکز قرار پائے۔ کیونکہ مسلمان رسول اللہ ﷺ کی ان کے ساتھ محبت و تکریم اور آپ ﷺ کے فرمان سے بخوبی آگاہ تھے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ہے:

''لوگو! سن لو کہ عباس میرے لیے باپ کی جگہ ہیں، جس نے عباس کو تکلیف دی گویا اس نے مجھے تکلیف دی۔''

حضرت عباسؓ کو اللہ تعالیٰ نے بڑی بابرکت اولاد کا باپ بنایا، امت حضرت عبداللہ آپؓ کے بیٹوں میں سے ایک ہیں۔

14 رجب بروز جمعہ 32 ہجری کو مدینہ کے باشندوں نے کسی اعلان کرنے والے کو یہ اعلان کرتے سنا کہ ''اللہ اس شخص پر رحم فرمائے جس نے عباسؓ بن عبدالمطلب کو دیکھا۔''

لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ حضرت عباسؓ وفات پا گئے ہیں۔

جناب عباسؓ کے جنازے میں اس قدر عظیم تعداد میں لوگ نکلے کہ مدینہ نے اس سے پہلے اس کا مشاہدہ نہ کیا تھا۔ خلیفۂ مسلمین حضرت عثمانؓ نے آپؓ کی نماز جنازہ پڑھائی۔ مدینہ کے قبرستان البقیع میں ابوالفضل جناب عباس بن عبدالمطلبؓ کا جسد خاکی محو استراحت ہے۔ آپؓ ان نیک لوگوں کے ساتھ محو خواب ہیں جنھوں نے اللہ سے کیے ہوئے اپنے عہد کو پورا کیا۔ ■■■

وہ ایک تپتی ہوئی دوپہر تھی جب ہم دفتر سے کوٹ لکھپت جانے کے لیے نکلے، بزنس رول ماڈلز کے سلسلے میں کیے جانے والے انٹرویو کے لئے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ باقی انٹرویوز کی نسبت یہ مختلف ہی نہیں مشکل بھی ہوتے ہیں۔ پہلے ان کی شخصیت کے حوالے سے کھوج کریں پھر کمپنی اور اس کی مصنوعات کی اصل مضبوطی کا راز جانا جائے۔ چونکہ ایسی کمپنیاں اپنی تیز رفتار ترقی اور معیار کے باعث ہی سامنے آتی ہیں اس لیے خواہش ہوتی ہے کہ باتوں باتوں میں کچھ ایسے راز، عادتیں اور حکمتِ عملی جانی جائے جو ان کی عزت، وقعت اور کامیابی کا باعث بنی اور اسی کی روشنی میں ہمارے پڑھنے والے، آنے والے دنوں میں بزنس کے میدان میں قدم رکھنے والے، بزنس مینجمنٹ کے اعلیٰ اداروں سے فارغ التحصیل ہونے والے، سرکاری ملازمتوں اور فوج سے ریٹائر ہوکر نئے کام اور کامیابی کے نئے قلعے بنانے اور انھیں مضبوطی سے اٹھانے اور اونچا لے جانے کے آرزومندوں کے لیے محفوظ راستے دیئے جاسکیں۔ ایسے انٹرویوز میں کپڑوں کے رنگ، پھلوں اور کھانوں کی پسند وغیرہ قسم کے سوالات کا ذکر آتا ہی نہیں جو ہمارے بعض معصوم قارئین ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ کارپوریٹ لیڈرز سے گفتگو کے موضوعات ہی اصل فرق ہوتے ہیں۔

اس ماہ جس شخصیت کا انتخاب ہوا، وہ ہیں انجینئر الماس حیدر۔ ملک میں تیز رفتار ترقی کرنے والی سو کمپنیوں میں سے ایک کمپنی SPEL کے وہ سربراہ ہیں، طیب اعجاز صاحب کو ان کی دانائی اور حکمت عملی پسند ہے۔ مجھے ان کی Creativity اور Drive بہت بھائی۔ میرے ساتھ جانے والے سجاد کو اپنے ملازمین کے ساتھ حسن سلوک اور عمیر کو ان کی مینجمنٹ کا انداز اچھا لگا۔ جس میں وہ اپنی ٹیم کو فیصلہ کرنے کی آزادی دیتے ہیں۔ موجودہ مقام تک پہنچنے کی داستان کتنی ہی ناکامیوں سے بھری ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ہر ناکامی سے انھوں نے خوب سیکھا اور اس کے نتیجے کو حرزِ جان بنایا۔

SPEL کے سادہ سے بورڈ روم میں جہاں ہماری گفتگو شام تک بغیر کسی وقفے کے جاری رہی ایک لمحے کو بھی ایسا نہیں لگا کہ ہماری ان سے پہلی ملاقات ہے۔ یہ ایک آسودہ فکر آدمی سے آسودگی بھری باتیں تھیں۔ میں بڑی خوشی سے سوچتا ہوں اور میری خوش گمانی ہے کہ آنے والے سالوں میں ہمارے اعلیٰ تعلیم کے اداروں میں موجود اساتذہ اور انتظامیہ تھوڑا دل اور ویژن بڑا کر کے ایسے بزنس آئی کنز اور رول ماڈلز کو ڈھونڈا کریں گے، باقاعدگی سے اپنے طلبہ سے ملوایا اور سنوایا کریں گے۔ Seeing is believing کے مصداق کتابوں سے زیادہ ان لیڈنگ لوگوں کی باتوں پر جلدی یقین آتا ہے جو وہ کر کے دکھا رہے ہوتے ہیں۔ نتائج کا تعلق سوچ کی وسعت سے زیادہ پرفارمنس اور خود طے کردہ اعلیٰ معیارات سے ہوتا ہے۔ یہ معیار جتنا اچھا اور عمدہ ہوگا۔ مصنوعات اور اداروں کا احترام اور Credibility اتنی ہی زیادہ ہوگی۔

ہمارے ہاں مایوس ہونے، تبصرے کرنے اور کچھ نہ ہو سکنے کے ''قولِ فیصل'' دینے والے تو ہر اینٹ کے نیچے پڑے مل جاتے ہیں۔ ان کو سن سن کر، دیکھ دیکھ اور پڑھ پڑھ کر تو ویسے بھی فی مربع میٹر مایوسی، بے دلی اور بے عملی کافی جگہ گھیر چکی ہے۔ ایسے میں آیئے امید کے کچھ خوش رنگ پھول آپ کی نذر کرتے ہیں جن کی خوشبو ہم خود محسوس کر کے آئے۔

ایڈیٹر: 1978ء میں آپ نے اپنے کاروباری سفر کا آغاز اتفاقی طور پر کیا یا یہ کسی پلاننگ کے تحت ہوا؟

مہمان: میں نے یونیورسٹی میں ہی طے کر لیا تھا کہ نوکری نہیں کرنی۔ 1974ء میں انجینئرنگ کا امتحان پاس کرنے کے بعد میں کراچی چلا گیا۔ وہاں میں نے امیر علی فینسی کے ساتھ پارٹنرشپ کی اور وہاں سے نکلتے ہی آرمی نے مجھے دبوچ لیا۔ اس زمانے میں کمپلسری سروسز آرڈیننس کے تحت انجینئرز اور ڈاکٹرز کے لئے لازمی تھا کہ وہ سروسز میں جائیں۔ چناں ہم نے کچھ مہینے فوج میں لگائے۔ وہاں سے نکل کے چھوٹے چھوٹے کام کرتا رہا۔ ہیلمٹ بیچے، کارپٹ ایڈورٹائزمنٹ ایجنسی بھی چلائی۔ آخر فیصلہ یہ کیا کہ اپنے گھر کے پچھواڑے میں فیکٹری لگائی جائے۔ والد صاحب نے اس وقت 36 ہزار روپے مجھے دیے اور کہا کہ یہ ہمارا ٹوٹل اثاثہ ہے۔ سال کی کمائی ہے اس کے ساتھ جو کچھ کرنا ہے کرلو۔ تو میں نے 77-1976ء گلبرک میں اپنے گھر کے باغ میں جوتے کے سول بنانے کا چھوٹا سا پلانٹ لگایا۔ پھر تھوڑا سا ربڑ کا کام شروع کیا۔ Rubrise cloth بنانا شروع کیا۔ اس سے ہمارے ہمسائے ہم سے بہت تنگ ہوئے۔ شور ہوتا تھا نا، وہاں سے پھر میں نکلا اور راوی روڈ پہ اپنے ایک دوست کے ساتھ پارٹنرشپ کی۔ وہاں پر بھی پلاسٹک کی چپلیں بنایا کرتے تھے۔ میں نے فیکٹری Take Over کر کے وہ چلانا شروع کر دی۔ اسی دوران میں والد صاحب ریٹائر ہو گئے۔ وہ بڑے کمال کے انسان تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ بھی ہمارے ساتھ آ جایئے۔ پھر ہم نے اکٹھے کام شروع کر دیا اور یوں یہ فیملی بزنس بن گیا۔ اس دوران ہمارے بزنس پر بُرا وقت آگیا۔ 1982ء میں ہمارے پاس پیسے تقریباً ختم ہو چکے تھے۔ زندگی کے چند فیصلے غلط ہونے سے حالات ایسے بھی ہو جاتے ہیں۔

ایڈیٹر: کون سا فیصلہ زیادہ غلط ثابت ہوا؟

مہمان: میرا خیال تھا کہ سیل بڑی ضروری ہوتی ہے، اس میں سے کچھ بچے یا نہ بچے۔ میرا جو مدمقابل تھا وہ Scrap سکریپ میں سے چیزیں بناتا تھا جبکہ ہم نئے میٹریل سے چیزیں بناتے تھے۔ ایک وقت ایسا آگیا جتنے کا میرا خام مال ہوتا تھا اتنے کی پراڈکٹ کی مارکیٹ پرائس ہوتی تھی۔ کیش بک کا اندازہ نہیں تھا کہ کیا ہوتی ہے۔ اکاؤنٹس کی سمجھ نہیں تھی۔ جس وقت برا حال ہو گیا تو سمجھ بھی لگ گئی۔ شکر ہے اللہ کا کہ دیوالیہ نہیں ہوئے لیکن تقریباً اس حالت تک پہنچ گئے تھے۔ میں نے لائن بدل دی، اور ٹریکٹرز کے پرزے بنانے شروع کیے۔ اللہ کا شکر ہے کہ یہ تجربہ بہت کام یاب رہا۔ ہم نے معیار کو فوکس کرلیا اور آگے بڑھتے گئے۔

ایڈیٹر: ٹویوٹا ہنڈا تک کیسے پہنچے؟

مہمان: جب آپ کی کوالٹی اچھی ہو اور آپ کی پراڈکٹ وقت پہ جارہی ہو تو کسٹمرل ہی جاتے ہیں۔ کرتے کراتے کمپنی کا نام ہونے لگا۔ ویلیو بھی بڑھتی گئی اور ان کمپنیوں کا کام بن گیا جو اول و آخر معیار پر سمجھوتا نہیں کرتیں۔

ایڈیٹر: کوٹ لکھپت انڈسٹریل اسٹیٹ کب پہنچے؟

مہمان: موجودہ جگہ پہ میں 1985ء میں آیا ہوں۔ راوی روڈ سے یہاں پہ جب میں شفٹ ہوا تو

ہمارے پاس 450 ملازموں میں سے صرف پانچ، چھ ایسے ہیں جنھوں نے کہیں اور بھی کام کیا ہوگا۔

پنجاب کارپوریشن نے جگہ دی تھی۔ پانچ سال کی قسطیں تھیں اس کی، تو پانچ سال میں ہم نے پیسے دے دیئے ان کو، یہ ڈھائی کنال اراضی تھی۔ پھر میاں مصباح الرحمٰن کی فیکٹری تھی ساتھ والی وہ بند ہوئی تو ہم نے خرید لی۔ یوں ہمارے پاس ساڑھے چار کنال اراضی ہوگئی۔ جب اور ضرورت پڑی تو ہم

نے رائیونڈ روڈ کے قریب جگہ لے لی تقریباً 20 ایکٹر۔ اصل میں ہمارے پلانٹ اب وہاں پہ ہیں۔ وہاں پہ مینوفیکچرنگ ہوتی ہے اور یہ ہیڈ آفس بن گیا ہوا ہے اور یہاں پہ ہم ڈائیاں بناتے ہیں۔ یہ ہماری جتنی بھی پراڈکٹس ہیں ان سب کی ڈائیاں ہماری اپنی بنی ہوئی ہیں۔

ایڈیٹر: آپ کا پروفائل دیکھ کے ہم نے آپ کی پراڈکٹس کے متعلق سوچا تھا مگر یہاں آ کے ہم نے دیکھا کہ آپ کی پراڈکٹس کی رینج کافی زیادہ ہے؟

مہمان: ہم تقریباً ہر مہینے کوئی تین سو پراڈکٹس بناتے ہیں۔

ایڈیٹر: تین سو پراڈکٹس! ہمارے ہاں خودترسی کی کیفیت کا عالم یہ ہے کہ کتنے ہی کالم نگار اور نام نہاد دانشور قوم کو روز لفظوں کے ہنٹر مارتے ہیں کہ پاکستان میں کچھ بھی نہیں ہے، یہاں کچھ نہیں بنتا ایک سوئی تک نہیں بنتی۔

مہمان: ایسی بات نہیں ہے آپ کے ملک میں الحمدللہ چھوٹی بڑی انڈسٹری اس قدر اہم اور بڑے کام کر رہی ہے، لوکل اور انٹرنیشنل مارکیٹ کے لئے چیزیں بنا رہی ہے کہ یہ دانشور بھی اس سے بے خبر

ہیں۔ مگر اس سے پہلے مجھے یہ بتائیں اردو میں جب آپ لکھتے ہیں یا اخبار کی جو ہیڈ لائن ہوتی ہے اس میں آپ کتنی دفعہ صنعت کار کا نام پڑھتے ہیں؟ آپ آج کا اخبار اٹھا لیں۔ اس میں ایک لفظ بھی نہیں ہوگا کسی صنعت کار سے متعلق۔ اگر کوئی ہوگا تو سرمایہ دار ہوگا، بزنس مین ہوگا، ٹریڈر ہوگا۔ کیا ہم یہ سوچ پھیلا رہے ہیں کہ محنت سے سرمایہ اکٹھا کرنا، رزقِ حلال کمانا گناہ ہے اور غریب رہنا ضروری ہے۔ اگر سوسائٹی اس بات پر متفق ہے کہ یہاں پر سرمایہ منفی معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور پیسہ اکٹھا کرنا یا منافع کمانا غلط ہے تو ساری قوم کو غریب رہنا چاہیے۔ بجائے اس کے کہ ہم اس کو ہیرو بنائیں ہم اس کو ولن بنا دیتے ہیں۔ اور ہیرو ہم اس لیے نہیں بناتے کیونکہ ہم نے انھیں سرمایہ دار بنتے ہوئے خود دیکھا ہے۔ ہمارے سامنے انھوں نے ترقی کی ہے اور بنے ہیں اور جن سیڑھیوں سے وہ چڑھے ہیں وہ اخلاقی طور پر بعض اوقات صحیح نہیں ہوتیں۔ لیکن وہ لوگ جو انڈسٹری کو چلاتے ہیں، سارا گوجرانوالہ دیکھ لیں، گجرات، سیالکوٹ اور فیصل آباد کو دیکھ لیں۔ انڈسٹری والا نہ صرف صبح سے رات تک کام کرتا ہے بلکہ سیکڑوں افراد کو روزگار بھی مہیا کرتا ہے، مگر اس کے باجود وہ غیر معروف ہوتا ہے۔ جنھوں نے راتوں رات پیسے بنائے، یہ چند ایک لوگ ہیں یا چند ہزار ہوں گے، لیکن جو اصل کام کرنے والے لوگ ہیں وہ ملین میں ہیں۔ اس وقت پاکستان میں جو لوگ انڈسٹری چلا رہے ہیں وہ تقریباً چار ملین ہیں۔ کبھی کسی کا نام سنا آپ نے یا کسی کا نام لیا آپ نے؟ اس کی وجہ شاید ہماری یہی کمزوری ہے کہ ہمارے پاس سامنے آنے کا ٹائم نہیں ہوتا۔ ہمیں لوگوں سے بات کرنے کا وقت ہی نہیں ملتا، نہ آپ کی خواہش ہوتی ہے ہمیں ملنے کی، نہ ہم سوچتے ہیں آپ سے ملنے کا۔ ہمیں اپنے کام سے کام ہوتا ہے۔ اس لیے شاندار کام سامنے نہیں آتا۔

ایڈیٹر: اچھا جیسے امریکا میں ہے کہ فارچون 50، 100 یا 500، تو جب انڈسٹری والوں کا نام آتا ہے تو انھیں محسوس ہوتا ہے کہ ان کی عزت افزائی ہوئی ہے۔ ایک ایک سال کا پورا ڈیٹا ان کے پاس ہوتا ہے اور ان کا اسٹیٹس ان کی اخلاقیات اور پرفارمنس کی بنیاد پر طے ہوتا ہے۔ ان کی پوری قوم انھیں سلیوٹ پیش کرتی ہے اور شکر گزار بھی رہتی ہے۔ جیسے آپ کا یہاں پر اتنا برا سیٹ اپ ہے تو کیا آپ نے بھی کبھی سوچا ہے کہ یہاں بھی پہچان اور تحسین کا ویسا ہی نظام ہو اور لوگوں میں آپ کی مثبت اور پائیدار پہچان ہو؟

مہمان: گورنمنٹ شروع کرتی ہے ایسے کام اور گورنمنٹ جس کو تسلیم کرتی ہے وہی پیشہ اہم ہو جاتا ہے۔ اگر آپ پرائڈ آف پرفارمنس کی کبھی لسٹ دیکھیں تو اس کے اندر شاید ہی کسی صنعت کار کا نام آیا ہو یا یونیورسٹیوں میں جو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگریاں دی جاتی ہیں، مجھے نہیں یاد کہ وہ کبھی کسی صنعت کار کو

سی ای او کا رعب ہی بڑا ہوتا ہے۔ یہ ہمارے کلچر میں ہے۔ یہ خود بخود ہی آجاتا ہے۔

دی گئی ہوں۔ میرے خیال میں انھوں نے بابر علی کو بھی جنھوں نے یونیورسٹی بنا دی، ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری نہیں دی۔ یہ سوسائٹی نے طے کر لیا ہوا ہے، سوسائٹی سے مراد وہ با اثر لوگ ہیں جو لوگوں کی رائے کو متاثر کرتے ہیں، کہ ہم نے ان کو تسلیم نہیں کرنا۔ عزت نہیں دینی۔

ہم کہتے ہیں کہ ہم ایسے نہیں ہیں۔ ہم دنیا میں کسی بھی بندے کے برابر ہو سکتے ہیں، اگر کوئی اور شخص ایک کام کر سکتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ وہ کام ہم بھی کر سکتے ہیں۔ ہم اپاہج نہیں ہیں، ہمیں بھی اللہ نے دو ہاتھ دیئے ہیں، آنکھیں دی ہیں، پیر دیئے ہیں اور اعلیٰ دماغ دیا ہے۔ تو ہم کیوں نہیں اپنے جسم کو ایسے استعمال کر سکتے جیسے دنیا میں کوئی اور استعمال کرتا ہے۔ کیا ہماری تعلیم میں کمی ہے یا معاشرے میں رہتے ہوئے کوئی اور کمی ہے، یا ذرائع کی کمی ہے۔ ہمارے پاس کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ مگر تسلیم کرنے والے اپنی ذہنی مرعوبیت کے باعث اپنے ہاں کے کسی صنعت کار کو عزت دینے پر تیار نہیں ہوتے، تحسین کرنا تو دور کی بات ہے۔

ایڈیٹر: ہمارے ہاں جو صنعت کار ہیں انھیں اس پہچان یا عزت افزائی کے علاوہ کون سے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے جیسے بجلی اور سرکاری ملازمین کی کرپشن کا؟

مہمان: آپ یورپ اور امریکا کی بات کر رہے تھے حقیقت یہ ہے کہ پاکستان میں جتنا انڈسٹری اور کاروبار چلانا آسان ہے وہاں پر اتنا ہی مشکل ہے۔ وہاں پر ایک آدمی رکھنا ایسے ہے جیسے آپ کا 35 ہزار سے 50 ہزار یورو کا خرچہ بڑھ گیا ہے۔ وہاں پہ جو ملازمین کو سہولتیں اور فوائد دینے پڑتے ہیں وہ یہاں پہ ہم دیتے ہی نہیں ہیں۔ جو وہاں پہ Taxation ہے وہ یہاں پاکستان میں ہے ہی نہیں۔ میں دنیا کے بہت سارے ممالک میں پھرا ہوں اور کاروبار بھی وہاں لوگوں کے ساتھ کیا۔ چائنا میں جتنی رشوت چلتی ہے Industory Developement کے حوالے سے اندازہ نہیں ہے آپ کو۔ یورپ میں اگر آپ کو اجازت لینی ہو کہ یہ گلاس بنانا ہے تو گلاس کو پاس کرانے کے لیے کتنا کچھ کرنا پڑتا ہے۔ یہاں پہ اگر میں نے گلاس بنانا ہو تو کیا کرنا پڑے گا مجھے۔ میں فیکٹری بناتا ہوں، گلاس بناتا ہوں اور مارکیٹ میں لے جا کر بیچ دیتا ہوں۔ اس میں کیا مشکل ہے۔ آپ نے اگر یورپ میں بنانا ہو تو اس کی ہیلتھ چیک، اس کی سیفٹی چیک، انوائرنمنٹ چیک، فیکٹری کا اندرونی ماحول، یہ سرٹیفکیٹس وہ سرٹیفکیٹس، وہاں پہ تو گلاس بنانا مشکل ہو جاتا ہے۔ اسی لئے جب بنتا ہے تو ناقابل تصور حد تک مہنگا بھی ہوتا ہے۔

ایڈیٹر: توانائی بحران کی وجہ سے تو متاثر ہوئے ہوں گے آپ؟

مہمان: سب لوگ ہوتے ہیں، ہم بھی ہوئے ہیں۔ پھر بھی پاکستان میں بزنس کرنا جس قدر آسان ہے اتنا کسی اور ملک میں نہیں ہے۔

ایڈیٹر: سنا تھا کہ کچھ لوگ سرمایہ منتقل کر رہے ہیں

خاص طور پر ٹیکسٹائل والے؟

مہمان: میں نے سنا ہے کہ واپس بھی لا رہے ہیں، بنگلہ دیش سے واپس آنا شروع ہو گئے ہیں۔ ایسے لگتا ہے کہ پاکستان سے باہر آسانی ہے۔ جب جاتے ہیں تو سمجھ آجاتی ہے کہ یہاں پہ بہتر ہے۔ ایک بہت بڑے صنعتکار پاکستان کے، جو ٹاپ پانچ، چھ جو ہیں ان میں سے ایک نے کینیڈا میں سرمایہ کاری کی بہت بڑی۔ میں ان کو وہاں پر ملا، انھوں نے کہا کہ یہاں آکے احساس ہوا ہے کہ بہت بڑے تالاب میں ایک چھوٹی سی مچھلی ہیں ہم اور پاکستان میں ایک چھوٹے سے تالاب میں بہت بڑی مچھلی ہیں۔ پھر وہاں سے کاروبار بند کر کے واپس آگئے ہیں۔

ایڈیٹر: کچھ چیزیں ہمارے ہاں Buzz word بن جاتے ہیں۔ اخبارات میں آتا رہتا ہے کہ بزنس کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ انڈسٹری بند ہو رہی ہے ایسا ہو رہا ہے، ویسا ہو رہا جب کہ ویسا ہوتا کم ہے۔

مہمان: جس نے کام کرنا ہے وہ کرتا ہے جس نے نہیں کرنا وہ بہانے کرتا ہے۔ آپ کو پتا ہے کہ پاکستان جرنلسٹ کے لیے سب سے زیادہ خطرناک ممالک میں سے ایک ہے۔ سنا ہے نا آپ نے! آپ بھی جرنلسٹ ہیں کیے جا رہے ہیں نا آپ بھی کام۔ آپ کبھی گھبراتے ہیں اس سے کہ اخبار میں آرہا ہے کہ یہ جرنلسٹ کے لیے سب سے زیادہ خطرناک ملک ہے تو میں یہ پیشہ چھوڑ کر کوئی اور کام کر لوں۔ تو یہ سب اخباری خبریں ہیں۔ لیکن ہم سب نے اپنی اپنی زندگی گزارنی ہے، اپنے بچوں کا پیٹ پالنا ہے، اپنے خاندانوں کی کفالت کرنی ہے اور اپنے دوستوں کے ساتھ رہنا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہم اپنے آپ کو محدود رکھیں۔ سب نے اپنی اپنی کوشش کرنی ہے اور جس نے کرنی ہے وہ کیے جا رہا ہے۔ اس ملک میں جو ٹاپ سو کمپنیاں ہیں ان کا جو گروتھ ریٹ ہے وہ دنیا کے کسی ملک کا نہیں ہے۔ یہ جو آل ورلڈ نیٹ ورک جو ٹاپ سو کمپنیاں ہیں۔ They are faster than any other company in the world. ہمارا ایورتج گروتھ ریٹ 82 فیصد تھا پچھلے سال۔ لیکن اخبار کچھ اور کہتا ہے۔ ٹی وی پہ بریکنگ نیوز یعنی دل توڑنے والی نیوز آرہی ہے جو آپ کو ناامید کر رہی ہوتی ہے اور آپ کو کہہ رہی ہوتی ہے کہ گھر سے باہر نہ نکلنا۔

ایڈیٹر: جب آپ نے اپنے کیریئر کا آغاز کیا تھا یہ وہ زمانہ تھا جب عام طور پر سارے بڑے مشورہ دیتے تھے کہ سرکاری نوکری میں چلے جاؤ اور اپنے بزنس کی ترغیب بہت کم لوگوں کو ملتی تھی!

مہمان: بالکل درست کہہ رہے ہیں آپ۔ میں نے اس وقت یہ سوچا کہ کیا میں زندگی میں نوکری لینے والا بننا چاہتا ہوں یا دینے والا؟ اگر آپ سے یہ سوال پوچھا جاتا آج سے بیس سال پہلے، آپ کیا جواب دیتے؟ نوکری دینے والا عمدہ کیوں ہوتا ہے یہ بھی کبھی نہیں سوچا۔ حالانکہ آپ نے بھی نوکری لی، آپ نے دی نہیں۔ لیکن شاید اگر آپ سے کوئی یہ سوال پوچھ لیتا تو آپ کی زندگی کا راستہ بدل جاتا۔ اس وقت آپ کی باقی ذمہ داریاں بھی کم تھیں، شادی بھی نہیں ہوئی تھی بچے بھی نہیں تھے۔ ماں باپ کے ساتھ آپ رہ رہے تھے، کھانا گھر سے کھاتے تھے، دو چار سال ماں باپ سپورٹ کر دیتے ہیں اور وہی وقت ہوتا ہے رسک لینے کا۔ یہ بات اگر ذہن میں آجائے کہ کیا میں نوکری دینے والا بننا چاہتا ہوں یا لینے والا بننا چاہتا ہوں تو

زندگی کے راستے بدل جاتے ہیں۔

ایڈیٹر: آپ کے ساتھ یہ اتفاق سے ہوا یا آپ نے سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا؟

مہمان: نہیں اتفاق سے نہیں ہوا۔ میں نے بچپن سے ہی سوچا ہوا تھا۔ میرے والد صاحب گورنمنٹ ملازم تھے، بہت سینیئر گورنمنٹ سرونٹ تھے۔ میرا خیال ہے جہاں سے کوئی گورنمنٹ سرونٹ اعلیٰ طبقے سے ریٹائر ہوسکتا ہے۔ اس سے وہ ریٹائر ہوئے۔ میرے لئے بہت موقع تھا اچھی نوکری کا، بہت سی پیشکشیں تھیں۔ اس وقت مجھے ابوظہبی سے 17 ہزار مہینے کی تنخواہ آفر ہوئی تھی جب میں نے انجینئرنگ کی تھی۔ جب کہ پاکستان کے اندر اس وقت انجینئر کی تنخواہ 12 سو یا 13 سو تھی۔ لیکن میں نے نہیں لی۔ ایسے فیصلے راستے کے پتھر بن جاتے ہیں۔ جب طے کرلیا کہ نہیں کرنا تو نہیں کرنا۔

ایڈیٹر: تو آپ نے اس وقت 17 ہزار روپے کو ٹھکرا دیا تو کتنا نقصان ہوا؟

مہمان: بہت نقصان ہوا۔ چار پانچ سال، میں نے بتایا تو ہے کہ Bankrupt ہوگیا۔ سارے پیسے ختم ہوگئے، بسوں پر سفر کرتا تھا، دھکے کھاتا تھا، رکشوں پہ جاتا تھا، تب بھی خیال نہیں آیا کہ میں وہ نوکری کرلیتا۔ میرے دوستوں نے مجھے بہت کہا لیکن جب ایک دفعہ زندگی کا راستہ طے کرلیا تو اللہ تعالیٰ ہر راستے پر برکت ڈال دیتا ہے۔ باتیں جو اس وقت میرے ذہن میں بیٹھی ہوئی تھیں کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے ''جس شخص نے بھی سعی کی اس کا اجرؑ اللہ تعالیٰ نے اس کو ضرور دیا ہے۔'' دوسری بات ذہن میں یہ تھی کہ:

''مالی داکم پانی دینا
تے بھر بھر مشکاں پاوے
مالک داکم پھل پھُل لانا لاوے یا نہ لاوے''

اس کا مطلب ٹائم فریم کا کوئی پتا نہیں ہے کہ اس کو پھل آج لگے گا، کل لگے گا، مہینے بعد لگے گا یا پانچ سال بعد لگے گا۔ ہمارا کام محنت کرنا ہے اور ہمیں پانی ڈالتے رہنا ہے۔ باقی اللہ کا فرمان جھوٹا نہیں ہوسکتا، ہم نے قرآن کے مطابق زندگی گزارنی ہے۔

جب میں نے ایک بات طے کرلیتا ہوں تو پھر اس پہ ڈٹ جاتا ہوں۔ مثلاً ایک بار ایک اسٹیج کے اوپر مجھے احساس ہوا کہ رازق اللہ ہے۔ اس سے پہلے گھبراتا تھا، میں حکومت کے افسران سے ڈرتا تھا، کسٹمر کی ناراضی سے، یہ جو شکوک و شبہات دل میں بہت ہوتے ہیں اور انسان اپنی پوری انرجی نہیں لگا سکتا۔ مگر جس دن میرے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی کہ رازق اللہ ہے اس دن کے بعد میں دلیر ہوگیا۔ اس کے بعد سمجھ آئی کہ قرآن یہ نہیں کہتا کہ رازق اللہ اکیلا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے آپ کو خیر الرازقین کہتا ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ تمام رازقوں میں سے سب سے بہتر رازق وہ ہے تو باقی کے رازق کون ہیں پھر؟ پھر ان کی طرف سوچنا شروع کردیا۔ آپ کے والدین ہیں، آپ کے کسٹمر ہیں اور لوگ ہیں۔ وہ ایک زمانے میں جو دلیری آئی تھی اس کو پھر Narrow down کیا۔ دلیر بھی رہے یقین بھی تھا کہ خیر الرازقین وہ ہے لیکن اکیلا رازق نہیں ہے وہ۔ ورنہ وہ یہ لفظ کہتا ہی نہ۔ سو یہ جو Clarity ہے یہ وقت کے ساتھ ساتھ پڑھ پڑھ کے سمجھ سمجھ کے، قدم بہ قدم، لوگوں سے پیار کر کے، اپنے کام سے پیار کر کے، اپنے ملک سے پیار کر کے، کہیں نہ کہیں آدمی پہنچ جاتا ہے۔

پاکستان کے حساب سے کمپنی کو ہر تین سال میں دُگنا ہو جانا چاہیے

ایڈیٹر: عام طور پر لوگ خائف ہوتے ہیں کہ جو کام ہم شروع کر رہے ہیں یہ چلے گا بھی یا نہیں۔ آپ کا کیا خیال تھا SPEL (سپتھیٹک پروڈکٹ انٹرپرائز لمیٹڈ) سے متعلق۔ خاص طور پر یہ آپ جو کوالٹی کے حوالے سے سنجیدہ ہوتے ہیں اور اپنے کیریئر کے بارے میں اور لوگ آپ کی کوالٹی کے بارے میں عام طور پر شک نہیں کرتے۔ یہ اتفاق سے ہے یا ارادہ سے؟

مہمان: نہیں ارادہ ہے، جب میں کسی سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں آپ کو یہ پراڈکٹ دوں گا تو میں وہی چیز دوں گا اسے۔ یہ مجھے یاد ہے بہت سال پہلے کی بات ہے ہم اسٹیرنگ ویل بناتے تھے تو اس میں ایک چھوٹی سی خرابی آگئی۔ اس زمانے میں سٹیرنگ ویل شاید 5 سو کا ہوتا تھا۔ وہ کوئی 5 سو ویل تھے اور خرابی ایسی تھی کہ صرف ہم کو پتا تھا کسی اور کو پتا لگ نہیں سکتا تھا اس کا۔ تو ان کی مالیت تقریباً 2,50,000 روپے بنتی تھی۔ میرے جو یہاں مینیجرز اور سپروائزرز تھے انھوں نے مجھے بڑا کہا کہ سر اس کو جانے دیں کچھ نہیں ہوتا۔ میں نے کہا کہ نہیں یار! بات ہے وعدے کی، اچھے معیار کی۔ جب میں نے وعدہ کیا ہے کہ ٹھیک چیز دوں گا تو ڈھائی لاکھ روپے کا میں نے جو وہ مال تھا سکریپ کروا دیا۔ اس کا فائدہ مجھے اتنا ہوا۔ کہ جس جس نے وہ بنایا تھا اس کے دل میں ایک نشتر لگ گیا۔ جب آپ کوئی پراڈکٹ بناتے ہیں تو وہ آپ کے بچوں کی طرح ہوتی ہے اور کوئی اٹھا کے اس کے گلے پہ چھری پھیر دے تو کیا ہوگا۔ اس دن کے بعد مجھے کبھی یہ تکلیف نہیں کرنی پڑی کہ میں ان سے کہوں کہ ٹھیک چیز بنائیں۔ ان کو یہ پتا ہے کہ اگر میرے تک بات آگئی اور چیز ٹھیک نہ ہوئی تو چاہے کتنے کا مال ہو وہ ضائع کروا دوں گا۔

ایڈیٹر: آپ کے کسٹمر پاکستان کے علاوہ کس کس ملک میں ہیں اور کون سے ملک میں زیادہ ہیں، جرمنی یا جاپان میں؟

مہمان: جرمنی میں بھی ہیں اور جاپان میں بھی ہیں۔ میرے کسٹمر اس وقت فرانس، اٹلی، ترکی، بیلجیم، انگلینڈ، دبئی، بحرین، قطر، سعودی عرب، مصر، اُردن اور بھی کئی ملک ہوں گے یاد نہیں۔ وہاں پر ہیں اور بے حد مطمئن اور خوش کسٹمر ہیں۔

ایڈیٹر: اس میں زیادہ تر آپ کے ذاتی کسٹمر ہیں یا پراسس اور دفتری کوششوں کے ہیں، کسٹمر کیسے آئے؟

مہمان: کسٹمر کو ہمیشہ حاصل کرنا پڑتا ہے، خود بخود کبھی کوئی کسٹمر نہیں آتا، کسی شخص کو جانا پڑتا ہے۔ ملنا پڑتا ہے، بات کرنی پڑتی ہے، ان میں سے کچھ ایسے ہیں جن سے میں خود جا کے ملا اور کچھ اور کمپنی کے لوگ ہیں جنھوں نے کام کیا۔

دراصل آپ کے اردگرد ہر چیز انسان ہوتی ہے۔

گورنمنٹ بھی انسان ہے، آپ کے ملازمین بھی انسان ہیں، جو بھی آپ کے اردگرد ہے جتنے بھی ادارے ہیں وہ سب انسان ہوتے ہیں۔ آپ ان انسانوں کے ساتھ اپنا ربط ٹھیک رکھیں تو ادارے خود ہی ٹھیک ہو جاتے ہیں۔

ایڈیٹر: یہ سارے تو بہت سارے لوگ ہو جاتے ہیں اور مختلف مزاج کے، مختلف رجحان کے؟

مہمان: ہاں تو جائیں ان کے پاس، بیٹھیں ان سے بات کریں ان کو اپنی بات سمجھائیں۔ لوجیکل بات ہو تو 99 فیصد تک آپ کی بات سنیں گے۔

ایڈیٹر: آپ محنتی زیادہ ہیں یا قسمت کے دھنی؟

مہمان: قسمت کا لفظ مجھے آج تک سمجھ نہیں آیا، کچھ Variables زندگی میں ایسے ہوتے ہیں جو کنٹرول میں نہیں ہوتے اور اگر وہ آپ کی طرف آجائیں تو آپ اس کو قسمت کہہ دیتے ہیں۔ باقی سارا کھیل اصولوں کا ہے۔ آپ اصولوں کے ساتھ مضبوط طریقے سے لوگوں کا خیال کرتے ہوئے جو کام بھی کریں گے وہ خود بخود ٹھیک ہونا شروع ہو جائے گا۔ مطلب نماز میں بھی پڑھتا ہوں، دعا بھی کرتا ہوں، برکت بھی مانگتا ہوں، سب کچھ کرتا ہوں لیکن یہ میں نے دیکھا کہ نمازوں کے ساتھ بچے پیدا نہیں ہوتے، کچھ خود بھی کرنا پڑتا ہے۔ سو آپ اپنا کام کریں اور باقی اللہ پہ چھوڑ دیں۔ اس کی اگر مرضی نہیں ہے وہ اگر سمجھتا ہے کہ آپ کو یہ چیز نہیں ملنی چاہیے تو وہ نہیں ملتی ہے تو کبھی اس کی رضا پہ بھی راضی ہو جانا چاہیے۔

ایڈیٹر: اتنے سالوں کے بھرپور کاروباری سفر کے دوران کامیابی کی Inspiration بدلتی رہتی ہے، کبھی نئی نئی کمپنیاں کبھی کوئی نیا بزنس ماڈل، آپ کن سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔ کن کن چیزوں کو اختیار کیا ہے اپنے لیے؟

مہمان: جرمن یا جاپان کے مقابلے میں کوئی انڈسٹری یا سسٹم نہیں ہے۔ بہت ہی زبردست لوگ ہیں اور ان سے آدمی جتنا زیادہ سیکھ لے اچھا ہے۔ ان لوگوں سے مل کے موسم کی بات یا ادھر ادھر کی بات کرنے کی بجائے بات ہی یہ کرنی چاہیے کہ ہم آپ سے کیا سیکھیں؟

ایڈیٹر: کائزان آپ نے کب سیکھا اس تک رسائی درحقیقت کب ہوئی؟

مہمان: 1988ء میں جاپان گیا تھا تو وہاں سے تصویریں کھینچ کے لایا تھا تو یہاں آ کے میں نے اپنے لوگوں کو وہ تصویریں دکھائیں۔ Equipment تقریباً وہی تھا جو ہمارے پاس تھا کوئی ایسا فرق نہیں تھا، باقی Layout کا ایشو ہوتا ہے، صفائی کا ایشو، زمین پہ کام ہو رہا ہے یا اوپر کام ہو رہا ہے۔ اس قسم کی چیزیں ہیں، ہم لوگوں نے پھر مل کے فیصلہ کیا کہ ہم لوگوں نے اپنے آپ کو کسی بھی جاپانی کمپنی کے برابر لے کے آنا ہے۔ جاپان بھی ترقی کرتا گیا ہم بھی آگے بڑھتے گئے۔ لیکن کم از کم کائزان تک تو پہنچ چکے ہیں۔

ایڈیٹر: آپ نے یہ کب سوچا کہ ادارے کو ”ون سٹاپ شاپ“ (One Stop Shop) بنانا ہے؟

مہمان: یہ تقریباً 1990ء کی دہائی کے شروع میں ہم نے چاہا تھا کہ ہمارے کسٹمر کو کئی قسم کی چیزوں کی ضرورت ہے پلاسٹک میں، تو بجائے اس کے کہ ہم صرف ایک قسم کی اور ایک پراسس کی فیکٹری لگائیں، ہم تین چار پراسس پوائنٹ لگا لیتے ہیں تا کہ پھر ان کو

مجھے کوئی انفریمیشن (شکایت) دے تو میں ناراض ہوتا ہوں
اس سے کمپنی میں سیاست شروع ہو جاتی ہے۔

ہر چیز دینی شروع کر دیں۔ یعنی ان کی ضرورت کے جائزے اور تجربے سے لے کر ڈیزائن، اس کی تیاری اور فراہمی سارے کام اکٹھے کرنے کو ہی ہم نے ون سٹاپ شاپ جیسا نام دیا۔

ایڈیٹر: اس سوچ کے بعد کس چیز کا رزلٹ سب سے زیادہ شاندار رہا؟

مہمان: یہ آپ کے سامنے ہے، ہم آٹو پارٹس بھی بنا رہے ہیں، ہم کریٹ بھی بنا رہے ہیں، بوتلیں بھی بنا رہے ہیں پلاسٹک کپ بھی بنا رہے ہیں اور بہت کچھ بن رہا ہے۔

ایڈیٹر: ان میں سے بنیادی پراڈکٹ کون سی ہے جو آپ کی پہچان بنا؟

مہمان: اب ٹھیک سے یاد نہیں ہے سٹیرنگ ویل تھا یا گیئر لیور تھا۔

ایڈیٹر: پانی کی بڑی بوتل میں آپ کی اجارہ داری ہے مارکیٹ میں کیا؟

مہمان: اجارہ داری ہماری کسی چیز میں بھی نہیں ہے، وجہ یہ ہے کہ یا وہ پاکستان کے اندر کوئی بنا رہا ہے یا پاکستان سے باہر بنا کے پاکستان میں بھیج رہا ہے، اجارہ داری تو وہ ہوتی ہے کہ آپ کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔ بس ایک Competative Edge ہے اس کے اندر ہماری اچھی گنجائش ہے ہم اچھی جگہ پر ہیں۔

ایڈیٹر: آپ کے پاس ٹوٹل کتنا اسٹاف ہے؟

مہمان: تقریباً 450 سو ملازمین ہیں۔

ایڈیٹر: ٹرن اوور کتنا ہے؟

مہمان: ہے کوئی دو ارب کے قریب۔

ایڈیٹر: آنے والے سالوں میں آپ نے کیا ٹارگٹ سوچا ہوا ہے کیا منصوبہ بندی ہے؟

مہمان: ایک اچھی کمپنی کو ہر تین سال میں دگنا ہو جانا چاہیے، اگر کمپنی تین سال میں دگنی ہو جاتی ہے تو پھر آپ کی گروتھ پاکستان کے حساب سے ٹھیک ہے۔ جب سیل بڑھتی ہے تو لوگ بھی بڑھتے ہیں اور روزگار کا جو ایشو ہے وہ بھی حل ہوتا ہے۔ اس وقت اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ پروڈکشن کے وہ پراسس لے کے آئیں جن کے اندر لوگوں کی بہت زیادہ قابلیت کا استعمال ہو لیکن مکس کر کے لے کے آئیں تا کہ کوالٹی بھی آپ کی بڑھ جائے اور لوگوں کے لیے روزگار بھی پیدا ہو جائے۔

ایڈیٹر: ISO کی جو اولین کمپنیاں تھیں آپ ان میں سے تھے۔ سرٹیفکیشنز کے بعد مائنڈ سیٹ پہ کتنا اثر پڑا؟

مہمان: سسٹم پہ بڑا فرق پڑتا ہے۔ سسٹم کا، پراسس کا ہر پہلو ڈاکومنٹ ہو جاتا ہے۔ ISO کا اگر میں آپ کو چار لفظوں میں بتاؤں تو مطلب یہ ہے کہ جو کر رہے ہو وہ لکھ لو اور جو لکھا ہوا ہے وہ کرو۔ بس یہ ہے ISO۔

ایڈیٹر: آپ باس کیسے ہیں نرم خو اور Comfortable یا سخت اور Demanding؟

مہمان: میں بہت زیادہ Comfortable نہیں ہوں۔ ہر بندے کو اپنا ایک ٹارگٹ یا جو بھی اس نے کام کرنا ہے، اس کے Parameters کا پتا ہے، وہ اپنا اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ میرے پاس تو اسی وقت بات آتی ہے جب کوئی خرابی پیدا ہو جاتی ہے۔

ایڈیٹر: آپ کتنی Close Supervision پر یقین رکھتے ہیں؟

مہمان: بھئی Close Supervision کبھی کرنی ہی نہیں چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے عقل دی ہے۔ ہر ایک کو اپنی اپنی عقل استعمال کرنی چاہیے۔ اگر آپ Close Supervision کریں گے تو پھر آپ بڑی کمپنی نہیں چلا سکتے۔

ایڈیٹر: کچھ اپنی فیملی کے متعلق بتائیے؟

مہمان: میرا ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہے۔ دونوں کی شادی ہو گئی ہوئی ہے۔ اپنے اپنے گھروں میں رہتے ہیں وہ۔ بیٹا میرا ٹورانٹو میں ہے اور بیٹی انگلینڈ میں ہے۔ بیٹے نے ایم بی اے کیا تھا اور فیصلہ کیا کہ کچھ عرصہ باہر جا کے رہنا چاہتا ہوں۔ یہ بھی اچھی بات ہے جب تک والدین کے درخت کے نیچے سے پودے دھوپ میں نہ جائیں، پودے بڑے نہیں ہوتے۔ انھیں سائے کی اہمیت کا پتا بھی نہیں چلتا اور بڑے بھی نہیں ہوتے وہ۔ وہیں کے وہیں رہ جاتے ہیں وہ۔ کبھی آپ گھنا درخت دیکھیں تو اس کے نیچے گھاس بھی نہیں اُگتی۔ اچھا ہوتا ہے کہ بیٹے اپنے پیروں پہ کھڑے ہوں اور انھیں آٹے دال کے بھاؤ کا پتا لگے۔ ان کو پتا لگے کہ جو پیسے کمائے جاتے ہیں اس کے لیے کتنی محنت کرنی پڑتی ہے۔ میرے خیال میں والدین کو اپنی نیک نامی اور بچوں کو قابلیت دینے کے علاوہ ان کے لیے ورثے میں کچھ نہیں چھوڑنا چاہیے۔ جن والدین نے بچوں کے لیے پیسے چھوڑے یا جائیداد اور گھر کہ کرایہ آتا ہے اس کو کھاؤ اور آرام سے گھر بیٹھو۔ کتنی فیملیز ہیں جن کو ہم آپ جانتے ہیں۔ کیا کرائے کے سر پر دو تین نسلیں گزر بسر کر سکیں گی۔ چل پائیں گی؟ کوئی بھی نہیں چل پاتا۔ صرف وہ نسلیں چلتی ہیں جن کا ایک ایک بچہ کام کر رہا ہوتا ہے اور اب میں نام لے سکتا ہوں ان لوگوں کے جنھوں نے خود اپنے بچوں کو اپنے گھروں سے نکالا، دوسروں کی فیکٹریوں میں بھیجا یا دوسرے ملکوں میں بھیجا اور کہا کہ جاؤ جا کے کام کر کے آؤ۔ یہ چنیوٹی ہیں میمن ہیں اور اس قسم کی سمجھدار فیملیز اپنے بچوں کو اپنے پیروں کے نیچے تھوڑی دبا کے بیٹھ جاتی ہیں۔

بچوں کو انتظار نہیں ہونا چاہیے کہ والدین مریں گے تو پھر ہمیں پیسے ملیں گے، ان کو اتنی قابلیت دے دو کہ وہ خود اپنا جہاں پیدا کریں۔

ایڈیٹر: ہمارے ہاں بزنس مین یا عام لوگ ہیں جو ترقی کرتے ہیں۔ ان کا نقطۂ نظر یہ ہوتا ہے کہ ہمیں سب کچھ آتا ہے، مغرب میں یہ معمول رہا اور انھوں سیکھا پڑھا بھی، یہی کہ جتنے لوگ سی ای او کے لیول پہ جاتے ہیں وہ زیادہ سے زیادہ نیا سیکھتے ہیں، وہ کورسز کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں پہلے یہ نہیں تھا۔ ابھی آپ بھی ہارورڈ سے ہو کے آئے ہیں، ذرا اس تجربے کے بارے میں بتائیے کہ کیسا رہا؟

مہمان: ہمارے یہاں اگر آپ فلمیں دیکھیں تو ماں بڑے فخر سے کہتی ہے کہ میرے بیٹے نے بی اے کر لیا ہے۔ اب اس کی تعلیم مکمل ہو گئی ہے، اب اس کی شادی کر دوں۔ جس کی تعلیم مکمل ہو گئی ہے تو اس کے

کوئی چیز مانگنے پر بھی نہیں ملتی تو
کبھی اس کی رضا پر بھی راضی ہو جانا چاہیے

آگے اس نے کیا پڑھنا ہے۔ یہ تو ہمارے کلچر میں ہے کہ اگر میٹرک ہو جاتا ہے تو تعلیم مکمل ہو جاتی ہے۔ چار کتابیں پڑھ کر دین بھی مکمل ہو جاتا ہے ان کا۔ یہ آپ لوگوں کا فرض ہے کہ اس کو تبدیل کرو، یہ پڑھنے لکھنے سے ہی اور لوگوں کو بتانے سے ہی ہے کہ علم کبھی مکمل نہیں ہوتا۔

ایڈیٹر: آپ ابھی ہارورڈ میں تین سال پڑھ کر آئے ہیں، وہاں کیا نیا لگا؟

مہمان: بہت کچھ ہے اتنی چھوٹی سی نشست میں یہ بات نہیں ہو سکتی۔ لیکن اتنا پڑھنے پڑھانے کے بعد ایک ہی بات سمجھ آئی کہ کامن سینس کو استعمال کرنا چاہیے۔ وہاں یہ ساری دنیا سے پروفیسر اور قابل لوگ آتے ہیں اور سارے ہی کامن سینس کا بتا رہے ہوتے ہیں، کہ اسے استعمال کرو۔

ایڈیٹر: اتنے لوگوں میں سے کس نے آپ کو ذاتی طور پر متاثر کیا جس سے آپ کا لیکچر لینے کے بعد بھی ملنے کو دل کیا ہو۔

مہمان: ڈاکٹر کرسٹڈائین تھا اس نے Distractive Innovation پہ ریسرچ کی ہوئی ہے۔ آج کل میں اس کی کتاب بھی پڑھ رہا ہوں اور دوسرا ڈاکٹر دیپک ملہوترا تھا۔ اس نے Negotiation Skills کے اوپر بہت کام کیا ہے۔ بڑے زبردست لوگ تھے یہ۔ ہر ایک کے اندر اپنی ایک کمزوری یا کشش ہوتی ہے جس چیز کی مجھے ضرورت تھی وہ مجھے توقع سے زیادہ ملی۔

ایڈیٹر: عام طور پر آپ کا بہترین وقت کیسے اور کہاں صرف ہوتا ہے؟

مہمان: دو چیزیں انسان کا بہت وقت ضائع کرتی ہیں۔ ایک ٹی وی اور ایک کلب، ان دونوں کو بڑا سوچ سمجھ کے استعمال کرنا چاہیے۔ میں کلب بھی جاتا ہوں اور ٹی وی بھی دیکھتا ہوں۔ لیکن اس بات کا مجھے یقین ہے کہ انسان کی زندگی کا بہترین حصہ ان دو چیزوں پر ضائع ہوتا ہے۔

ایڈیٹر: ٹی وی کو کتنا وقت دیتے ہیں؟

مہمان: خبریں سننے کے لیے اور بس رات کو کبھی لیٹے ہوئے کوئی ٹاک شو سن لیا۔ میں دس ساڑھے دس بجے سو جاتا ہوں۔ صبح چار پانچ بجے اٹھ جاتا ہوں۔ اگر کتاب پڑھنے کا ارادہ ہو تو میں ٹی وی بند کر دیتا ہوں۔ ٹی وی زندگی میں ضروری نہیں ہے۔

سجاد: آپ اپنے ملازمین کے کتنا قریب ہیں اور انھیں کس قدر جانتے ہیں؟

مہمان: میں ایک زمانے میں اپنی فیکٹری کے ملازمین کی یونین کا پریذیڈنٹ خود ہوا کرتا تھا۔ بجائے اس کے کہ وہ میرے پاس آئیں میں خود ان کے پاس جاتا تھا۔ مجھے ایک ایک شخص کا نام آتا تھا، اس کے بچوں کا پتا تھا۔ اس کی والدہ کی کیا حالت ہے اس کے والد کی کیا پوزیشن ہے، بھائی کیا کرتے ہیں، ہر شخص

کے بارے میں مجھے مکمل علم تھا۔ لیکن اس وقت فیکٹری چھوٹی تھی 40,50 لوگ تھے۔ تو ان سب کا جاننا اتنا مشکل نہیں تھا۔ اس کے بعد جب فیکٹری بڑی ہوگئی تو یہ ذمہ داری میں نے سپر وائزر کے اوپر ڈال دی کہ تمھیں اپنے ہر شخص کے بارے میں ہر چیز کا پتا ہونا چاہیے۔ اس کی خوشی، غمی، اس کی بیماری اس کے بچے، کبھی اس کے گھر میں ہو رہا ہے، اس کی انفارمیشن ہونی چاہیے اور وقت سے پہلے آپ اس کی مدد کرو اگر اسے ضرورت ہے تو۔ اس کو کہنا نہ پڑے کہ میری آپ کوئی مدد کریں۔

سجاد: آپ کے ملازمین براہ راست آپ تک شکایات پہنچاتے ہیں یا سپروائزرز کے ذریعے آتے ہیں؟

مہمان: میرا کوئی دفتر ہی نہیں ہے۔ میں سامنے بیٹھا ہوا ہوں، نہ کوئی دروازہ ہے درمیان میں اور نہ ہی کوئی دیوار، درحقیقت میرے پاس کوئی بندہ شکوہ لے کر صرف اس وقت ہی آتا ہے جب وہ اپنے اوپر والے سب لوگوں کو آزما چکا ہوتا ہے اور ان سے بات بھی کر چکا ہوتا ہے۔ کسی نے کوئی مدد نہیں کی ہوتی تو اس کے بعد جب وہ میرے پاس آتا ہے تو میں اس کو بڑی سنجیدگی سے لیتا ہوں۔ کہ یہ بیچارہ اگر میرے تک آیا ہے تو اس کی کوئی نہ کوئی شدید مجبوری تو ضرور ہے۔ ویسے یار سی ای او کا رعب ہی بڑا ہوتا ہے۔ یہ ہمارے کلچر میں ہے اور یہ خود بخود آجاتا ہے، آپ کو کسی پر رعب ڈالنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کوئی شخص اپنی ساری دیواریں توڑ کے رعب کے باوجود آپ تک آیا ہے تو اس کی مدد ضرور کرنی چاہیے۔ وہ ضرور کسی سنگین مسئلے سے دوچار ہوگا جو آپ تک آیا ہے۔

سجاد: آخری ملازم آپ کی کمپنی کو کتنا عرصہ پہلے چھوڑ کے گیا؟

مہمان: اتنا میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ جو 450 لوگ ہمارے پاس کام کر رہے ہیں ان میں سے صرف پانچ یا چھے لوگ ایسے ہیں جنھوں نے ہماری کمپنی کے علاوہ اور کہیں اور کام کیا ہوگا۔ ورنہ ہر بندے نے اپنی جاب اسی کمپنی میں شروع کی ہے۔

ایڈیٹر: اس کی وجہ کیا ہے؟

مہمان: آپ ان کا خیال رکھیں، وہ آخر گھر سے نکلا ہے کام کرنے کے لیے تو اس نے کہیں تو کام کرنا ہے نا! تو اگر آپ اس کمپنی کے اندر اس کی ضرورت کو پورا کر دیں تو وہ اور کہیں کیوں جائے گا۔ انسان کی جو حد سے زیادہ توقعات ہوتی ہیں وہ اس کو خراب کرتی ہیں۔ آپ اپنی توقعات کو محدود کر لیتے ہیں تو اس کی ڈیمانڈ بھی اس کے مطابق ہی ہوتی ہے۔ اور اگر آپ کمپنی کو (Transparent) کر دیں، اس کو پتا ہو کہ کمپنی کہاں ہے؟ تو ڈیمانڈ بھی پھر ایسی کوئی نہیں آتی جو غیر ضروری ہو۔

سجاد: عام طور پر کچھ چیئرمین یا کمپنی کے چیف ایگزیکٹو اپنے ملازمین سے انفارمیشن لینے کی کوشش کرتے ہیں کہ کون کیا کام کر رہا ہے، کیسے کر رہا ہے اور کیا ہو رہا ہے۔ آپ اس چیز پر یقین رکھتے ہیں؟

مہمان: مجھے اگر کوئی انفارمیشن دے یا شکایت کرے تو میں ناراض ہو جاتا ہوں۔ کیونکہ اس سے کمپنی میں سیاست شروع ہو جاتی ہے اور لوگ خوفزدہ ہو جاتے ہیں۔ جس کمپنی میں خوف ہوتا ہے وہاں پہ کام نہیں ہوتا۔ آپ کا سسٹم ایسا ہونا چاہیے کہ سسٹم کی باتیں آپ تک پہنچ جائیں کہ کہاں پہ خرابی ہے۔

ہر سال دس فیصد پراڈکٹ بند کر دینی چاہیے اور 20 فیصد نئی پراڈکٹ بنانی چاہیے۔

سجاد: عام طور پر اگر کسی ملازم سے کوئی غلطی ہو جائے تو آپ کیا کرتے ہیں یا یوں کہہ لیں کہ آپ کو اپنے اصول وضوابط زیادہ پیارے ہیں یا ملازم؟

مہمان: غلطیاں دو قسم کی ہیں۔ ایک غلطی وہ ہے جو اس کی قابلیت کی کمی کی وجہ سے یا حادثاتی طور پر ہوگئی۔ یعنی اچانک بجلی چلی گئی یا مشین خراب ہوگئی۔ ایسی کوئی خرابی آتی ہے، اس کے اوپر تو کبھی کوئی ایکشن نہیں لیا جاتا۔ دوسرے غلطی ہے جسے جان بوجھ کر کچھ غلط کیا جائے۔ اب ایک اصول نہیں ہے دونوں کے لیے۔ اس کمپنی میں دو باتیں ایسی ہیں جن کی بنا پر بندہ کمپنی میں نہیں رہے گا۔ پہلی بات اگر وہ مجھ سے جھوٹ بولے تو چاہے چھوٹا بولے یا بڑا جھوٹ کے پیچھے کمپنی نہیں چل سکتی۔ اور دوسرا اگر کوئی زنا کر کے، چوری کرے یا ڈاکہ ڈال کے آجائے اور مجھے پتا چل جائے کہ واقعی اس نے یہ غلط کام کیا ہے۔ پھر وہ ہمارے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ بس یہ دو وجوہات ہیں ان کے بعد تیسری کوئی وجہ نہیں ہے آدمی کو نکالنے کی۔

ایڈیٹر: آپ نے کہا کہ سارے معمولات Transparent ہونے چاہئیں تو یہ آپ نے کیسے کنٹرول میں رکھے ہیں؟

مہمان: میرا ایک بہت بڑا ٹی وی کیم ہے۔ وہاں سامنے بہت بڑی ایل سی ڈی لگی ہے اور ساری چیزیں آرہی ہوتی ہیں، سامنے سیل آرہی ہوتی ہے۔ میری پرائیویسی Privacy آپ کے ساتھ ہے۔ آپ کو وہ باتیں نہیں بتاؤں گا لیکن جن لوگوں نے کام کرنا ہے، فیصلے کرنے ہیں، ان لوگوں کو اگر نہیں پتا ہوگا تو فیصلے کیا کریں گے وہ۔ سپلائی لیٹ ہوگئی، کسی کی کمپلینٹ آگئی یہ سب کچھ ٹی وی پر چل رہا ہوتا ہے۔ سب دیکھ رہے ہوتے ہیں کہ کمپنی کے اندر کیا ہو رہا ہے۔

ایڈیٹر: کیا یہ بہت بڑا رسک نہیں ہے؟

مہمان: کیوں کہ مجھے خود پہ یقین ہے کہ کچھ نہیں ہونے والا۔ اسی سے ہی بہتری آئے گی۔ جب گھر سے نکلتے ہیں صبح تو یہ دعا کر کے نکلتے ہیں کہ یا اللہ ہمیں رزق حلال دینا تو آپ کی کمپنی میں کوئی غلط کیوں ہو جائے گا۔ ہمارے 450 لوگوں میں سے کوئی بھی دھوکہ نہیں دیتا، اگر کوئی کرتا ہے تو پکڑا جاتا ہے اور اس کا سسٹم بھی آہستہ آہستہ اور سخت ہوتا جا رہا ہے۔ اسے کہتے ہیں کہ ''پرفارمنس، مینیجمنٹ، سسٹم۔'' یہ سسٹم ہوتا ہے کہ ہر شخص کی خواہش ہوتی ہے کہ کوئی اس کو بتائے کہ کیا میں کام ٹھیک کر رہا ہوں۔ بچہ بھی ہوتا ہے تو اپنی ماں سے پوچھتا ہے کہ امی میں اچھا بچہ ہوں یا گندا بچہ ہوں۔ 450 لوگوں کے سب کے Parameters کلیئر ہیں کہ کس بندے نے کیا کام کرنا ہے، ہر مشین آپریٹر کو پتا ہے کہ اس نے کیا کرنا ہے۔ ہر مہینے جو اس کا ڈیٹا ہے، وہ اس کے پاس چلا جاتا ہے کہ یہ تمھارا ٹارگٹ تھا اور اتنا تم نے حاصل کیا۔ اب مجھے بتائیں کہ کہاں سے مجھے دھوکہ دے گا وہ۔

ایڈیٹر: Innovative Motivation کہاں

سے آتی ہے؟

مہمان: Innovation کی Motivation یوں آتی ہے کہ اگر ہر سال دس فیصد پروڈکٹ بند کر دیں اور 20 فیصد نئی کا اضافہ کر دیں تو Innovation خود ہی آجاتی ہے۔ اس کے لیے آپ کو سسٹم بنانا پڑتا ہے کہ پچھلے کاموں کو جو Competition میں آگئے ہیں جن کو لوگ بہت زیادہ بنانے لگ گئے ہیں اس میں سے خود بخود نکل جانا چاہیے اور وہ کام کرنے چاہئیں جو کوئی اور نہیں کرتا۔

ایڈیٹر: آپ لوگوں کو باہر بھیجتے ہیں کورسز وغیر کرنے کے لیے تو یہ چانس بھی تو ہوتا ہے کہ کوئی آپ کے خرچے پہ باہر جائے اور وہاں سیکھے اور پھر کسی اور کو اس کا پھل دے۔ کیونکہ ہمارے ہاں اس خوف سے کسی کو باہر ہی بھیجا نہیں جاتا؟

مہمان: تو کیا ہو جائے گا۔ اگر میں اپنے بندوں کو Literate ہی نہیں کر سکتا ہوں تو پھر میری قابلیت ہی کیا ہے۔ آخر وہ کہیں پہ جا رہا ہے تو اسے کچھ ملے گا نا! وہاں پہ۔ وہ چیز اسے یہاں کیوں نہیں مل سکتی ہے۔ جو لوگ ایسی سوچ رکھتے ہیں وہ اپنے ملازمین کو ٹرینڈ بھی نہیں کرتے اور پھر وہ ترقی بھی نہیں کرتے۔ Skilled manpower ہی آپ کو اچھی چیز بنا کے دیتی ہے۔ اگر ان کی ٹریننگ کریں گے تو وہ اچھا کام کریں گے اور اگر ٹریننگ نہیں کریں گے تو وہ اچھا کام بھی نہیں کریں گے۔ لہٰذا ایسے خوف میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔

ایڈیٹر: حکومت سے انڈسٹری کے حوالے سے کچھ بہتر اقدامات کی توقع کر رہے ہیں؟

مہمان: ابھی تو اس حکومت کا ہنی مون پیریڈ ہے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ سب کچھ اچھا رکھے۔ مجھ سے کسی نے کچھ روز پہلے پوچھا کہ ان سے آپ کیا امید رکھتے ہیں۔ میں نے کہا کہ پہلے بھی ہم ان باوجود کام کرتے تھے اب بھی ان کے باوجود کام کریں گے۔

جو اعلانات ہیں وہ تو ایسے ہی ہیں، لیکن اعلانات کے حوالے سے پاکستان میں اگر ہم پچھلے ساٹھ برسوں کے اعلان اکٹھے کر لیں تو پاکستان اس وقت امریکا سے بھی ایڈوانس ملک ہوتا۔ عملی صورت حال یہ ہے کہ گورنمنٹ کے پاس اتنے پیسے نہیں، اتنی بڑی پاپولیشن ہے اس سے بڑی لوگوں کی خواہشات ہیں، اتنے پیسوں سے یہ چیزیں نہیں ہو سکتی ہیں تو مایوسی تو آتی ہی ہے۔ دوسرا انصاف کا جو تصور ہے وہ بڑا Critical ہے۔ انصاف کا مطلب تمام شہریوں سے یکساں سلوک ہے۔ جس وقت انڈسٹری کو ٹیکس کیا جاتا ہے، دکاندار کو ٹیکس نہیں کیا جاتا، زمینیں خریدنے بیچنے والے کو بالکل ہی چھوڑ دیا جاتا ہے تو ناانصافی ہوتی ہے۔ اس کی وجہ سے مایوسی جنم لیتی ہے۔

میں نے سجاد اور عمیر کی طرف دیکھا اور پوچھا ہاں بھئی کچھ اور پوچھنا باقی ہے۔ انھوں نے مسکرا کر ''پُر باش'' کا اشارہ کیا۔ ہم نے جناب الماس حیدر کا شکریہ ادا کیا۔ اس قدر وضاحت خوبصورتی اور حکمت کے ساتھ انھوں نے اپنی زندگی بھر کی کمائی ہمارے ساتھ شیئر کی تھی کہ ان قیمتی موتیوں جیسی باتوں میں کتنا کچھ ہے جو چھوٹے بڑے ادارے چلانے والوں کے لئے اثاثہ ثابت ہو سکتا ہے اور ان کیلئے بھی جو بڑا خواب دیکھنے کا حوصلہ رکھتے ہوں یا خواب دیکھنے کا آغاز کر چکے ہوں۔

■■■

غذائیات

دماغی طاقت بڑھانے والی غذائیں

انسانی جسم میں طاقت کے عظیم مرکز کی ضرورتوں کا مفید تذکرہ

یہ 10 غذائیں اسے بے حد بھاتی ہیں۔ مزید صحت مند بناتی ہیں

ڈاکٹر شائستہ خان

دماغ ہمارے جسم میں مرکز اور تمام جسمانی و ذہنی سرگرمیوں کے دارالحکومت کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی عضو ہماری تمام سرگرمیاں کنٹرول کرتا ہے۔ لہٰذا ہم خوش و خرم زندگی گزارنا چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ ہمارا دماغ سو فیصد درستی سے کام کرے۔

تاہم دماغ ہی وہ جسمانی عضو ہے جس کا پیچیدہ میکنزم ابھی صحیح طرح سمجھا نہیں جا سکا۔ نیز ہمارے طرز زندگی سے متعلق کئی عناصر اس کی کارکردگی پہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ دماغ تندرست رکھنے میں غذا کا کردار بڑا اہم ہے۔ یہ غذائیں ہی اسے بیماریوں سے بچاتی ہیں۔ لیکن بہت سے مرد و زن کو علم نہیں کہ کون سی غذائیں دماغ کو صحت مند بناتی ہیں۔ انہی میں سے بہترین کا تذکرہ پیش ہے۔

(1) چکنائی والی (Oily) مچھلی

یہ مچھلیاں دماغ اور اعصابی نظام کو تقویت پہنچاتی ہیں۔ چکنائی رکھنے والی مچھلیوں میں سارڈین، سالمن اور آنچوویز (Anchovies) نمایاں ہیں۔ دراصل یہ مچھلیاں اومیگا۔ تیزاب (فیٹی ایسڈز) رکھتی ہیں۔ دماغ کے کئی عمل انہی تیزابوں کے

ذریعے انجام پاتے ہیں۔ ان کی مدد ہی سے دماغ کے خلیوں میں باہمی رابطہ بڑھتا ہے۔ یوں دماغ کی مجموعی صحت بہتر ہوتی ہے۔

(2) سرخ مرچ

یہ بھی دماغ کے لیے مفید غذا ہے۔ وجہ اس میں وٹامن سی کا کثیر مقدار میں موجود ہونا ہے۔ سرخ مرچ میں مالٹوں سے بھی زیادہ وٹامن سی ملتا ہے اور یہ وٹامن دماغ کی کارکردگی موثر رکھنے کے لیے لازمی ہے۔

(3) لوکی، پٹھے کے بیج

یہ بیج جست (زنک) سے بھرپور ہوتے ہیں۔ ماہرین نے دریافت کیا ہے کہ یہ زنک ہماری یادداشت میں اضافہ کرتا ہے۔ لوکی کے بیج کئی طریقوں سے استعمال کرنا ممکن ہے۔ بس روزانہ مٹھی بھر یہ بیج کھائیے اور اپنا دماغ تندرست رکھیے۔

(4) ٹماٹر

ٹماٹروں میں ایک اہم مانع تکسیدی مادہ، لائسوپین (Lycopene) ملتا ہے۔ یہ مادہ دماغ کو مختلف بیماریوں سے بچاتا ہے۔ چناں چہ ٹماٹر کو بھی معقول حد تک اپنی غذا میں شامل رکھیے۔ یہ سبزی آپ کو الزائمر اور دیگر امراض سے بچائے گی۔

(5) کرم کلہ

یہ بھی بڑی مفید سبزی ہے جو وٹامن کے، سی اور غیر تکسیدی مادے رکھتی ہے۔ دماغ اپنے افعال صحیح طرح انجام دینے کے لیے وٹامن کے سے بھی مدد لیتا ہے۔ نیز یہی وٹامن بڑھاپے کی بیماریوں مثلاً نسیان سے ہمیں بچاتا ہے۔

(6) مغزیات

مغز کی ہر قسم وٹامن ای رکھتی ہے۔ یہ وٹامن بھی دماغ کو تقویت دیتا اور ہمیں نسیان کے مرض سے بچاتا ہے۔ مزید برآں مغزیات صحت مند چکنائیوں سے بھرپور ہوتے ہیں۔

(7) کوکا پھلیاں

جی ہاں! جن کوکا پھلیوں سے چاکلیٹ بنتی ہے، وہ دماغ کی صحت میں بھی مفید پائی گئی ہیں۔ تاہم اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ فوراً چاکلیٹ پر ہاتھ صاف کرنے لگیں۔ وجہ یہ ہے کہ بیش تر چاکلیٹوں میں حقیقی پھلیوں کی بہت کم مقدار شامل ہوتی ہے۔ لہٰذا چاکلیٹ وہی مفید ہے جس میں کوکا پھلیوں کا جوہر زیادہ ہو یعنی 85 فیصد تک۔

(8) نیل بیری

مغرب میں بلیو بیری (Blueberry) ''سپر فوڈ'' کہلاتی ہے۔ وجہ یہی ہے کہ اس میں کثیر تعداد میں صحت بخش وٹامن، معدنیات اور مانع تکسیدی مادے ملتے ہیں۔ اسی لیے یہ دماغ کے لیے بھی مفید غذا ہے۔

(9) السی کے بیج

یہ بیج صحت کو تقویب پہنچانے والی چکنائی، اے ایل اے (ALA) سے مالا مال ہے۔ اسے بھی مختلف طریقوں سے کھانا ممکن ہے۔ مثلاً روٹی میں ملائیے یا کسی اور کھانے میں۔

(10) انڈے

خدا تعالیٰ کی یہ نعمت ہمیں ایک اہم غذائی مادہ کولین (Choline) فراہم کرتی ہے۔ ہمارا بدن یہ مادہ بہت کم بناتا ہے۔ لیکن ہمارے دماغ کا کثیر حصہ اسی کولین سے بنا ہے۔ لہٰذا مناسب مقدار میں انڈے کھانے سے دماغ کو فائدہ پہنچتا ہے۔ اپنی من پسند غذا کا انتخاب کیجیے۔

درج بالا غذاؤں کے علاوہ دماغ کے لیے اور بھی غذائیں مفید ہیں۔ تاہم ان کا ذکر یہاں اس لئے کیا گیا ہے کہ یہ زیادہ موثر ثابت ہوتی ہیں۔ لہٰذا ان میں سے من پسند غذا کو آپ آج ہی سے استعمال کر سکتے ہیں۔

کنو

ہمارے وطن کا عمدہ غذائی تحفہ کنو بھی شوق سے کھاتے ہیں۔ کنو، مالٹا، مسمی وغیرہ وٹامن سی کا بہترین خزانہ ہیں اور اب برطانوی ماہرین نے دریافت کیا ہے کہ یہی وٹامن سی ہمیں فضائی آلودگی (Air Pollution) سے محفوظ رکھتا ہے۔ واضح رہے خصوصاً شہروں میں رہنے والے کروڑوں انسان اسی فضائی آلودگی کے باعث دمہ اور سانس کی دیگر بیماریوں میں مبتلا ہو رہے ہیں۔

لندن کے مشہور امپیریل کالج کے محققوں نے شہر کے ہسپتالوں میں تحقیق کر کے معلوم کیا کہ جن مرد و زن کے بدن میں وٹامن سی کم ہو، وہ فضائی آلودگی بڑھنے پر سانس لینے میں دشواری محسوس کرتے ہیں۔ یوں ثابت ہوا کہ ایسی حالت میں مانع تکسید (Antioxidants) مادے مفید ثابت ہوتے ہیں۔

وٹامن سی بھی موثر مانع تکسید مادہ ہے۔ واضح رہے یہ مادے ہمیں نقصان دہ سالموں (مالیکیول) آزاد اصلیوں (Free radicals) سے محفوظ رکھتے ہیں۔ آزاد اصلیے ہمارے خلیوں پر حملہ کرتے اور ہمیں نشانہ بناتے ہیں۔ یہ فضائی آلودگی میں شامل ہوتے اور پھیپھڑوں کے راستے ہمارے جسم میں داخل ہو سکتے ہیں۔ لیکن جسم میں ان کا ٹکراؤ مانع تکسیدی مادوں سے ہو تو وہ آزاد اصلیوں کو خلیوں تک پہنچنے نہیں دیتے اور انھیں پہلے ہی بے اثر بنا ڈالتے ہیں۔

ایک اور تحقیق میں ماہرین نے ''کورس پارٹیکولیٹ میٹر (Course particulate matter) کا جائزہ لیا۔ یہ ننھے منے آلودہ ذرات گاڑیوں اور کارخانوں کے دھوئیں سے جنم لیتے ہیں۔ یہ بھی سانس کے ساتھ انسانوں کے بدن میں داخل ہو کر انھیں امراض تنفس میں مبتلا کرتے ہیں۔ وٹامن سی ہمارے جسم کو ان ننھے

ذرات کے مضر اثرات سے بھی محفوظ رکھتا ہے۔

یاد رہے کہ وٹامن سی کنو اور لیموں کے علاوہ گہرے سبز پتوں والی سبزیوں مثلاً ساگ اور بند گوبھی میں بھی ملتا ہے۔ گو بیش تر لوگ غذا کے ذریعے یہ حیاتین حاصل کر لیتے ہیں مگر پھل اور سبزیاں نہ کھانے والے اس سے محروم ہوتے ہیں۔ چناں چہ فضائی آلودگی اور کورس پارٹیکولیٹ میٹر انھیں مریض بنا ڈالتے ہیں۔ لہٰذا اپنی غذا میں یہ قیمتی وٹامن کی حامل اشیا ضرور شامل رکھیں۔

آئس کریم نہیں دودھ دہی

کئی مرد و زن آئس کریم یا کریم کھا کر سمجھتے ہیں کہ انھیں پروٹین، کیلشیم اور وٹامن ڈی کا خزانہ حاصل ہو گیا۔ لیکن اب ہارورڈ یونیورسٹی کے محققوں نے دریافت کیا ہے کہ آئس کریم و کریم میں غذائیت بخش اجزا کم ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس ان میں چکنائی اور شکر کی سطح زیادہ ہوتی ہے۔ لہٰذا ڈیری مصنوعات سے متعلق یہ دونوں غذائیں صحت کے لیے چنداں مفید نہیں۔

اس کے برعکس ہر قسم کا دودھ دہی انسان کو کیلشیم، وٹامن ڈی اور پروٹینز وافر مقدار میں مہیا کرتا ہے۔ یاد رہے یہ دونوں غذائیں خصوصاً ہماری ہڈیوں کے لیے بہت فائدے مند ہیں۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ وسط عمر میں انھیں استعمال کرنے والے مرد و زن کی ہڈیاں بڑھاپے میں بھی مضبوط رہتی ہیں۔ نیز وہ کم ہی ہڈیوں کی بوسیدگی کے مرض میں مبتلا ہوتے ہیں۔

کیلشیم کی گولیاں

دنیا بھر میں جو لوگ ڈیری مصنوعات کسی باعث نہیں کھاتے، وہ بدن میں کیلشیم کی گولیاں کھا کر اس معدن کی کمی پوری کرتے ہیں۔ یاد رہے تمام معدنیات میں ہمارے بدن کو سب سے زیادہ کیلشیم ہی کی ضرورت ہوتی ہے۔

لیکن اب امریکی ڈاکٹروں نے تحقیق و تجربے سے دریافت کیا ہے کہ 50 سے 71 سال کے جو مرد روزانہ 1000 ملی گرام والی کیلشیم کی گولیاں کھائیں، وہ امراض قلب کا نشانہ بن جاتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ گولیوں میں شامل کیلشیم ان کے قلب کی شریانوں میں جم جاتا ہے۔ یوں خون کے بہاؤ میں رکاوٹ پیدا ہونے سے دل کی بیماریاں جنم لیتی ہیں۔ لہٰذا 50 برس سے بڑے مردوں کو تجویز ہے کہ وہ کیلشیم کی گولیاں کھانے سے قبل ڈاکٹروں سے مشورہ کر لیں۔ تاہم یہ گولیاں خواتین میں امراض قلب پیدا نہیں کرتیں۔

عمر بڑھانے والی غذائیں

ماہرین جان چکے کہ طویل عمر پانے کا راز یہ ہے کہ انسان متحرک رہے، مانع تکسیدی مادوں سے بھرپور پھل و سبزیاں کھائے اور مضر صحت اشیا سے دور رہے۔ لیکن مانع تکسیدی مادے

غذاؤں کی صرف ایک خصوصیت ہے۔ وہ ہمارا نظام استحالہ بہتر کرتی، چکنائی جمنے سے روکتی اور امراض کا مقابلہ کرتی ہیں۔

ذیل میں ایسی چار غذاؤں کا تذکرہ پیش ہے۔ جنھیں استعمال کرنے سے نہ صرف آپ کا وزن کم ہوگا بلکہ وہ خون میں شکر کی سطح کم اور کولیسٹرول ختم کرنے میں مدد کریں گی۔

گریپ فروٹ

اس پھل میں نارنجینین (Naringenin) مانع تکسید مادہ اسے کھٹا و چرپرا ذائقہ عطا کرتا ہے۔

حال ہی میں انکشاف ہوا ہے کہ چربیلے تیزاب توڑنے میں یہ مادہ جگر کی مدد کرتا ہے۔ یہ خصوصاً ذیابیطس میں مبتلا مریضوں کے لیے بڑی خوش خبری ہے جو ادویہ کھاتے ہیں تاکہ جگر زہریلے تیزابوں کا خاتمہ کر سکے۔

تاہم نہایت کھٹے ذائقے کے باعث بہت سے مرد و زن گریپ فروٹ نہیں کھاتے۔ ان کے لیے مشورہ ہے کہ فروٹ کا بالائی حصہ کاٹیے، اس میں تھوڑی سی چینی چھڑکیں اور اسے چولہے کے قریب رکھ دیجیے۔ حدت کے باعث چند منٹ میں چینی پھل میں جذب ہو جائے گی تب ذائقہ زیادہ کسیلا نہیں لگے گا۔

سبز چائے

چائے کا پودا اپنے پتوں میں کیٹی چنز (Catechins) نامی اہم مانع تکسیدی مادہ رکھتا ہے۔ یہ مادہ ہمارا نظام استحالہ بہتر بناتا اور دوران حرکت چربی جلانے میں مدد دیتا ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ سبز چائے کی ایک دو پیالیاں پینے سے صحت عمدہ ہوتی ہے اور انسان کئی بیماریوں سے بچا رہتا ہے۔

لہسن

اس سبزی میں ایلیسین (Allicin) نامی ضد جراثیم اور ضد حیاتیہ (Antibiotic) بہ کثرت ملتا ہے۔ تحقیق سے ثابت ہو چکا ہے کہ یہ خون کا دباؤ (بلڈ پریشر) کم کرتا ہے۔ تازہ تحقیق سے انکشاف ہوا ہے کہ یہ ہمیں بعض اقسام کے کینسر، دل کی بیماریوں اور مضر کولیسٹرول (ایل ڈی ایل) سے بھی محفوظ رکھتا ہے۔ لہٰذا اپنے کھانے میں لہسن کی چٹنی ضرور شامل رکھیے۔

کرونڈا

سرخ گوندنیاں (Cranberries) کرونڈا بھی کہلاتی ہیں۔ یہ پھل صحرائی علاقوں میں ملتا ہے۔ اس کے مانع تکسیدی مادے ضد جراثیم خصوصیات بھی رکھتے ہیں۔ لہٰذا کرونڈے کو غذا میں شامل رکھیے، یہ آپ کو امراض سے محفوظ رکھے گا۔ یہ پھل شریانوں میں چکنائی بھی جمنے نہیں دیتا۔

■■■

چسکے دار غذائیں ہمارے بدن کو فائدہ کیوں نہیں دیتیں!
تندرستی چاہیے تو

9 بازاری غذاؤں سے پرہیز کیجیے

شوق اور چسکا اپنی جگہ پر اہم سہی مگر اس کا نتیجہ بھی تو آپ ہی کے بدن نے بھگتنا ہے

ڈاکٹر نصیر علی

پاکستانی شہروں میں آباد بہت سے خاندان عموماً رات کو ہوٹلوں، ریستورانوں، کیفے وغیرہ میں کھانا کھاتے ہیں۔ تاہم یہ ضروری ہے کہ وہ ایسے کھانوں سے پرہیز کریں جو بہت زیادہ نمک، چینی، تیل، اضافی (Additives) اور تحفظی (Preservatives) رکھتے ہیں۔ ورنہ یہ کھانے بہت جلد انھیں بیمار کر ڈالیں گے۔ ایسی ہی کچھ غذاؤں کا تعارف درج ذیل ہے۔

(1) چکن نگٹس

یہ غذا بچوں بڑوں، سبھی میں مقبول ہے۔ مزے دار اور منہ میں پانی بھر دینے والی ہوتی ہے۔ مگر اس میں رچا بسا تیل، نمک، چکنائی اور تحفظی مادے اسے صحت کے لیے خطرناک بنا ڈالتے ہیں۔ لہٰذا چکن نگٹس ہمارے بدن کو کچھ غذائیت فراہم نہیں کرتے۔ اس سے بہتر ہے کہ مرغ کا سادہ سالن کھا لیجیے۔

(2) فرنچ فرائیز

تیل میں خوب تلی گئیں آلو کی یہ قاشیں بھی ہمارا من بھاتا کھاجا ہے۔ لیکن یہ غذا بہت زیادہ

حرارے (کیلوریز) رکھتی ہے اور یہی امر اسے صحت کے لیے نقصان دہ بنا ڈالتا ہے۔ مزید براں فرنچ فرائیز ہمیں کوئی غذائیت بھی فراہم نہیں کرتے بلکہ ہمیں فربہ کرتے اور ہمارے خون میں شکر کی سطح بڑھاتے ہیں۔

(3) سفید چاول

چونکہ دکانوں سے سفید چاول بآسانی مل جاتا ہے، لہٰذا پاکستان میں یہی سب سے زیادہ پکتا ہے۔

مگر تیار (پروسیس) شدہ ہونے کے باعث سفید چاول بہت کم غذائیت رکھتا ہے۔ لہٰذا اس سے بس پیٹ بھرنا ممکن ہے، ورنہ یہ ہمیں صحت عطا نہیں کرتا۔ اس کے بجائے بھورے سے چاول میں زیادہ معدنیات و حیاتین ہوتے ہیں۔ گو وہ زیادہ مہنگے ہوتے اور دیر سے پکتے ہیں۔ جب کہ سفید چاول چند منٹ میں پک جاتے ہیں۔

(4) آلو کے چپس

یہ قتلے بچے بڑے بصد شوق کھاتے ہیں۔ بلکہ کچھ نہ پکا ہو تو آلو کے چپس ہی کھائے جاتے

ہیں۔ مگر یہ کھانا بھی چکنائی، نمک اور تحفظوں سے مالا مال ہوتا ہے۔ نیز اس میں حرارے خوب بھرے ہوتے ہیں اس لیے یہ چسکے دار غذا تو ہے مگر ہمارے بدن کو فائدہ نہیں پہنچاتی۔ لہٰذا اس سے پرہیز ہی بہتر ہے۔

(5) کولا بوتلیں

کبھی کبھار بوتل پینا تو قباحت کی بات نہیں لیکن روزانہ دو تین بوتلیں پینا معمول بنا لینا مضر صحت ہے۔

وجہ یہ ہے کہ ان میں موجود مصنوعی مٹھاس اور دیگر مادے بڑے نقصان دہ ہیں۔ اگر آپ تندرستی اور خوش و خرم زندگی چاہتے ہیں تو ہر قسم کی حتیٰ کہ ڈائیٹ بوتلوں سے بھی دور رہیے۔

(6) تلا گوشت

بہت سے ہوٹل والے سرخ یا سفید گوشت کی

ڈشیں غیر معیاری تیل میں تلتے ہیں۔ نیز کھانا چسکے دار بنانے کے لیے غذا میں مختلف کیمیائی مادے بھی ملائے جاتے ہیں۔ چناں چہ یہ عمل گوشت والے بازاری کھانوں کو صحت کے لیے مضر بنا ڈالتا ہے۔ ان سے بہتر گھر میں صاف ستھرے طریقے سے پکا ہوا گوشت ہے۔

(7) ڈبوں میں بند اناج

آج کل مختلف اناج مثلاً مکئی، جئی وغیرہ تیار شدہ

اور ڈبوں میں پیک ملتے ہیں۔ لوگ عموماً انھیں ناشتے میں دودھ کے ساتھ کھاتے ہیں۔ لیکن یہ تیار شدہ اناج اضافی شکر، تحفظی مادے اور بہت کم ریشہ (فائبر) رکھتے

ہیں۔ لہٰذا یہ ہمارے بدن کو کوئی غذائیت نہیں دیتے۔ البتہ ایسا تیار شدہ اناج مفید ہے جو زیادہ سے زیادہ ریشہ فراہم کرے۔

(8) مخلوط کافی

کئی مرد و زن مخلوط (Blended) کافی پسند کرتے ہیں۔ لیکن ایسی کافی کی صرف ایک پیالی 300 حرارے رکھتی ہے۔ لہٰذا یہ انسان کو فربہ کرنے کا سہل نسخہ ہے۔ اگر آپ کافی پینا ہی چاہتے ہیں تو سیاہ (Black) والی نوش کریں۔ سیاہ کافی کی ایک پیالی صرف پانچ حرارے رکھتی ہے۔

(9) مارجرین

چکنائی سے بھرپور مکھن کا نعم البدل سمجھ کر سیکڑوں لوگ مارجرین استعمال کرتے ہیں مگر آپ کو تندرستی

چاہیے ہے تو اسے نہ اپنائیے۔ وجہ یہ ہے کہ مارجرین کثیر مقدار میں ٹرانس فیٹس (Trans fats) کی حامل ہوتی ہے جو انسان کو کئی بیماریوں کا شکار بنانے میں ملوث پائے گئے ہیں۔

■■■

سیب کا قیمتی چھلکا

آج بھی عموماً کئی خواتین چھلکا اتار کر سیب بچوں یا مہمانوں کو دیتی ہیں۔ لیکن یہ چھلکا بہت کام کی شے ہے اور اب امریکی ماہرین نے تو دریافت کیا ہے کہ اس چھلکے میں موجود یرسولک (Ursolic) نامی تیزاب نہ صرف ہمارے عضلات کو صحت مند بناتا بلکہ موٹاپے سے بھی بچاتا ہے۔

آئیوا یونیورسٹی کے محققوں نے ایک تجربے میں دس چوہوں کو کئی ہفتے تک یرسولک تیزاب والی غذا کھلائی۔ جب کہ دس چوہوں کو تیزاب کے بغیر والے کھانے دیئے گئے۔ جن چوہوں نے تیزاب والی غذا کھائی ان کے عضلات بڑھ گئے اور جسم میں گندمی چربی (Brown fat) نے جنم لیا جو حرارے تیزی سے جلاتی ہے۔ تیزاب نہ کھانے والے چوہوں میں ان مثبت تبدیلیوں نے جنم نہیں لیا۔

دوران تجربہ یرسولک تیزاب کھانے والے چوہوں نے دوسرے گروہ کی نسبت زیادہ غذا کھائی۔ اس کے باوجود تیزاب ہی کی وجہ سے ان کا وزن کم ہوا۔ چناں چہ آئندہ چھلکے سمیت سیب کھائیے اور موٹاپے سے بچنے کا سامان کیجیے۔

یاد رہے، موٹاپا وہ تین اہم عوامل پیدا کرتا ہے جو ہمیں امراض قلب میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ اول پیٹ میں چربی ہونا، دوم چربی کی ایک قسم، ٹرائی گلیسرائڈز کی زیادتی اور سوم بلند فشار خون (ہائی بلڈ پریشر)۔

اُن مظلوموں کے لیے بطورِ خاص
جو اپنے کل کے سکھ کے لیے
آج کی سختی کاٹ رہے ہیں

بہو بیگم کی وسعتِ بیاں اور درازیٔ زبان کا
حقیقت افروز ماجرا
انہی کی والدہ کو خوش دامن کہا جاتا ہے

خوش دامن

اِس مخلوق کو خوش دامن کس نے کہا.....
تاریخ اِس بارے میں خاموش ہے
البتہ مصنف خاموش نہیں رہ سکا

مبشر الحق عباسی

"خوش" کا سابقہ اُردو زبان میں جس لفظ کے ساتھ بھی آجائے اس سے مسرت و شادمانی کا تصور ابھرتا ہے جیسے خوش خط، خوش شکل اور خوش مزاج وغیرہ سوائے "خوش دامن" کے۔ ساس (جسے ہمارے کرم فرما خواجہ صاحب Sauce کے وزن پر ادا کرتے اور بولتے وقت تلخی محسوس کرتے ہوئے برا سا منہ بھی بناتے ہیں) نامی مخلوق کو پہلے خوش دامن کس نے کہا، تاریخ اس بارے میں خاموش ہے۔ ہمارا خیال ہے خاموش نہیں مبہوت اور بھونچکی سی رہ گئی ہے۔ تاریخ سے ہی شکوہ

کیوں اردو ادب، میرا مطلب ہے سنجیدہ اردو ادب میں خوش دامن کے عنوان سے کوئی تحریر دکھادیں۔ ہاں ہجو، مرثیے، مزاح میں تذکرہ مفصّل انداز میں مل سکتا ہے۔ خواجہ کا کہنا ہے ہر عاقل و بالغ خوش قسمت مرد و زن کی زندگی میں خوش دامن کا ہونا ضروری ہے۔ میں نے روایتی انداز میں خوش قسمت کے لفظ پر اعتراض کیا تو کہنے لگے آخرت پر یقین نہیں رکھتے؟ میری جان یہاں سختی کاٹ لوگے تو آگے سکھی رہوگے۔

سچ تو یہ ہے کہ مغرب میں تو میاں بیوی اکٹھے نہیں رہتے ساس کے ساتھ خاک رہیں گے۔ اور ساس بھی ایک مستقل ہو تو ٹھیک وہاں ہر برس ساس بدل جاتی ہے یا یوں کہیں صرف نام بدل جاتا ہے خصائص و نقائص وہی چلتے رہتے ہیں

خواجہ نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا خوش دامن کے موضوع پر ادب میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ تسنیم خان جھٹ سے بولے مرنے کے بعد ہی لکھا گیا ہوگا۔ خواجہ بولے خوش دامن کے مرنے کے بعد؟ میں نے کہا نہیں مصنف کے مرنے کے بعد۔ کیونکہ کوئی شخص اپنی زندگی میں اتنی جرأت اور حماقت کا بیک وقت مظاہرہ نہیں کرسکتا۔ مشرق کے ادب میں تو احترام اور عزت کے پیرائے میں ملفوف تنقید کی جاتی ہے لیکن مغربی ادب جہاں ملفوف اور ملبوس ہونے کا رواج کم ہے وہ کچھ کہہ گزرتا ہے کہ نوک قلم جل کر رہ جائے اور صریر خامہ صورِ اسرافیل بن جائے۔ اور تو اور خاردار پتوں والے پودے کو جس کا ایک مشکل سا لاطینی نام ہے ساس کی زبان "Mother -in- Law's Tongue" سے موسوم کیا گیا۔ مکان میں آگ لگنے کی صورت میں ان 10 چیزوں کی فہرست میں جنھیں فوراً بحفاظت باہر نکالنا چاہیے۔ ساس کا 10 واں نمبر ہے۔

آپ کو یہ جان کر بھی خوشی ہوگی کہ پہلے نمبر پر بیوی کی سہیلی ہے اس کے بعد بیوی کی باری ہے۔ اس درمیان میں پالتو کتا اور طوطا وغیرہ شامل ہیں۔ خیر ہم اس مغربی بے ادبی کو صرف "نقل کفر کفر نباشد" کے عنوان کے تحت تحریر کررہے ہیں۔

مشرق میں ساس وہ ہستی محترم ہیں جن کے وجود سے اس بزم و رزم کی رونق ہے۔ ہنگامہء امروز و فردا کی روح رواں آزمودہ کار گرتیروں سے لبریز ترکش، چہرے کے تیور سے اپنی بات کہنے کے فن سے آراستہ، برسوں سے ساس در ساس منتقل ہونے والے محاوروں اور ضرب الامثال سے پُر حافظے کی مالک، برجستہ طنزیہ جملوں سے لیس، ناکامیوں اور تلخیوں سے کشید کردہ عرق ہلا ہل سے تر مرجبہ زبان..... اب قلم یوں رواں ہے جیسے اس کی اپنی بھی کوئی ساس ہے۔ خیر اگر آپ ان خوش قسمتوں میں سے ہیں جو بقول خواجہ "**فان مع العسر یسراً**" کی آیت پر یقین رکھتے ہوئے آج کل اپنی خوش دامن صاحبہ کے زیر سایہ زندگی گزار رہے ہیں تو یقین مانیں آپ اکیلے نہیں۔ دنیا، قوم، معاشرے یا محلے کی بات نہیں کررہا۔

آخر صدیوں کے بعد بھی اس محترم رشتے میں یگانگت اور محبت کیوں پیدا نہ ہوسکی؟ شادی سے پہلے ہاتھوں ہاتھ لی جانے والی دلھن کو بعد میں آڑے ہاتھوں کیوں لیا جاتا ہے؟ جس حسینہ کی درازیٔ زلف کا قصہ ہر پڑوس کو سنایا جاتا تھا اب اس ڈائن کی درازیٔ زبان کے قصے کیوں عام ہیں؟

ان سوالات کا جواب نہ تاریخ دے سکتی ہے اور نہ مستقبل سے خوش امیدی ہے۔

اِدھر سہرے کے پھولوں کی رنگت پھیکی پڑی اُدھر بہو بیگم نے رنگ دکھانے شروع کیے۔ کہنے کو تو ایک نیا بندھن بنا لیکن جو خلیج بنی وہ صرف شوہر کو ہی نظر آتی ہے ایک طرف بہو ہیں دوسری طرف ان کی ساس اور درمیان میں ایک پل صراط کے مانند تنگ راستہ جس پر صبح شام چل کر شوہر ایک طرف سے دوسری طرف جاتا ہے۔

اگر اس مضمون کو زنانہ نگاہیں دیکھ رہی ہیں اور آپ تازہ نو وارد بہو ہیں تو میری نصیحت ہے کہ.....؟ آپ کا خیال ہے یہ کوئی اخلاقی مضمون ہے کہ اچھی نصیحت کی جائے۔ آپ فوراً زبان تیز کرنا شروع کردیں۔ ابتدا میں مچھر مکھیوں اور کیڑوں کو بے نقط سنائیں یوں زبان رواں ہوگی۔ کچھ عرصے بعد ملک و قوم کے دشمنوں، ٹی وی کے ڈراموں میں ویمپ اور ولن کا کردار ادا کرنے والوں کے نام لے لے کر کوسنے دیں۔ منہ سرخ کر کے آستینیں چڑھا کر ہاتھ ہلا ہلا کر ان غیر مرئی کرداروں پر ہوائی حملہ کریں۔ چند ماہ میں ہی سسرال کو اندازہ ہوجائے گا کہ بہو بیگم کی وسعت بیان اور درازیٔ زبان کی حدود کیا ہیں۔ موجودہ دور میں اسے Nuclear Deterrence کہتے ہیں، کہ اپنے مہلک ہتھیاروں کی جھلک دکھا دو تاکہ دشمن خبردار رہے۔ اسے معلوم ہو جائے کہ کوئی بھی حملہ Mutually Assured Destruction (جسکا مخفف MAD ہے) کی سمت لے جائے گا، لہٰذا کوئی پاگل پن کا مظاہرہ نہ کرے۔ سسرال کو خبر ہوجائے گی کہ یہ بظاہر سرسبز شاداب پہاڑی دراصل آتش فشاں ہے جس کے دہانے سے بچنا ہے۔ کیونکہ یہ گوشۂ عافیت نہیں Foot Hill ہے۔

کدو، ٹینڈے سے مشابہ شخصیت

آپ اپنے دفتر یا کاروبار میں کوئی مہا توپ قسم کی چیز بھی ہیں تو گھر آتے ہی آپ کی حیثیت اور چال ڈھال مکی ماؤس جیسی ہو جاتی ہے آپ کا معاشرے میں آنفل ٹاور جیسا مقام گھر میں گائے کے کھونٹے سے زیادہ نہیں رہتا۔ عزت نفس، شان و شوکت اور احساس تفاخر ایسے کافور ہوتا ہے کہ بس صبح گھر سے نکل کر ہی یہ چیزیں واپس ملتی ہیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ دفتر پہنچ کر پہلا گھنٹہ تو اسی مظلومانہ کیفیت میں گزرتا ہے۔ دن مہینوں میں اور مہینے برسوں میں تبدیل ہوتے ہیں اور چند ہی برسوں بعد آپ کی شخصیت کی تصویر کدو یا ٹینڈے سے مشابہ ہو جاتی ہے۔ صدحیف، اشرف المخلوقات کا یہ انجام جائے عبرت ہے۔

لیجیے..... اس مشورے کے پیسوں سے ایزی لوڈ کروا دیں۔ آپ کا انسانوں سے لڑنے کا دل چاہے تو آپ کے چہیتے شوہر حاضر ہیں۔ آپ کے حسن نے جو ٹیکہ انہیں لگا دیا ہے وہ کافی عرصہ مدہوش اور بے ہوش ہی رہیں گے۔ ان کی تکلیف کا نہ سوچیں ان کی زندگی ایسی اجیرن بنادیں کہ وہ دفتر میں ہی خوش رہے۔ دیر سے گھر آیا کرے، محنت کرے، یوں قومی ترقی میں اپنا کردار ادا کرے۔ آپ کا رویہ اس سے ایسا ہو کہ سڑک پر جھڑکیاں دینے والا پولیس کا عام سپاہی، بدتمیزی سے بات کرنے والا ویگن کا کلینر، ٹریفک کا شور و غل اور ڈانٹ ڈپٹ کرنے والا بالا افسر سب کچھ اسے پھولوں کی سیج لگنے لگیں۔

اگر آپ تازہ داماد ہیں تو میرا صائب مشورہ یہ ہے کہ سسرال میں اپنے سسر کو ہی اپنا خیر خواہ جانیں کہ آپ دونوں میں قدرے مشترک وہی ہیں، دُکھ سانجھا

ہے سمع خراشی یکساں ہے۔ یاد رکھیں آپکی ساس لاکھ کہیں کہ آپ اچھے داماد ہیں آپ دل ہی دل میں لاحول پڑھ کر اس کا ورد کرتے رہیں۔ اچھا داماد اچھا بیٹا نہیں ہوسکتا اور Vice Versa نمبر SMS کریں آپ کو اب تک معلوم ہوگیا ہوگا کہ یہ گھر (سسرال) آپ کی اہلیہ کے لیے Refueling Station ہے۔ اس دورے کے بعد جوش آپ کے گھر والوں کو پڑیں گے وہ اللہ ہی جانتا ہے۔ مونالیزا کی غائبانہ مسکراہٹ سجائے آپ کی ساس آپ کی والدہ کی جگہ ہیں۔ اور آپ کی والدہ جتنی ہی ناخوش۔ عدم کا شعر یاد کریں۔

مسکرا کر خطاب کرتے ہو
کیوں عادتیں خراب کرتے ہو

سسر.....دشمن کا دشمن

آپ نے کبھی اپنے سسر کی حالت دیکھی ہے یہ وہ عظیم الحوصلہ شخصیت ہوتی ہے جس نے اس نابغۂ روزگار شخصیت کے ساتھ اپنی عمر گزار دی، جس نے بڑی سے بڑی بات ایک جنبش گردن اور بڑی سی ہونہہ کہہ کر ٹال دی، جس نے کرب کا اظہار الٹرا سانک فریکونسی پر کیا کہ انسان نہ سن لیں اور صرف سمیع البصیر تک صدا جائے۔ کسی کو اتنی زیادہ تکلیف میں دیکھ کر اپنا دکھ کم محسوس ہوتا ہے اس کا ثبوت آپ کے ساتھ آپ کے سسر محترم کا سلوکِ شفقت اور محبت ہے۔ یہ دراصل آپ کے ساتھ ہمدردی کے جذبات ہیں جو خوف خلق سے شفقت میں تبدیل ہوچکے ہیں۔ یہاں خلق سے مراد وہی ہیں۔ اگر آپ کو یہاں انگریزی کا وہ محاورہ یاد آرہا ہے کہ میرے دشمن کا دشمن میرا دوست ہے تو اس میں ہمارا قصور نہیں۔

وقتِ رخصت آپ کی ساس کے آنسو آپ کے لیے نہیں آپ کی اہلیہ کی جدائی و فرقت کے لیے ہیں۔ آنسوؤں کی دوسری لہر سسرال میں اسکی زور آوری اور احساس فتح کے تشکر کے لیے ہے۔ سسر کے آنسو خاموش التجا ہیں کہ خدارا مجھے بھی ساتھ لے چلو، رہ گئے اہلیہ کے آنسو تو گاڑی میں بیٹھتے ہی ہوا کے پہلے جھونکے سے خشک ہوجائیں گے۔

آنسوؤں کی ان جھیلوں کے درمیان آپ کی خشک آنکھوں کا جزیرہ اور ہونٹوں پر مسکراہٹ عارضی ہے۔ ساس صاحبہ کی آپ کی درازیٔ عمر کی دعائیں اپنی بیٹی کے سہاگ کے لیے ہیں کہ گھوڑے کے بغیر راکب اور سوار چہ معنی دارد۔

اگر آپ کافی عرصے سے بہو ہیں تو آپ کا یہ گھر یعنی رزم گاہ ایک تربیت گاہ بھی ہے۔ کل کلاں ان شاء اللہ آپ بھی ساس بنیں گی وہ واری جانے والی جو وار کرنے کے لیے بے تاب ہو۔

اگر آپ بہت عرصے سے داماد ہیں تو اب تک آپ دونوں سرحد کے آر پار رہتے ہیں جو نہ آسانی سے عبور ہوسکتی ہے نہ نظر آتی ہے نہ بیان کی جاسکتی ہے۔ اُلفت اور رنجش کے درمیان کا جذبہ جس کے لیے کوئی لفظ ایجاد نہیں ہوسکا۔ یہ بھی تو امکان ہے کہ آپ ہی وہ ساس ہوں جن کے بارے میں ایک دُنیا نے پروپیگنڈا کر رکھا ہے۔ ہوسکتا ہے یہ سلوک کی منازل آپ نے اپنی ساس کے سامنے طے کی ہوں ممکن ہے آپ اپنی ساس کی شفقت سے بچ گئی ہوں اور قدرت نے یہ خوبیاں ازخود آپ میں پیدا کردی ہوں۔ دُنیا کی تنقید سے تو اللہ کے نیک بندے بھی نہیں بچے۔ بس کیا کریں یہ رشتہ ہی بدنام ہوچکا ہے اوپر سے مغرب کی تقلید،

ماڈرن تعلیم، ٹی وی ڈراموں اور والدین کی تربیت نے رہی سہی کسر نکال دی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن میں سسرال کو اللہ کے احسانات میں سے ایک قرار دیا گیا ہے اور اس طرح ساس تو نعمتِ خداوندی میں سے ایک ہوئی۔ پھر یہاں اور کتنی نعمتوں کا شکر ادا کیا جاتا ہے جو آپ ہی ملول ہوں۔ کثرتِ گناہ سے انسان پر وبال پڑتا ہے اور نعمتیں بھی زحمت لگنے لگتی ہیں۔

ہم نے تسنیم خان سے پوچھا کہ تمھارے خاندان میں اس رشتے کی کیا حیثیت ہے۔ کہنے لگے ہماری طرف چھوٹی عمروں میں شادی ہوتی ہے۔ ساس کے ابھی آٹھ میں سے پانچ بچے ہی پیدا ہوئے ہوتے ہیں، بچاری کو روایتی ساس بننے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ میری شادی تائی یعنی بڑی ماں کے گھر ہوئی ہے اور میں تو انہیں بڑی ماں ہی کہتا ہوں۔ تم اپنی ساس کو کیا کہتے ہو؟ اس نے خواجہ سے پوچھا:

جو منہ میں آئے۔ خواجہ نے کہا۔ کیا مطلب خان نے پوچھا۔ مطلب یہ کہ ساس سامنے نہ ہو تو سب کچھ کہتے ہیں، سامنے ہو تو منافقت میں خاموش رہتے ہیں۔

اگر بفضلِ خدا آپ شادی کے مرحلے سے نہیں گزرے تو یاد رکھیں اقبالؒ نے تمنا آبرو کی ہو اگر گلزار ہستی میں والا شعر ساس کے حوالے سے ہی کہا تھا۔ اگر آپ اسے ہمارا خوش دامن فوبیا نہ سمجھیں تو عرض ہے کہ اقبالؒ نے وجودِ زن سے تصویرِ کائنات میں جس رنگ کا ذکر کیا ہے وہ زن دراصل خوش دامن ہیں کیونکہ جو شگوفے خاندان میں کھلتے ہیں ان کی باغبانی اور آبیاری انہی کے سپرد ہے۔ آپ کی بدحالی کی تصویر کی مصور یہی ہیں۔ یہ کائنات آپ کا پیارا گھر ہے، جس ساز پر آپ رقص کناں ہیں وہ میوزک انہوں نے ہی کمپوز کیا ہے آپ زندگی کے سوز دروں کی تلاش میں ہیں۔

ساس بہو کے جھگڑے کی بڑی وجہ کم بچے!

خواجہ کہتے ہیں فی زمانہ ساس بہو کے جھگڑے کی بڑی وجہ بچوں کی کم تعداد بھی ہے۔ پہلے نو وارد دُلھن کا واسطہ 6/نندوں، 8/دیورانیوں اور جیٹھانیوں سے پڑتا تھا۔ 14/گھنٹے کے دن میں ہر ایک کے حصے میں ایک گھنٹہ ہی تو آیا۔ اب ایک بہو ایک ساس گویا ہر ایک کے حصے میں 7-7 گھنٹے۔ پہلے وسیع و عریض حویلی، قریب قریب اچھے پڑوسی رشتہ داروں کے گھر۔ کہیں چلے گئے اور دل بہل گیا۔ اب 4/مرلے کا گھر اجنبی پڑوس اور مقابلہ دو بدو لہٰذہ Hatred Density بھی عروج پر ہوتی ہے۔ خواجہ صاحب اس مسئلہ کو فزکس کے علاوہ ریاضی کے حوالے سے بھی حل کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں کیونکہ خواجہ صاحب متاثرہ سسرال یا یوں کہیں کہ ساس گزیدہ ہیں اس لیے ایک دن رنجیدگی اور سنجیدگی سے کہنے لگے یار یہ دونوں ساس بہو اگر ضرب و تقسیم کے چکر میں رہیں تو ایک تقسیم ایک یعنی دونوں اکیلی، ان کے آپس میں تفریق ہوئی تو دونوں صفر اور اگر پیار سے جمع ہوجائیں تو دوگنی ہوسکتی ہیں لیکن ایسا کیونکر ہوسکتا آخر؟

سسرال چلے جائیے اور شرم سے ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی۔

خیر اللہ آپ کو آپ کی ساس کے ساتھ خوش رکھے۔ میں ذرا اس ادارے پر نالش کرنے چلا جس نے میرا نام استعمال کرکے یہ مضمون چھاپ دیا ہے۔ خوف خدا نہیں رہا ایک صاحبِ ساس کو سرِعام بدنام کرتے ہوئے خیال نہیں آیا انھیں.....!

طنز و مزاح

انتخابِ اَرسطو

پانچ سال بعد

اُن نجی و درباری ماہرینِ تعلیم کا تذکرہ جو خود کو عقلِ کل اور اُستاد کے انتخاب کو یونان سے جوڑنے پر تلے بیٹھے ہیں

محمد عمر احسن

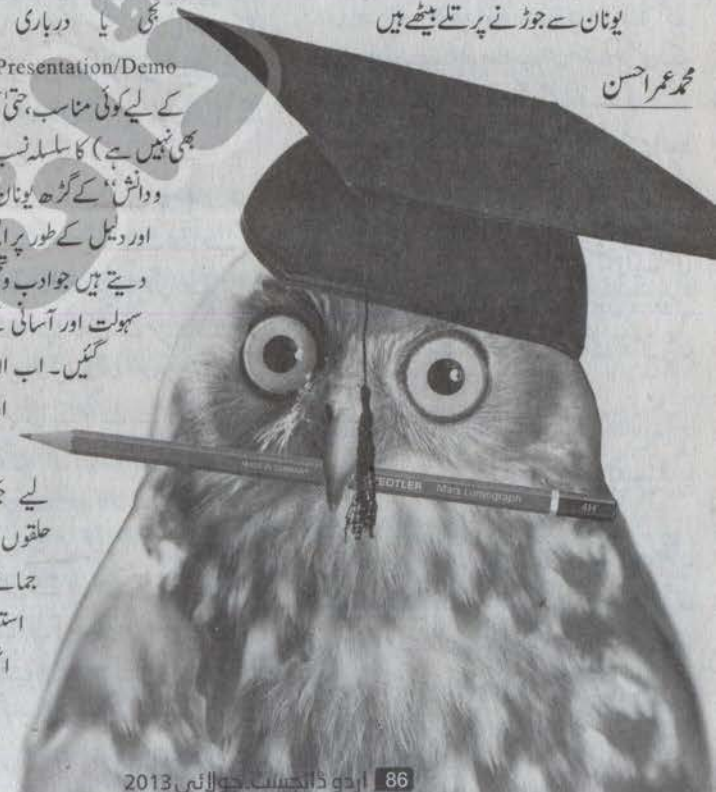

اگر آپ اُستاد ہیں اور آپ ڈیمو یا Demo Presentation کے جان لیوا مراحل سے نہیں گزرے تو آپ کی استادی ایسے ہی مشکوک ہے جیسے بغیر تار والے نوٹ کا کھرا ہونا۔ آپ ایک ایسے وکیل ہیں جس نے قانون تو پڑھا لیکن جج کے کبھی روبرو نہ ہوا۔ ایک ایسے سپاہی ہیں جس نے تربیت تو حاصل کی ہو لیکن محاذِ جنگ میں نہ اُترا ہو۔ قدیم یونان اور روم کی طرح آج بھی تعلیمی اداروں میں Presentation اور انٹرویو آپ کی لاعلمیت کو پرکھنے اور جانچنے کا معتبر اور موثر ذریعہ ہیں۔

نجی یا درباری ماہرین تعلیم Presentation/Demo (اُردو میں ان کے لیے کوئی مناسب، حتیٰ کہ نامناسب لفظ بھی نہیں ہے) کا سلسلہ نسب جھٹ سے ''علم و دانش'' کے گڑھ یونان سے ملاتے ہیں اور دلیل کے طور پر ایسی کتب کا حوالہ دیتے ہیں جو ادب و تحقیق کے طلباء کی سہولت اور آسانی کے لیے ناپید ہو گئیں۔ اب ان کتابوں کا نام ادبی حلقوں میں حوالہ دینے کے لیے جبکہ 'بے ادب' حلقوں میں رعب جمانے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ انہی میں سے کچھ کتابوں کے

مطابق یونانی لوگ اساتذہ کا انتخاب ٹھونک بجا کر بالکل اسی طرح کرتے تھے جیسے قصائی بکرے کا حسب نسب اور سن بلوغت معلوم کرتا ہے یا جیسے مکینک گاڑی خریدنے سے پہلے انجن وغیرہ دیکھتا بھالتا ہے۔ یونانیوں کے بارے میں ضروری ہے کہ استادوں کی بھرتی کے لیے پبلک سروس کمیشن بنانے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ Presentation، پھر انٹرویو لیا کرتے..... ناکام ہونے والے راندۂ درگاہ کر دیے جاتے۔ کامیاب امیدواروں کی لسٹ آویزاں کر دی جاتی۔ انتخاب کی اتنی محتاط چھلنی سے پھر سقراط، بقراط، ارسطو، افلاطون، اقلیدس، فیثا غورث وغیرہ ہی نکل کر ماسٹر بن پاتے..... کامیاب نہ ہونے والے ملازم، فوجی، سرکاری افسر تو بن جاتے لیکن پھر کبھی زندگی بھر استاد نہ بن پاتے۔

مہیا عیش کے سامان ملکی اور مالی تھے
سکندر جب گیا دنیا سے دونوں ہاتھ خالی تھے

موصوف نے، نہ پارٹ ٹائم اکیڈمی پڑھانے کا چسکا لیا، نہ 3 مہینے مع تنخواہ موسم گرما کی چھٹی کی اور نہ موصوف نے قبل از مرگ پسماندگان نے بعد از مرگ پنشن پائی تو پھر کیا خاک سکندری پائی۔

سکندر کی طرح ہماری قسمت نے بھی انگڑائی لی، ایک نجی کالج والوں نے فون کر کے بلوایا ''ہم جانچنا چاہتے ہیں کہ آپ کو اپنے مضمون (انگریزی) سے متعلقہ وغیر متعلقہ کیا کچھ نہیں آتا۔''

حسب عادت میں گلے میں نکٹائی کا پھندا ڈالے، اپنی ڈگریوں، اعزازی اسناد کی بیساکھی اور ماں جی کی دعا (اللہ تجھے انٹرویو لینے والے کے شر سے محفوظ رکھے) کے ہمراہ متعلقہ کالج پہنچا۔ کالج کیا تھا، انٹرویو اور Presentation کا اکھاڑہ تھا۔ بڑے بڑے امیدوار چاروں شانے چت اپنی اپنی ڈگریوں کا تماشا دیکھنے آئے تھے۔ بڑے ہال کے ساتھ وائس پرنسپل کا کمرا تھا..... بس صاحب یوں سمجھیں کہ دوزخ کی فرنچائز تھی، جو امیدوار اس کمرے سے نکلتا، پسینے میں نہایا ہوا ہوتا اور چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی ہوتیں۔

جب سکندرِ اعظم کو منہ کی کھانا پڑی

سکندرِ اعظم کے بارے میں بھی ان مفقود کتب میں یہی درج ہے کہ غربت اور محلے داروں کے طعنوں سے تنگ آ کر مقدونیہ سے ایتھنز پہنچا کہ چلو کسی نجی کالج میں بھرتی ہو جاؤں گا، عزت کی روٹی کماؤں گا۔ (اس وقت پڑھانا ایک باعزت شعبہ گنا جاتا تھا) ساتھ کچھ ٹیوشنز بھی مل جایا کریں گی۔ جب پریزنٹیشن میں پیش ہوا تو ساری ہوا نکل گئی۔ ایسے ایسے (علمی و ادبی) سوالات پوچھے گئے کہ سکندر کے باپ دادا بھی لاجواب تھے۔ یوں سکندر صاحب کو منہ کی کھانا پڑی، انٹرویو میں سختی سے مسترد کر دیا گیا۔ دل برداشتہ ہو کر فوج میں بھرتی ہوا، محنت کی، بزورِ شمشیر جرنیل بنا، آدھی دنیا فتح کی اور دونوں ہاتھ خالی دنیا سے چلتا بنا۔

میری باری آنے پر مجھے بھی اس دوزخی کمرے

میں بھیج دیا گیا۔ بڑا شاندار کمرا تھا، اسے سی چل رہا تھا، ایک بہت بڑے میز کے پیچھے، گھومنے والی کرسی پر وہ موصوف سفاری سوٹ میں ملبوس دھنسے بیٹھے تھے، خشخشی سی سفید ڈاڑھی، ناک پر ایک بطلیموسی عینک سوار تھی، جس کے موٹے شیشے ان کی علمیت کا چیختا چلاتا ثبوت تھے۔ جو باقی بچے تھے وہ بھی نذر و نیاز کے منتظر تھے۔ کالج میں یہ بابائے انگریزی کے نام سے مشہور تھے۔ غلطی نکالنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ اگر خدانخواستہ کسی تحریر یا گفتگو میں سے غلطی نہ نکلتی تو پریشان ہو جاتے پھر چشمہ بدل کر دوبارہ غوطہ زنی کرتے اور غلطی نکال کر ایسے تشہیر کرتے جیسے بلی چوہے کو بل سے نکال کر۔ گفتگو میں سے ایسی مین میخ نکالتے کہ ان کے مدمقابل کو فوراً اپنی کم مائیگی، طفلِ مکتبی، جب کہ موصوف کی علمیت کا شدت سے احساس ہو جاتا۔ سنی سنائی بات ہے مہمانوں کے سامنے پیش کیے جانے والے بسکٹوں کے ڈبے پر سے بھی گرامر اور سپیلنگ کی غلطیاں نکال لیتے۔ لہٰذا اسٹاف کی پوری کوشش ہوتی کہ ان کے کمرے میں جو کچھ بھی جائے، وہ انگریزی کی مطبوعہ نہ ہو۔ کمرے میں جو قائداعظم اور علامہ اقبال کی تصاویر آویزاں تھیں، حفظِ ماتقدم کے تحت ان کے نیچے کیے گئے دستخط بھی کھرچ دیے گئے تھے۔

''ہوں..... تو جناب انگریزی صاحب Demo دینے تشریف لائے ہیں؟'' آواز بہت مدھم تھی، بمشکل خود ان کو سمجھ آئی ہو گی اور لہجہ بھی مال گاڑی جیسا سست تھا۔

''جج..... جی..... جی ہاں۔'' میں نے اعتراف جرم کر لیا۔

''کون سی یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہیں؟''

یونیورسٹی کا نام سن کر ایسے ناک بھوں چڑھائی جیسے کسی برہمن کے سامنے شودروں کی کسی یونیورسٹی کا نام لے لیا ہو۔

''میٹرک کی انگریزی میں بڑے کم نمبر حاصل کیے ہیں؟'' میری اسناد پر کرسی نگاہیں جمائے ہوئے پوچھا۔

''اس وقت ناسمجھ تھا اور بے خبر تھا کہ آپ کے سامنے پیشی ہو سکتی ہے، وگرنہ گستاخی کیونکر ہوتی۔''

''ہوں..... سنا ہے آپ ادیب اور آرٹسٹ بھی ہیں؟''

اپنی تخلیقات کے پوسٹ مارٹم کے خیال سے میں لرز اٹھا۔ ''کسی دشمن نے اڑائی ہو گی..... وگرنہ..... من آنم کہ من دانم۔''

آدھ گھنٹہ میں سوالات کے کٹہرے میں کھڑا رہا۔ پھر فرمایا ''تشریف رکھیں، دراصل ہم اُستاد ذرا دیکھ بھال کر، ٹھونک بجا کر رکھتے ہیں۔ پہلے آپ کا بی ایس سی میں Demo ہو گا، پھر ایک اجتماعی انٹرویو..... اور پھر میرٹ!''

گھنٹی بجائی، ایک چپراسی حاضر ہوا۔

''بی ایس سی کلاس کو کہو، تیار ہو جائیں، ایک استاد (یوں کہا جیسے شکار) Demo دینے آ رہا ہے، مارک ٹوئن کے مضمون ''لعنت زدہ نسلِ انسانی'' کو اچھی طرح دیکھ لیں۔

آدھ گھنٹے بعد مجھے Demo کے لیے کلاس کی طرف اس طرح لے جایا گیا، جیسے رومی سپاہی مجرموں کو بھوکے شیروں کے سامنے ڈالنے کے لیے لے جایا کرتے تھے۔ وہ 40/ طلباء کی کلاس تھی، جو مجھ پر پل پڑنے کو بے تاب تھے۔ 2/ انگریزی کے استاد اور ایک وہ بابائے انگریزی..... خونی کھیل شروع ہوا۔

جیسے تیسے اپنا تعارف کرایا۔ مضمون کا نام بورڈ پر لکھا۔ ابھی شروع ہی ہوا تھا کہ بابائے انگریزی نے بچوں کو ایک خاص نظر سے دیکھا..... بس پھر کیا، وہ لشکرِ نوجوانانِ ملت مجھ پر ٹوٹ پڑا۔ مجھ پر سوالات بھی یقیناً ''دانش مندی'' کے زہر میں بجھے ہوئے تھے۔

''سر! مارک ٹوئن کا مقصدِ حیات کیا تھا؟''

''یہ بتانا کہ انسان لعنت زدہ نسل ہے۔''

سر! مارک ٹوئن کے مرحوم پھوپھا کا نام کیا تھا، جو ان سے بے حد محبت کرتے تھے؟'' (قہقہے)

''ہر بجگر نوف!''

''رہتے کہاں تھے؟'' ایک اور تیر آیا۔

''ٹوئن پورہ کے چک 81 ایسٹ میں۔''

''جناب برٹرینڈ رسل کا نام برٹرینڈ رسل کیوں تھا؟ کچھ اور بھی تو ہو سکتا تھا ناں؟''

''اس کے اماں باوا نے یہی رکھا تھا کیونکہ ان دنوں انگریزوں میں ایسے ہی نام رائج تھے۔ انڈیا میں ہوتا تو پتیسہ دیو یا بھگدڑ سنگھ یا پاکستان میں ہوتا تو آر۔ کے فضل یا الف میم شمس پوری ہوتا۔''

''سر! اگر ولیم شیکسپیئر نہ ہوتا تو.....؟''

''ایم اے انگریزی آسان ہو جاتا، لیکن خود ساختہ اقوال کو شیکسپیئر کے سر منڈھ کر دوسروں پر رعب ڈالنا ممکن نہ رہتا۔''

''سر! آج کل ہمارے تعلیمی اداروں سے بڑے لوگ نکلنا ختم ہو گئے ہیں؟ کیوں؟''

''کیونکہ بیٹا اب اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں عمر کی حد (Age Limit) رکھ دی گئی ہے۔ اس لیے بڑے لوگ اب داخلہ لینے کے اہل نہیں ہیں تو پھر فارغ التحصیل ہونے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔''

قناعت

قناعت زندگی کی کامیابی کا سب سے بڑا راز ہے۔ اکثر حالات میں آدمی صرف اس لیے ناکام رہتا ہے کہ وہ اپنے بارے میں زیادہ اندازہ کر لیتا ہے، وہ اپنی حقیقی استعداد سے زیادہ بڑا اقدام کر دیتا ہے، وہ ''حکم'' پر قناعت نہ کرتے ہوئے ''زیادہ'' کی طرف دوڑ پڑتا ہے۔ آدمی اگر مذکورہ تاجر کے اصول پر رہے تو وہ کبھی ناکامی سے دوچار نہیں ہو سکتا۔

جو آدمی زیادہ خرچ کی استطاعت رکھتے ہوئے کم خرچ کرے وہ کبھی اقتصادی بحران کا شکار نہیں ہو گا۔ جو آدمی دوڑنے کی طاقت رکھتے ہوئے آہستہ چلے اس کے ساتھ کبھی یہ حادثہ پیش نہ آئے گا کہ وہ راستہ میں تھک کر بیٹھ جائے۔ جو اپنے مخالف پر وار کرنے کی پوزیشن میں ہوتے ہوئے صبر کر جائے وہ کبھی اپنے مخالف سے شکست نہیں کھا سکتا۔ جو بڑے کام کے قابل ہوتے ہوئے اپنے آپ کو چھوٹے کام میں لگا دے وہ کبھی اپنی کوششوں کو رائیگاں کرنے والا ثابت نہیں ہو گا۔ جو سیاسی مقابلہ آرائی کا موقع رکھتے ہوئے غیر سیاسی کام میں اپنے آپ کو مشغول کر لے اس کا یہ انجام بھی نہ ہو گا کہ پُرشور عمل کے بعد بالآخر اس کے حصہ میں جو چیز آئے وہ صرف احتجاج اور فریاد ہو۔ جس کے لیے شہرت کا میدان کھلا ہوا ہو مگر وہ اپنے کو گم نامی کے میدان میں کام کرنے پر راضی کر لے۔ وہ کبھی اس حال میں دُنیا سے نہیں جا سکتا کہ اس نے اپنے پیچھے اپنا شاندار مقبرہ تو چھوڑا ہو مگر اس کے عمل کے شاندار نتائج کا کہیں پتا نہ ہو۔

ایک مخلص کا قول ہے ''دُور کے بڑے فائدہ کی خاطر قریب کے چھوٹے فائدے کو قربان کیا جا سکتا ہے۔'' اس میں شک نہیں کہ یہ ترقی کا بہت اہم اُصول ہے مگر اس اصول کو وہی لوگ برت سکتے ہیں جو دُور تک سوچ کر اقدام کرنا جانیں نہ کہ فوری طور پر بھڑک کر اُٹھ کھڑے ہوں۔

(مولانا وحید الدین کی کتاب ''راز حیات'' سے اقتباس)

''میرا مطلب ہے، ہومر، ورجل، ارسطو اب کیوں نہیں پیدا ہوتے؟''

''کیونکہ یہ لوگ ایک مرتبہ اپنے پیدا ہونے کی باری لے چکے ہیں۔ اب قدرت ان کو بار بار پیدا کرنے سے قاصر ہے۔ ویسے بھی ابھی قانون قدرت میں Re-birth یا Re-cycling کا امکان ہے ہی نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس خطے میں لوگ اپنے بچوں کے لیے ایسے نام پسند نہیں کرتے جو پہلے سے بگڑے ہوں اور ان کو مزید بگاڑا نہ جا سکے..... اب آپ ہومر، ورجل، اقلیدس، بطلیموس، فیثا غورث کو مزید بگاڑ کر کیا بنائیں گے؟''

''فرض کریں، انگریزی ادب میں ورڈزورتھ نہ ہوتا؟''

ایس۔ٹی کالرج بے حد خوشحال ہوتا، بال بچے دار ہوتا۔''

''بس صاحب!'' بابائے انگریزی نے تیر اندازی رُکنے کا اشارہ کیا۔

غالباً یہی وہ محاذ تھا جہاں سکندر ناکام ہوا تھا لیکن ابھی رسوائی کے امتحان باقی تھے۔ انٹرویو کے لیے دوبارہ بابائے انگریزی کے روبرو حاضر کیا گیا۔ جو اس وقت ایک بچے کی عدالت لگائے بیٹھے تھے۔ وہ بچہ غالباً چھٹی کی درخواست لے کر آیا تھا لیکن Principal کے بعد کومہ نہ لگانے کے جرم کا مرتکب ٹھہرا تھا۔ 'سٹی' کے بعد فل اسٹاپ بھی نہیں تھا۔ اس بچے سے فراغت کے بعد موصوف میری طرف متوجہ ہوئے۔ انٹرویو میں اپنی معاونت کے لیے چار دوسرے مضامین کے مصاحبوں کو طلب فرمایا۔ اب وہ پانچ کا پینل اور میں تہی دست، ان کے علمی ''گرزوں'' کے رحم و کرم پر تھا۔

''آپ کا ریاضی کیسا تھا؟'' ریاضی کے استاد نے پوچھا۔

''جیسے ریاضی والوں کی انگریزی ہوتی ہے۔''

''قائداعظم کے دوسرے سیکرٹری کون تھے؟'' مطالعہ کے استاد نے سوال داغا۔

''معلوم نہیں۔''

''ذہن پر زور دیں۔''

معذرت چاہتا ہوں، نہیں معلوم۔''

''پھر بھی..... کوشش تو کریں!''

''اتنا یقین ہے کہ میں نہیں تھا، میرے علاوہ کوئی اور ہو، کہہ نہیں سکتا۔''

''قرۃ العین حیدر نے ''آگ کا دریا'' کیوں لکھا؟''

''ایم اے اردو والوں کی مشکلات میں اضافہ کرنے کے لیے۔''

''شمالی امریکا کے جنوب میں کیا واقع ہے؟''

''استاد ہوں، کوئی بین الاقوامی پٹواری نہیں جو زمین کی ہیر پھیر سے متعلق اتنی تفصیل بتا سکوں۔''

ہٹلر کیسے مرا؟''

''قضائے قدرت سے۔''

''مطلب..... مرا کس طرح تھا؟''

''موت آئی مر گیا۔ اب یہ تو نصیر الدین شاہ ہو تو اداکاری کر کے بتلائے کہ یوں مرا تھا۔''

''ڈی ایچ لارنس اور منٹو کی تحریر میں کیا فرق تھا؟''

''ڈی ایچ لارنس بائیں سے دائیں جب کہ منٹو دائیں سے بائیں کی طرف لکھتا تھا۔''

''کوزے کو انگریزی میں کیا کہتے ہیں؟''

''یہ انگریزوں میں مستعمل نہیں لہٰذا اسے Koza ہی کہیں گے۔''

''کوزے کو Koza ہی کہیں گے؟ کیوں؟''

''کیوں کہ انگریز ایسی نعمتوں سے محروم ہیں، یہ نعمت صرف برصغیر پاک و ہند کے حصے میں آئی ہے۔''

''فرض کریں آپ 40/ بچوں کی کلاس پڑھا رہے ہیں، کوئی طالب علم بلی یا کتے کی آواز نکالتا ہے، آپ کیا کریں گے؟''

''میں پڑھاتا رہوں گا۔''

''آپ کوئی ایکشن نہیں لیں گے؟''

''دیکھیے صاحب! اگر کوئی نسل انسانی یا اشرف المخلوقات ہونے پر خوش نہیں تو میرا ایکشن اس کا کیا بگاڑ لے گا؟''

''شیکسپیئر کو گھٹی کس نے دی تھی؟''

''معلوم نہیں۔''

فرض کریں ہم آپ کو منتخب کر لیتے ہیں، آپ کتنی تنخواہ لیں گے؟ اس بات کو مدنظر رکھیں کہ آپ کو شیکسپیئر کی گھٹی والا سوال معلوم نہیں اور کوزے والا جواب بھی مشکوک تھا۔'' تنخواہ بتائی! بابائے انگریزی کھُسر پھُسر کے بعد بولے'' آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ تدریس کتنا مقدس شعبہ ہے اور استاد کتنا عظیم رتبے والا شخص ہوتا ہے۔ اس کو دولت پرست نہیں ہونا چاہیے۔''

''بجا فرمایا آپ نے ..... بس غلطی سے اس عظیم شخص کے ساتھ بھی ایک پیٹ منسلک کر دیا گیا ہے اور یہ دوزخ باتوں اور تقدس سے نہیں بھرتا۔''

''بہرحال جتنی تنخواہ آپ مانگ رہے ہیں، کسی طور مناسب نہیں..... آپ کا علم محدود اور سطحی سا ہے گرامر آپ کی کمزور ہے.....''

''نہیں صاحب! بات اس سکندری کرسی کی ہے جس پر آپ تشریف فرما ہیں۔ یہاں بیٹھ کر ہر مدمقابل جاہل، اَن پڑھ اور نااہل نظر آتا ہے۔ وہاں بیٹھ کر آپ میرے ساتھ وہ سلوک کر سکتے ہیں جو سکندر نے آدھی دُنیا کے ساتھ کیا تھا۔ لیکن وقت کا ہیر پھیر ہوا اور آپ میرے روبرو ہوں تو اس کرسی پر بیٹھ کر آپ کے ساتھ وہی سلوک کر سکتا ہوں جو باقی غیر مفتوحہ دنیا نے سکندر کے ساتھ کیا تھا۔''

آپ میرے تجربے، علم اور باریک بینی کی تذلیل کر رہے ہیں؟'' وہ سیخ پا ہوئے۔

''ہرگز نہیں! ماں نے نصیحت کی تھی کہ 2/ اشخاص کا تم کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ ایک نہر کے دوسری طرف کھڑے ہو کر گالیاں دینے والے کا اور دوسرا انٹرویو لینے والے کا۔''

''فیصلہ میرٹ پر کیا جائے گا۔'' انھوں نے فرعونی لہجے میں کہا۔

جب میں اس کمرے سے نکلا تو میں بھی ذلالت کے پسینے میں شرابور تھا۔ آخر انگریزی کے دیوتا کے سامنے پیش ہو کر آ رہا تھا۔ اس بات کو گزرے سال ہونے کو ہے۔ ابھی تک 'میرٹ' نہیں بنا، سنا ہے ارسطو کا انتخاب 5/ سال بعد ہوا تھا۔ سو! میں بھی منتظر ہوں۔

■■■

حکمت کے ہیرے

★ دنیا کی مہنگی ترین چیز عزت ہے۔
★ وقت ایسا انمول ہیرا ہے جسے کھو کر پانا ناممکن ہے۔
★ فضول بحث بہترین دوست سے جدا کر دیتی ہے۔
★ جب عقل پختہ ہو جائے تو گفتگو ختم ہو جاتی ہے۔
★ اپنا راز محفوظ رکھنا چاہتے ہو تو خود سے بھی چھپا لو۔
★ معمولی نیکی بھی مغفرت کا سبب بن سکتی ہے۔
★ خاموشی گفتگو کا سب سے بڑا فن ہے۔

(انتخاب: محبوب اقبال)

اُردو دُنیا کے شہنشاہِ ظرافت

ایک خوش کلام شاعر کا پُرلطف احوال
اُن کی شہرت کے ڈنکے پاکستان سے پہلے
ہندوستان میں بج چکے تھے

شکیل فاروقی

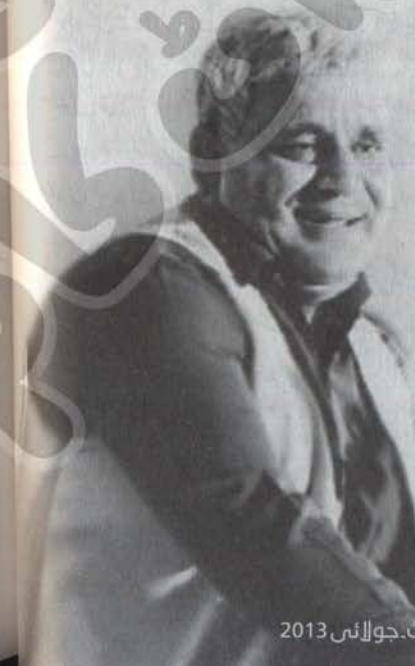

بسا اوقات بزرگوں کے منہ سے نکلی باتیں حرف بہ حرف درست ثابت ہوتی ہیں مثلاً شوکت تھانوی نے بچپن میں درج ذیل برجستہ شعر کہا تھا۔ تب تمام بزرگوں نے یک آواز یہ کہا تھا۔ ''یہ بچہ بڑا ہو کر ضرور شاعر بنے گا۔''

نہ روٹی نہ سالن میں بھوکا ہوں
اے میرے اللہ میں کس سے کہوں

اگرچہ دلاور فگار کے حوالے سے ہمارے علم میں ایسی کوئی بات نہیں، لیکن غالب کے گمان میں ہے کہ ان کے بارے میں بھی کسی پہنچے ہوئے بزرگ نے یہی کہا ہوگا ''یہ بچہ بڑا ہو کر ایک نابغہ روزگار شاعر بنے گا۔'' 25 جنوری 1998ء کو یہ خوش کلام و خوش گلو شاعر رونے والوں کو ہنساتا ہوا پاپوش نگر کے قبرستان میں اَبد کی نیند جا سویا۔

دلاور حسین المتخلص فگار 8/ جولائی 1929ء کو بھارت کے سب سے بڑے صوبے اُتر پردیش (یوپی) کے مشہور و معروف مردم خیز قصبے بدایوں میں پیدا ہوئے۔ اس کی مٹی نے بڑی بڑی نامی گرامی شخصیات کو جنم دیا ہے۔ اگر صرف شاعری کے حوالے سے ہی بدایوں کا ذکر کیا جائے تو دلاور فگار کے علاوہ فانی بدایونی، شکیل بدایونی، محشر بدایونی اور اللہ اُنھیں تادیر سلامت رکھے بھائی منظر بدایونی کے نام ہی کافی ہیں۔ یہ سب ایک ہی لڑی میں پروئے موتیوں کی طرح ہیں۔ حسنِ اتفاق ہے کہ دلاور فگار محشر صاحب اور منظر بھائی

سے ہماری دِلی قرابت رہی۔ رہی بات ہماری اور فگار صاحب کی تو ہم دونوں نے آگے پیچھے بھارت سے پاکستان ہجرت کی اور کراچی کو اپنا مسکن بنایا۔

اگرچہ پاکستان میں بھی فگار صاحب کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی مگر اُن کی شہرت کے ڈنکے بہت پہلے پورے ہندوستان میں خوب زور و شور کے ساتھ بج چکے تھے۔ سچی بات یہ ہے کہ وہ جس مشاعرے میں جاتے اس پر چھا جاتے اور اپنے منفرد کلام اور پڑھنے کے انداز سے مشاعرہ لوٹ لیا کرتے۔ اس سے انکار نہیں کہ اُن کے ہم عصروں میں بڑے بڑے مزاح گو شامل تھے مگر اُن کی بات ہی کچھ اور تھی۔ بہ قول غالب:

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

جن لوگوں نے فگار صاحب کو ہندوستان اور پاکستان میں مشاعروں میں کلام پڑھتے ہوئے دیکھا ہے، وہ بلا تامل و تکلیف اس بات کی گواہی دیں گے۔

ہمارا یہ منصب ہے اور نہ مقام کہ فگار صاحب کا کسی سے موازنہ کریں لیکن خدانخواستی کی بنا پر اتنا ضرور عرض کرنا چاہیں گے کہ مزاح گوئی میں اکبرالہ آبادی کے بعد اگر ہمیں کسی نے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے تو وہ دلاور فگار ہی ہیں۔ صاحبو! پسند اپنی اپنی، خیال اپنا اپنا۔ ہوسکتا ہے کہ کچھ لوگ اختلاف کریں اور یہ بھی ممکن ہے کہ بہت سے لوگ اس سے اتفاق کریں۔

مزاح نگاری اور مزاح گوئی بڑا جان جوکھوں کا کام ہے۔ یہ تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف ہے۔ اس میں بھول چوک کی کوئی گنجائش نہیں۔ زبان و بیان کی معمولی سی لغزش سے بڑا مزاح گو پھکڑ پن اور ابتذال کی گہری کھائی میں گر سکتا ہے۔ فگار صاحب کا سب سے بڑا کمال یہی تھا کہ وہ کبھی ڈگمگائے نہیں۔ ان کا ایک اور بڑا کمال یہ ہے کہ اُنھوں نے زندگی کے بڑے بڑے مسائل کی ماہر سرجن کی طرح سرجری کی اور طنز و مزاح کے نشتروں کو نہایت احتیاط اور چابکدستی کے ساتھ استعمال کیا۔ مثال کے طور پر رشوت ستانی کے سنگین مسئلے پر ان کے اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

حاکم رشوت ستاں فکرِ گرفتاری نہ کر
کر رہائی کی کوئی آسان صورت چھوٹ جا
میں بتاؤں تجھ کو تدبیر رہائی مجھ سے پوچھ
لے کے رشوت پھنس گیا ہے، دے کے رشوت چھوٹ جا

کلام کی آفاقیت اور ہمہ گیری فگار کی مزاح نگاری کا ایک نمایاں وصف ہے۔ ان کے اشعار آج بھی اسی طرح تر و تازہ اور حسبِ حال ہیں۔ عام آدمی کی روزمرہ زندگی کے مسائل کو منفرد و دلچسپ انداز میں پیش کرنے پر اُنھیں عبور حاصل تھا۔ اس حوالے سے فگار کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں اور لطف اٹھائیں۔

گھر آنے کو جب مل نہ سکی کوئی سواری
سوچا کہ چلو چل کے پکڑ لیں کوئی لاری
دستے میں ہر اُفتاد و مصیبت کا تھا امکان
لاری ہی پہ لکھا تھا کہ ''اللہ نگہبان''
سیدھی عدم آبادی کو جاتی تھی یہ لاری
مخلوق کو خالق سے ملاتی تھی یہ لاری

ماضی اور حال کا خوبصورت موازنہ کرتے ہوئے اپنے منفرد انداز میں وہ یوں فرماتے ہیں۔

؎ کھا کے خالص گھی اگر غالب جیے تو کیا جیے
ہم کو دیکھیں جی رہے ہیں سُونگھ کر سرسوں کا تیل
دورِ حاضر کو بھلا نسبت کہاں اُس دور سے
آپ ہی سوچیں کہاں ٹٹو کہاں پنجاب میل

فگار صاحب نے شعر گوئی کا آغاز 14 برس کی عمر میں 1942ء میں کیا۔ بہت جلد اُنھیں مولوی جام نوائی بدایونی اور مولانا جامی بدایونی جیسے اساتذہ کی صحبت اور رہنمائی میسر آئی جس نے اِن کی صلاحیتوں کو نکھار دیا۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے قصبے بدایوں ہی میں حاصل کی اور بعد ازاں آگرہ یونیورسٹی سے ایم۔اے (اردو) کیا۔ اُنھوں نے ایم۔اے (انگریزی) اور ایم۔اے (اکنامکس) کی ڈگریاں بھی حاصل کیں۔ اپنے کیریئر کا آغاز درس و تدریس سے کیا۔ ہجرت کر کے کراچی آنے کے بعد عبداللہ ہارون کالج میں بحیثیت لیکچرار کچھ عرصہ اُردو پڑھائی جہاں فیض صاحب پرنسپل ہوا کرتے تھے۔

فگار صاحب کو صرف شاعری پر ہی نہیں نثر پر بھی عبور حاصل تھا مگر ان کی شہرت ایک مزاح گو شاعر کے طور پر ہی ہوئی۔ پہلی مرتبہ جب انھوں نے دہلی میں اپنی نظم ''شاعرِ اعظم'' پڑھ کر سنائی اُن کی مزاح گوئی کی دھوم مچ گئی پھر وہ وقت بھی آیا جب انھیں ''شہنشاہِ ظرافت'' اور ''اکبرِ ثانی'' جیسے خطابات سے نوازا گیا جس کے وہ بلاشبہ بجا طور پر مستحق تھے۔

درس و تدریس کے علاوہ وہ کچھ عرصہ اسسٹنٹ ڈائریکٹر، ٹاؤن پلاننگ کے طور پر کے ڈی اے سے بھی وابستہ رہے جسے معاشی جبر یا غمِ روزگار بھی کہا جا سکتا ہے۔ پھر ''اے روشنیٔ طبع تو برمن بلا شُدی'' کے مصداق ان پر ایک کڑا وقت بھی آیا جب انھیں اپنا سایہ بھی گریزاں نظر آیا۔

بس یہی وہ وقت تھا جب ہمیں اُن کا انتہائی قرب میسر آیا اور ان کا بیشتر وقت ہمارے ساتھ ہی گزرنے لگا مگر اس عرصہ دشوار کو خیر مستوء (Blessing in disguised) کہا جائے تو شاید یہ مبالغہ نہ ہوگا کیونکہ اس خاکسار کے مشورے کے نتیجے میں ہی وہ شاہکار منظر عام پر آیا جس کا عنوان ''خوشبو کا سفر'' ہے۔ 100 منتخب ملکی اور غیر ملکی آفاقی منظومات کے انگریزی سے اردو میں تراجم پر مشتمل یہ کتاب دلاور فگار کا لافانی کارنامہ ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ترجمے پر اصل کا گمان ہوتا ہے۔ بس یوں کہیے کہ فگار صاحب قادر الکلام شاعر کی حیثیت سے ان نظموں کو اردو کے سانچے میں ڈھال دیتے مثلاً ٹی۔ایس۔ایلیٹ کی مشہور نظم Moving Stairs کے ایک اقتباس کا ترجمہ بعنوان ''چلتی سیڑھیاں'' ملاحظہ فرمائیں۔

؎ جیسے پت جھڑ میں نرم شاخوں سے
پتیاں نیچے گرنے لگتی ہیں
یونہی زینہ کے نقش میں اکثر
سیڑھیاں چلنے پھرنے لگتی ہیں

اب ملاحظہ فرمائیے ایڈورڈ لیئر کی چھوٹی سی نظم ''Old man with a Beard'' کا خوبصورت ترجمہ بعنوان ''مذاق''۔

؎ کوئی بزرگ جو ریش دراز رکھتے تھے
مذاق میں کسی لڑکے سے کل یہ کہتے تھے
یہ ریش ریش نہیں صرف اک بہانہ ہے
یہی قفس ہے، یہی میرا آشیانہ ہے
اِس آشیاں میں بہت سے طیور رہتے ہیں
نہ جانے آپ ہی کیوں دُور دور رہتے ہیں

ایسا ہی خوبصورت رواں ترجمہ فگار صاحب نے ولیم ورڈزورتھ کی مشہور نظم ''Daffodils'' کا ''نرگس کے پھول'' کے عنوان سے کیا ہے جس کے چند اشعار بطور نمونہ درج ذیل ہیں۔

؎ ابرِ آوارہ کی صورت گھومتا پھرتا تھا میں
ابر جو اُڑتا ہے اونچا وادی و کہسار پر
اتنے میں نرگس کے پھولوں کا بڑا سا اک ہجوم
اپنے زرّیں رنگ میں مجھ کو معاً آیا نظر
جھیل کے نزدیک پیڑوں کے تلے یہ نرم پھول
لہلہاتے 'ناچتے' چھوتی تھی جب بادِ سحر
سلسلہ در سلسلہ جیسے عروسِ کہکشاں
آسمان پر کچھ ستاروں کی چمکتی رہگزر

اسی طرح مشہور امریکی شاعر رابرٹ فراسٹ کی شہرہ آفاق نظم ''Stopping By Woods on A Snowevzing'' کا یہ بے مثال ترجمہ بعنوان ''برفانی جنگل میں قیام''

؎ یہ فضا' یہ برف یہ موسم یہ تاریکی یہ شام
اور میرا ایسے میں اس سنسان جنگل میں قیام
کون ہے جنگل کا مالک یہ مجھے معلوم ہے
اُس کا گھر کچھ دُور ہے اس دشت سے معلوم ہے
اس کو کیا معلوم اس جنگل میں کیوں ٹھہرا ہوں میں
برف پیراہن درختوں ہی پہ کیوں شیدا ہوں میں

ہمیں یقین ہے کہ رابرٹ فراسٹ کی روح بار بار فگار صاحب کی عظمت فن کی داد دے رہی ہوگی۔

اب اس تناظر میں دلاور فگار صاحب کی اس منظوم

فیل ہونے کی پیشین گوئی

ہر سال امتحان کے بعد جب گھر آتا تو والدین کو نتیجے کے لیے پہلے ہی سے تیار کر دیتا، رفتہ رفتہ نہیں بلکہ یک لخت اور فوراً۔ رفتہ رفتہ تیار کرنے سے خواہ مخواہ وقت ضائع ہوتا ہے اور پریشانی مفت میں طول کھینچتی ہے، ہمارا قاعدہ یہ تھا کہ جاتے ہی کہہ دیا کرتے تھے کہ اس سال تو کم از کم پاس نہیں ہو سکتے۔ والد کو اکثر یقین نہ آتا۔ ایسے موقع پر طبیعت پر بڑی اُلجھن ہوتی، مجھے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے میں پرچوں میں کیا لکھ آیا ہوں۔ اچھی طرح جانتا تھا، ممتحن لوگ اگر نشے کی حالت میں پرچے نہ دیکھیں تو میرا پاس ہونا قطعاً ناممکن ہے۔ چاہتا ہوں کہ میرے تمام بہی خواہوں کو بھی اس بات کا یقین ہو جائے تا کہ وقت پر انھیں صدمہ نہ ہو لیکن بہی خواہ ہیں کہ میری تمام تر تشریحات کو محض کسر نفسی سمجھتے ہیں۔ آخری برسوں میں والد صاحب کو فوراً یقین آجایا کرتا تھا کیونکہ تجربے سے ان پر ثابت ہو چکا کہ میرا اندازہ غلط نہیں ہوتا لیکن اِدھر اُدھر کے لوگ ''اجی نہیں۔ اجی صاحب کیا کر رہے ہو۔ اجی یہ بھی کوئی بات ہے۔'' ایسے فقروں سے ناک میں دم کر دیتے۔ بہر حال اب کے ہم گھر پہنچے۔ ہم نے حسبِ دستور اپنے فیل ہونے کی پیشین گوئی کر دی۔ دل کو یہ تسلی ہوئی تھی کہ بس یہ آخری مرتبہ ہے۔ اگلے سال پیشین گوئی کرنے کی کوئی ضرورت نہ ہوگی۔

(پطرس بخاری کی کتاب ''پطرس کے مضامین'' سے اقتباس)

لفظوں کی لسانی اصلیت..... تراویح

تراویح عربی زبان کا لفظ ہے۔ ایک زمانے میں اس کے معنی تھے مطلقاً بیٹھے رہنا، نشست۔ بعد میں یہ لفظ اُس نشست یا بیٹھک کے لیے استعمال ہونے لگا جو ماہِ رمضان میں نمازِ تراویح میں نمازی ہر 4 رکعت کے بعد قائم کرتے ہیں۔ عصرِ حاضر میں تراویح ماہِ رمضان میں عشاء کے بعد پڑھی جانے والی نماز کو کہتے ہیں۔ اس نماز میں 5 سیٹوں پر مشتمل 20 رکعات ہوتی ہیں۔ ہر سیٹ میں 2 دُگانے 4 رکعات پڑھی جاتی ہیں۔ بعض حضرات کل 8 رکعات پڑھتے ہیں۔ عربی میں تراویح اسم جمع ہے۔ اس کی واحد ترویحہ ہے۔ اُردو میں تراویح کا اطلاق واحد اور جمع دونوں پر ہوتا ہے۔

(ممتاز ڈاہر کی کتاب "سیاحت لفظی" سے اقتباس)

دعا کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیے، جس سے انھوں نے "خوشبو کا سفر" کا آغاز کیا ہے:

میرے اللہ، اے میرے معبود
میری فکر سخن ہو لامحدود
میری فکر و نظر کو وسعت دے
بوئے گُل کو سفر کی رخصت دے
میرا فن ہو فراست کا ابہام
کسی صحرا میں ہو مجھے بھی شام

"خوشبو کا سفر" کے پیش لفظ میں سید امجد علی (مرحوم) سابق ڈائریکٹر جنرل ڈیپارٹمنٹ آف فلمز اینڈ پبلی کیشن، وزارتِ اطلاعات و نشریات، حکومت پاکستان رقم طراز ہیں:

"ان نظموں کو پڑھ کر ترجمہ کا خیال بھی دل میں نہیں گزرتا۔ انھوں نے غیر ملکی نظموں کو نئے قالب ڈھالا ہے۔"

اس کتاب کے پیش لفظ بعنوان "پیش دستی" کے آخر میں فگار صاحب لکھتے ہیں "سوچتا ہوں کہ ترجمہ کا یہ سلسلہ یہیں پر ختم نہ ہو بلکہ کچھ عرصہ بعد اسی قسم کا ایک اور مجموعہ پیش کروں۔" مگر افسوس کہ زندگی اور حالات زندگی نے انھیں اتنی مہلت ہی نہ دی کہ وہ یہ کام انجام دیتے جو کہ ان کی کُلاہ میں ایک اور سرخاب کے پَر کے مترادف ہوتا۔

اگرچہ دلاور فگار کی وجہ شہرت ان کی مزاحیہ شاعری ہی قرار پائی لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک ہمہ جہت قادر الکلام سخنور تھے۔ ان ہی کے الفاظ ہیں "لوگ کہتے ہیں کہ میں طنز و مزاح نگار ہوں۔ گویا کہ طنز و مزاح شاعری کم از کم سنجیدہ شاعری سے الگ کوئی فن ہے۔ جہاں تک میری طنز نگاری کا تعلق ہے، یہ میری سنجیدہ شاعری ہی کی بنیاد پر بنی دوسری منزل ہے۔ ظاہر ہے کہ بالاخانہ کو گراؤنڈ فلور سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔" شاید بہت کم لوگ اس بات سے آگاہ ہوں "کہ دلاور فگار ایک منفرد نعت گو بھی تھے۔ دراصل ان کی شخصیت اتنی ہمہ گیر اور پہلودار تھی کہ ایک مختصر سے کالم میں اس کا احاطہ کرنا ناممکن کی جستجو کے مترادف ہوگا۔

ایک مرتبہ کراچی آرٹس کونسل کے ایک ادبی اجتماع میں انھوں نے نہایت دلچسپ انداز میں اپنے تخیلاتی آسمانی سفر کا قصہ سنایا۔ اُس روز فرشتوں نے اُنھیں جنت میں داخل ہونے سے محض اس بنا پر روک دیا تھا کہ وہ مقررہ وقت سے قبل وہاں پہنچ گئے تھے۔ فرشتوں کا کہنا تھا کہ وہ واپس جائیں اور 5 سال بعد وہاں آئیں۔ یہ 31 جنوری 1993ء کا واقعہ ہے۔ اس کے تقریباً 5 سال بعد یعنی 25 جنوری 1998ء فگار صاحب نے رختِ سفر باندھا اور ملک عدم کو سدھار گئے۔ ■■■

جہاز بیتی

خواب سے حقیقت تک

ایک معصوم سے سوال کا زندگی بخش ماجرا

وہ یادوں کا حصہ بن کر گم ہونے کی بجائے
زندہ ہو کر سامنے آگیا تھا

حسن رزاقی

ہوائی جہاز سے مجھے شاید بچپن سے ہی انتھی کر دیا گیا تھا۔ "تم بڑے ہو کر کیا بنو گے؟" یہ سوال مجھ سے مسز احمد نے کیا تھا۔

پاکستان کو بنے ہوئے صرف چند سال ہی ہوئے تھے۔ میرے والدین برٹش انڈیا کے اس حصہ سے جو آج بھارت کہلاتا ہے، میں آچکے تھے جس کو مغربی پاکستان کا نام دیا گیا تھا۔ ہمارا قیام پیر الٰہی بخش کالونی کے کوارٹر میں تھا۔ وسائل کی کمی کے سبب ہم لوگ باقاعدہ اسکول نہیں جا سکتے تھے۔ گھر پر پڑھا کرتے تھے، چوتھی جماعت تک کا کورس گھر پر ختم کرنے کے بعد ہم لوگ پیر کالونی کے ہی ایک اسکول "ہیپی گارڈن" میں پانچویں جماعت میں داخل ہو چکے تھے۔ مسز احمد کلاس ٹیچر تھیں۔

مسز احمد دبلی پتلی، لانبے قد کی خاتون تھیں۔ جن کی آنکھوں کے اندر شفقت اور ان کے اوپر عینک ہوا کرتی تھی۔ ایک دن ان کے دل میں خدا معلوم کیا خیال آیا کہ انھوں نے کلاس کے تمام لڑکے لڑکیوں سے معلوم کرنا چاہا کہ وہ تعلیم ختم کرنے کے بعد اپنی زندگی کس طرح گزاریں گے۔ مجھ سے پہلے بہت سے لڑکے لڑکیاں اپنے اپنے جواب دے چکے تھے اب میری باری تھی۔

اس وقت میری عمر شاید گیارہ بارہ سال رہی ہوگی۔ یہ شعور نہ تھا کہ تعلیم کا اور عملی زندگی کا آپس میں کیا رشتہ ہے اور تعلیم کا بنیادی مقصد کیا ہے؟ یہ احساس نہ تھا کہ تعلیم انسان کو عملی زندگی گزارنے کے لیے تیار کرتی ہے۔

اس زمانے اور اس عمر میں بھی تعلیم کے تربیت اور لیاقت و قابلیت کا پہلو زیادہ تر لوگوں کی

نظروں میں نہ تھا۔ سارا زور تعلیم کے معیشت کے پہلو پر تھا۔ آج تعلیم کا واحد مقصد معیشت رہ گیا ہے..... تعلیم دینے والوں کے لیے بھی اور تعلیم حاصل کرنے والوں کے لیے بھی۔ اب سارا زور نقل کر کے امتحان پاس کر کے ڈگری کا کاغذ حاصل کرنے پر ہو چکا ہے۔ تربیت نہ گھر پر ہے کہ ماں باپ دونوں پیسا کمانے میں سرگرداں ہیں اور نہ ہی اسکول میں کہ استاد اگر کلاس میں ہی سب کچھ پڑھا دیں تو ان سے ٹیوشن لینے ان کے گھر پر کون آئے گا۔

میں نے بلا جھجک اپنا خواب مسز احمد کی خدمت میں پیش کیا۔ ''میں ہوائی جہاز کا انجینئر بنوں گا۔''

مسز احمد کی آنکھوں میں کچھ بے یقینی کی کیفیت تھی۔ ''ہوائی جہاز کے انجینئر بنو گے؟ پائلٹ نہیں بنو گے؟'' انھوں نے تصدیق کرنا چاہی۔

''جی نہیں پائلٹ نہیں انجینئر بنوں گا۔ پائلٹ صرف جہاز اڑاتے ہیں، میں جہاز بناؤں گا، صرف اڑاؤں گا نہیں۔''

وہ گھڑی شاید قبولیت کی گھڑی تھی۔

اس مکالمہ کے چند ماہ بعد ہمارے امتحان تھے۔ اس کے بعد تین مہینے کی گرمیوں کی چھٹیاں تھیں جو ہم لوگوں کو اپنے ماموں کے گھر شہر لاہور میں گزارنا تھیں۔ ان کا گھر لاہور کے علاقہ ماڈل ٹاؤن میں تھا۔

ماڈل ٹاؤن واقعی ماڈل ٹاؤن تھا۔ چار چار، چھ چھ کنال گھر۔ ہر گھر کے اطراف چار دیواری کی بجائے درختوں کی باڑیں اور مکانوں کی عمارات کے آگے اور پیچھے کی طرف پھل دار درخت، پھولوں کی بہار، حدنظر تک پھیلی ہوئی تھی۔ کراچی کے پیر الٰہی بخش کالونی کے دو کمروں کے کوارٹر کے مقابلہ میں..... جس میں تین خاندان اور کئی بچے آباد تھے۔ چھے کنال کا یہ گھر؟ جنت کے بالا خانہ سے کس طرح کم نہ لگتا تھا۔ کراچی کے کوارٹروں کے بند کمروں میں رہنے والے بچے اس نعمت بے بہا کو پا کر بے قابو ہو چکے تھے۔ ہر وقت کھیل کود میں مشغول رہتے۔ دھما چوکڑی مچی رہتی، ہر وقت کا شور شرابہ اور ہماری تفریح ہماری ماؤں کے لیے مستقل درد سر اور جنجال بن چکی تھی۔ وہ اس کا معقول حل ڈھونڈنے کی کوشش میں غلطاں و پیچاں تھیں۔

یکا یک کسی کو خیال آیا کہ بچوں کا مستقبل اس کھیل کود میں تباہ ہو جائے گا۔ اس کا سدباب صرف ایک صورت میں ممکن تھا۔ ان کے لیے فوراً کسی استاد کا بندوبست کرنا چاہیے اور استاد بھی ایسا ہو جو کسی خطا اور قصور کو نہ بخشے اور اگر ممکن ہو تو ہم لوگوں کو دن بھر میں کم سے کم چوبیس گھنٹے ضرور مصروف رکھے۔ تلاش بسیار کے بعد ایک استاد دستیاب ہو گیا۔ گو کہ وہ ہماری ماؤں کے معیار پر پورے نہیں اترتے تھے۔ لیکن چونکہ اور کوئی استاد دستیاب نہ ہو سکا تو ان کو اس مثل کے تحت کہ ''نہیں ماموں سے نکٹے ماموں بہتر ہیں'' چن لیا گیا۔

ماسٹر بشیر، چاہے ہمارے بڑوں کی امیدوں کے مطابق ہوں یا نہ ہوں، وہ ہم بھائی بہنوں کے معیار پر پوری طرح فٹ تھے۔ کچھ دیر پڑھاتے، زیادہ دیر باتیں اور کبھی کبھی پی ٹی کے بہانے ہمارے کھیل کود میں بھی شامل ہو جاتے۔ گو کہ ماسٹر بشیر کے یہ لچھن بزرگوں کو ایک آنکھ نہ بھاتے تھے، جب تک کوئی معقول متبادل نہ مل جائے ''نکٹے ماموں'' کو گوارا کرنا ان کی مجبوری تھی۔

ایک دن ''نکٹے ماموں'' ہم لوگوں سے فارغ ہو کر ہماری ماؤں کی خدمت میں پیش ہوئے۔ وہاں سے

واپس آ کر انھوں نے بتایا کہ اگلے ہفتہ کے کسی دن وہ ہم بھائیوں کو ایئر پورٹ لے جا کر جہاز کے اندر کی سیر کرائیں گے۔ ہم سب بھائی اس خوش خبری پر اچھلنا چاہتے تھے لیکن حالات کی نزاکت کو نظر میں رکھتے ہوئے یہ ارادہ ترک کرنا پڑا کہ کہیں بطور سزا ہمارا یہ پروگرام کینسل نہ ہو جائے۔

دراصل ماسٹر بشیر کا گھر ایئر پورٹ کے نزدیک تھا، ان کا ایئر پورٹ آنا جانا رہتا تھا جس کی وجہ سے ان کی واقفیت ایئر پورٹ کے کسی افسر سے ہو گئی تھی جن کی مہربانی سے یہ نادر موقع ہاتھ آیا تھا۔

عید دو دن بعد ہی آ گئی۔ ماسٹر بشیر نے بتایا کہ کل ہم لوگ ایئر پورٹ جائیں گے جہاں ایک ہوائی جہاز مرمت (Maintenance) کے لیے کئی گھنٹے رکے گا۔ ہم اسی جہاز کی سیر کریں گے۔ رات بھر ہوائی جہازوں نے پیچھا نہ چھوڑا۔ اس رات ہر خواب ہوائی جہاز کی سیر کے بارے میں تھا۔ اگلی صبح ہم سب بھائی وقت سے پہلے بیدار ہو چکے تھے۔ تیار ہو کر بے چینی سے ماسٹر بشیر کے منتظر تھے۔ نظریں گھڑی پر تھیں کہ کہیں یہ آہستہ تو نہیں چلنے لگی ہے۔ ماسٹر بشیر کو دس بجے آنا تھا۔ خدا خدا کر کے ماسٹر بشیر نمودار ہوئے۔ ہم نے ان کو باہر کے گیٹ پر ہی جا پکڑا۔ اگر وہ گھر کے اندر داخل ہو جاتے تو مزید پانچ چھ منٹ ضائع ہونے کا خطرہ تھا۔ ایئر پورٹ تک کا راستہ بڑی مشکل سے کٹا۔ اس سے کم وقت میں تو ہم کراچی سے لاہور پہنچ گئے تھے۔

ہم ایئر پورٹ کی حدود میں داخل ہو چکے تھے لیکن ماسٹر بشیر سیدھا جہاز میں داخل ہونے کے بجائے اپنے دوست کے دفتر میں داخل ہو کر ان سے باتوں میں مشغول ہو چکے تھے۔ ہم لوگوں کو خدشہ ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ لوگ باتیں کرتے رہیں اور ہوائی جہاز ہوا سے باتیں کرنے لگے۔ ایک ایک پل قیمتی تھا مگر ماسٹر بشیر کو اس کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ بالآخر ان کی باتیں ختم ہوئیں اور وہ صاحب ہم لوگوں کو جہاز پر لے جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

جہاز کے نزدیک پہنچے تو دیکھا کہ جہاز پر سیڑھی لگی ہے۔ ہم لوگ دوڑتے ہوئے اس کے اوپر چڑھ کر جہاز میں داخل ہو چکے تھے۔ نیچے ماسٹر بشیر آوازیں ہی دیتے رہ گئے۔ جب ان کے دوست اوپر آ چکے تو وہ ہم لوگوں کو کاک پٹ کے اندر لے جا کر وہاں لگی ہوئی چیزوں کے بارے میں بتاتے رہے کچھ ہم سمجھے، کچھ نہیں۔ ہر چیز کو حیرت اور تجسس سے دیکھ رہے تھے، چھو رہے تھے۔ بیس پچیس منٹ میں یہ سیر ختم ہو چکی تھیں لیکن اس کے اثرات میرے لیے دیرپا ہو گئے۔

ہر چیز اپنے انجام کو پہنچ جاتی ہے۔ ہماری چھٹیوں کو بھی ختم ہونا تھا۔ ہم لوگ واپس کراچی پہنچ چکے تھے اور اسکول کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو چکا تھا۔ جہاز کی سیر کتابوں میں گم ہو چکی تھی۔ مگر جہاز کے حوالے سے میرے لیے ایک اہم واقعہ کا ہونا ابھی باقی تھا۔

میں اپنے والد کے ساتھ اپنی ایک خالو کے گھر ان سے ملنے گیا ہوا تھا۔ خالو گھر پر موجود نہیں تھے مگر ان کے ملاقاتی کمرے میں ایک جاپانی مہمان بیٹھے ہوئے تھے۔

خالو کا کاروباری سلسلہ کسی تعلق سے جاپان سے تھا اور یہ صاحب جن کا نام ''تھاگوچی'' تھا کسی کاروباری سلسلے میں خالو کے پاس آئے ہوئے تھے اور ان ہی کے گھر میں بطور مہمان ٹھہرے ہوئے تھے۔

میرے والد ان سے گفتگو میں مصروف ہو گئے۔ دوران گفتگو معلوم ہوا کہ مسٹر تھا گوچی کا تعلق جاپان کی جہاز ران کمپنی سے تھا اور وہ اسی سلسلہ میں پاکستان آئے ہوئے تھے۔

ان دنوں جاپان وہ جاپان نہیں تھا جو آج ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد ایک ہارا ہوا ملک تھا جو اتحادیوں کا دست نگر بن چکا تھا۔ جرمنی کے ساتھ ساتھ جاپان کو بھی نہ تو فوج رکھنے کی اجازت تھی اور نہ ہی کسی دفاعی صنعت کی۔

ایک طرح سے یہ ان کے حق میں اچھا ہوا۔ کیونکہ جب دنیا کے دوسرے ممالک ایک دوسرے کو تباہ کرنے کے لیے مہلک سے مہلک ترین ہتھیار تیار کر رہے تھے تو جاپان اور جرمنی یہی رقم صنعتی ترقی پر خرچ کر رہے تھے۔ جس کے نتیجہ میں آج وہ صنعتی میدان میں دوسرے ملکوں کو پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ پچاس کی دہائی میں جاپان کی منصوعات کو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا مگر وہ ہر قسم کی تحقیر کی پرواہ کیے بغیر اپنی دھن مین لگے رہے۔ مگر اس دھن میں وہ بچوں کو نہیں بھولے، اس زمانے کے بچوں کے زیادہ تر کھلونے جاپان کے بنے ہوئے ہوتے تھے۔

بہرصورت جب مجھے معلوم ہوا کہ مسٹر تھا گوچی ہوائی جہاز کی صنعت سے منسلک ہیں تو میری دلچسپی بڑھ گئی اور میں..... کہ اب تک ماحول سے بیزار بیٹھا تھا۔ گفتگو میں شریک ہو گیا۔ اس اثناء میں خالو گھر آچکے تھے اور میرے والد کے ساتھ محو گفتگو تھے۔

میرے اور مسٹر تھا گوچی کے درمیان جہاز رانی پر سنجیدہ مکالمہ شروع ہو چکا تھا۔ میرا خیال تھا کہ ہم کو فوری طور پر کراچی میں ہوائی جہاز بنانے کا کارخانہ کھول لینا چاہیے۔

ہم دونوں تقریباً پندرہ منٹ تک اس موضوع پر بات کرتے رہے۔ ان پندرہ منٹ میں ہوائی جہاز بنانے کے سلسلے میں میری معلومات خاصی بڑھ چکی تھیں اور میں اتنی مہارت حاصل کر چکا تھا کہ بغیر کاپی پنسل کی مدد کے محض منہ زبانی اور خیالات کے ذریعہ ہی اپنے کارخانہ کا بنیادی بزنس پلین Business plan مکمل کر لوں۔ تھوڑی بہت مدد مسٹر تھا گوچی نے بھی کی۔

ہمارا خیال تھا کہ شروعات میں ہم حکومت سے ''کالا چھپرا'' کرائے پر لے سکتے ہیں جس میں اپنا پہلا ہوائی جہاز بنانے کا آغاز کر سکتے ہیں۔ پھر جب کاروبار بڑھے گا تو ایئر پورٹ کے اطراف کی زمین حاصل کی جاسکتی ہے۔

جو لوگ ''کالا چھپرا'' سے ناواقف ہیں..... کہ اب اس کا وجود نہیں ہے۔ یہ وہ لحیم شحیم ہینگر تھا جو کراچی ایئر پورٹ سے متصل، برطانوی دیو ہیکل ایئر شپ Airship R101 کے لیے تعمیر گیا تھا مگر کبھی استعمال نہ ہو سکا۔ اس لیے کہ یہ ایئر شپ کراچی پہنچنے سے پہلے ہی گر کر تباہ ہو گیا تھا۔ اس ایئر شپ کو ہوائی ٹائیٹینک Titanic کہنا غیر مناسب نہ ہو گا۔ کالا چھپرا ایک ہولناک قسم کا اسٹرکچر Structure تھا اور کالا رنگ ہونے کی وجہ سے کالا چھپرا کہلایا۔

کالا چھپرا R101 کی مرگ ناگہانی کے بعد بھی مدتوں اپنی جگہ پر قائم رہا۔ آخر کار ایوب خان کے دور حکومت میں ڈھا دیا گیا۔ کچھ لوگوں نے اس کا سوگ منایا کہ شہری ہوا بازی کا ایک شاہکار نیست ونابود ہو گیا۔ زیادہ تر لوگ اس ہیبت ناک منظر سے

نجات پا کر خوش ہوئے۔

ہمارے کارخانہ کی تفصیل تیار تھی اب صرف سرمایہ کاری کا مسئلہ باقی رہ گیا تھا۔ یہ مسئلہ بھی ہم نے اپنی نوزائیدہ مہارت کے زور پر صرف چند منٹ میں حل کر لیا۔

کُل درکار سرمایہ صرف چند لاکھ روپے تھا۔ میرے پاس پاکٹ منی (Pocket Money) جیب خرچ کی بچت کی صورت میں پانچ روپے موجود تھے۔ باقی رقم کا بندوبست کسی بھی بینک سے قرض لے کر کیا جا سکتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ہر بینک ملک کے پہلے ہوائی جہاز کے کارخانہ میں سرمایہ کاری کے لیے بے چین و بے قرار ہوتا ہے۔

میرے والد صاحب کے ایک دوست بینک میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ جب میں نے ان سے سرمایہ کاری کے اس نادر موقع کا ذکر کیا تو وہ اچھل پڑے اور مجھے یقین دلایا کہ ان کا بینک ایسے ہی کاروباری مواقع کی تلاش میں رہتا ہے۔ وہ بہت جلد قرضہ کا بندوبست کر کے مجھ سے دوبارہ رابطہ قائم کریں گے۔ یہ 1956ء کی بات ہے۔ ابھی تک انھوں نے مجھ سے رابطہ نہیں کیا ہے۔ شاید قرضہ حاصل کرنے میں وقت لگ رہا ہے۔ مجھے قوی امید ہے کہ جیسے ہی قرضہ منظور ہوا وہ مجھ سے رابطہ کریں گے۔ اس وقت کا واحد مسئلہ یہ ہو گا کہ حکومت وقت کو ''کالا چھپرا'' دوبارہ تعمیر کروانا پڑے گا تاکہ ہم اس کو حکومت سے کرائے پر حاصل کر سکیں۔ بہرحال یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہونا چاہیے۔ جو حکومت رینٹل پاور اسٹیشن Rental Power Station پر اربوں روپے لٹا سکتی ہے اس کے لیے کالا چھپرا دوبارہ تعمیر کروانا اونٹ کے منہ میں زیرہ کے برابر ہے۔ آخر عوام کے پیسے کا اس سے بہتر اور کون سا استعمال ہو سکتا ہے۔

کالے چھپرے کی تعمیر حکومت وقت کا مسئلہ تھا میرا نہیں۔ میرا مسئلہ اپنی تعلیم جاری رکھنا تھا جو میں نے جاری رکھی یہاں تک کہ میں نے انٹرمیڈیٹ F.Sc کا امتحان دے دیا۔

اس زمانے میں اور شاید آج بھی پاکستان میں صرف دو ہی پیشے تھے، ایک ڈاکٹر، دوسرا انجینئر۔ پاکستان کا ہر طالب علم صرف ڈاکٹر یا انجینئر بننا چاہتا تھا۔ کسی تیسرے پیشہ کا خیال تک گناہ کبیرہ تھا۔ اس صورت حال کے پیش نظر کہ ہو سکتا ہے کہ مجھے انجینئرنگ کالج میں داخلہ نہ ملے، میں نے احتیاطاً جرمن زبان سیکھنا شروع کر دیا کہ اگر پاکستان میں نہیں تو کم از کم میں جرمنی جا کر ہی انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کر سکوں۔ کیونکہ دنیا میں کوئی تیسرا پیشہ تو تھا ہی نہیں۔ مجھے جرمنی جانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ میں NED کالج میں داخلہ لے کر B.E کی ڈگری حاصل کر چکا تھا۔ امتحان دینے کے ایک ہفتہ بعد ہی نتیجہ آئے بغیر..... مجھے ایک برطانوی کمپنی کی پاکستان کی شاخ میں نوکری مل چکی تھی۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ دنیا میں کوئی تیسرا پیشہ کیوں نہیں تھا۔ میری ماہانہ تنخواہ پانچ سو روپے تھی۔ یہ رقم ہر ممکن کوشش کے باوجود خرچ نہیں ہو پاتی تھی۔ حیرت کا مقام ہے آج کے دور میں اس خطیر رقم سے بکرے کا ایک کلو گوشت خریدا جاسکتا ہے۔

اس تمام عرصہ میں ہوائی جہاز کا خیال دل سے تقریباً محو ہو چکا تھا کہ یکا یک اخبار کے نوکریوں کے صفحہ پر نظر پڑی۔ پی آئی اے کا اشتہار تھا۔ ان کو جونیئر ایگزیکٹو Junior executive کی اسکیم کے تحت

الیکٹریکل اور مکینیکل انجینئر کی ضرورت تھی۔ مجھے اپنا بھولا ہوا محبوب ہوائی جہاز یاد آ گیا۔

میں نے درخواست کا فارم پُر کر کے پی آئی کے دفتر روانہ کر دیا۔ میرے آگے مسز احمد کے سوال کا جواب حقیقت کے روپ میں پیش کرنے کا موقع آ چکا تھا۔ ''بڑے ہو کر کیا بنو گے؟''

چند دن بعد انٹرویو کا بلاوا آ گیا۔ ایئر پورٹ پر پی آئی اے کے دفاتر میں جانا تھا۔

وہاں پہنچا تو دیکھا کہ الیکٹریکل اور مکینیکل انجینئروں کا ایک سیلاب موجود تھا جس میں ہر انجینئر پی آئی اے میں نوکری کا طلبگار تھا۔ یہاں پر اگلے پچھلے سب دوستوں سے ملاقات ہو گئی۔ ایک مورچہ پر سب کے سب ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما تھے۔

اس جم غفیر کو دیکھ کر مجھے NED کے فزکس Physics کے استاد محترم جناب ضیا الاسلام صدیقی یاد آ گئے جو NED کے لڑکوں میں اپنے نام کے مخفف ZIS سے یاد کیے جاتے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ استاد محترم نے ہم لوگوں کو فزکس پڑھانے کا ناقابل معافی جرم بھی کیا ہو لیکن ان کی سکھائی ہوئی زندگی کے حقائق کی باتیں آج تک یاد ہیں۔

فزکس پڑھانا اس لحاظ سے جرم تھا کہ جب ہیٹ Heat یعنی گرمی یا حدت کا موضوع آیا تو ان کا تعارفی جملہ تھا۔ ''اگر تمھارا ہاتھ کسی لڑکی کے ہاتھ سے چھو جائے تو تم کو خود بخود معلوم ہو جائے گا کہ ہیٹ کیا ہے۔ مجھے پڑھانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' ظاہر ہے طالب علموں میں ان کا مقبول ہونا لازمی امر تھا۔

ایک دن ہمارا ساتھی ان کی اس زمانے کی تصویر

اللہ کے بارے میں میرے احساسات

اے نبیؐ..... اپنے رب کو صبح و شام یاد کیا کرو دل ہی دل میں، زاری اور خوف کے ساتھ اور زبان سے بھی ہلکی آواز کے ساتھ، تم ان لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ جو غفلت میں پڑے ہیں۔

(سورۃ الاعراف: آیت نمبر 205)

☆☆☆

اللہ جس شخص کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے، اسے دین میں فہم و بصیرت عطا فرما دیتا ہے۔

☆☆☆

''ہر شام سوچو کہ دن کے وقت تم سے کوئی بات منشائے ایزدی کے خلاف تو نہیں ہوئی..... اور پھر سجدے میں گر کر اگلے دن کو بہتر رنگ میں گزارنے کی دعا کرو۔'' (ہلی سینا)

☆☆☆

''اللہ ہمیں مصائب کے دریا میں ڈبونے کے لیے نہیں ہمارے دامن کو دھونے کے لیے ڈالتا ہے۔''

(ابن عربی)

کسی اخبار سے لے آیا جس زمانے میں ہندوستان کی آزادی کی تحریک زوروں پر چل رہی تھی۔ محترم ضیا صاحب کسی سیاسی جماعت کے سرگرم کارکن تھے۔ اسٹیج پر کھڑے ہو کر نعرے بلند کر رہے تھے۔ انھوں نے اس تصویر کو پہچاننے سے انکار کر دیا۔ جب ہمارا ساتھی مصر رہا کہ وہ تصویر استاد محترم ہی کی تھی تو انھوں نے اس کو دوبارہ غور سے دیکھا اور کہنے لگے ''تم مجھ کو وہ تصویر دکھا رہے ہو جس کا چہرہ میرے چہرے سے دو فٹ بڑا ہے۔ بھلا میں اس کو کیسے پہچانتا!'' دراصل اس تصویر میں ان کی داڑھی کی لمبائی تقریباً ڈیڑھ فٹ تھی اور جو ٹوپی وہ پہنے ہوئے تھے وہ ایک فٹ اونچی

تھی۔ ظاہر ہے چہرہ کہیں ٹوپی اور داڑھی کے بالوں کے جھنڈ میں گم ہو گیا تھا۔ وہ اس کو کیسے پہچانتے۔ یہ تو قصہ معترضہ تھا۔

دراصل میں ان کی وہ باتیں دہرانا چاہ رہا تھا۔ جو زندگی کی حقیقتوں کو بے نقاب کرتی ہیں اور کسی بھی اسکول یا کالج کے نصاب میں شامل نہیں ہوتیں۔ جب انسان عملی زندگی میں قدم رکھتا ہے اس وقت یہ حقائق اس کے سامنے عیاں ہوتے ہیں۔ ضیا صاحب کے اقوال زریں تو بے شمار ہیں لیکن اس وقت تذکرہ صرف ان اقوال کا کرنا مقصود ہے جن کا تعلق دوستی سے ہے۔ بینچ (Bench) پر برابر بیٹھے ہوئے لڑکوں کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے ''بینچ پر برابر بیٹھے ہوئے دوست کی جیب سے رومال نکال کر اپنی جیب میں ڈال لیا۔ اگر دوست نے دیکھ لیا تو کہہ دیا ''یار میں تو مذاق کر رہا تھا اگر نہیں دیکھا تو لے کر گھر چلے گئے۔''

ایک دن ارشاد کیا ''آج آپس میں بیٹھے ٹھٹھے کر رہے ہو۔ کل کو امتحان پاس کر کے یہاں سے نکلو گے۔ نوکری کی تلاش میں انٹرویو کے لیے جاؤ گے۔ ایک دوسرے کی گردن کاٹو گے۔'' مجھے ان کا یہ جملہ آج کے مجمع پر پوری طرح چسپاں ہوتا نظر آیا۔ چار، پانچ آسامیوں کے لیے بے شمار امیدوار موجود تھے۔

انٹرویو کا آغاز ہو چکا تھا۔ ایک کے بعد ایک درخواست گزاروں کے نام پکارے جانے لگے۔ جیسے ہی پہلا امیدوار باہر نکلا۔ باقی امیدواروں کے مجمع نے اسے گھیر لیا۔ ہر کوئی یہ معلوم کرنا چاہتا کہ انٹرویو میں کس قسم کے سوالات پوچھے گئے۔ انٹرویو لینے والوں کے تیور کیسے تھے۔ وہ لڑکا کسی قسم کے جواب دینے سے گریز کر رہا تھا۔ دشمن کو کون اپنے خلاف استعمال کرنے کے لیے گولہ بارود دیتا ہے۔

کچھ دیر بعد میرا نام پکارا گیا۔ میں انٹرویو کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ میز کے اس طرف پی آئی اے انجینئرنگ کے تین اور شعبہ ملازمین کے ایک صاحب براجمان تھے۔ اس طرف ایک کرسی تھی مجھے اس پر بیٹھنے کا اشارہ کیا گیا۔ میں بیٹھ گیا۔ میں اپنے آپ کو نروس محسوس کر رہا تھا۔ نہ جانے کیسا سلوک ہو گا، کیسے سوال ہوں گے۔ میرے پاس ان سوالوں کے جواب ہوں گے بھی یا نہیں۔ انٹرویو لینے والوں کا رویہ اس قدر دوستانہ تھا کہ میرے سارے خدشات چند منٹ میں دور ہو گئے۔ دوستانہ ماحول میں سوال جواب ہوتے رہے۔ حیرت اس بات پر تھی کہ انجینئرنگ سے متعلق تو اکا دکا ہی سوال کیے گئے ہوں گے۔ باقی تمام سوالات عملی زندگی سے متعلق تھے۔ جب انٹرویو ختم ہو چکا تو تمام حاضرین نے کھڑے ہو کر مجھ سے مصافحہ کیا۔ لگتا تھا میں کسی دوستوں کی محفل سے رخصت ہو رہا ہوں، انٹرویو سے نہیں۔

چند دن بعد انٹرویو کا نتیجہ آ چکا تھا۔ کل چار امیدوار منتخب کیے گئے تھے۔ دو لاہور سے اور دو کراچی سے، کراچی سے منتخب ہونے والوں میں میرے گہرے دوست اعجاز علی تاج کا اور میرا نام شامل تھا۔ اگلے مہینے میں نے پی آئی اے کے انجینئرنگ کے شعبہ میں شمولیت اختیار کر لی۔ ہوائی جہاز کا اور میرا باقی زندگی ساتھ گزارنے کا عہد مستحکم ہو چکا تھا۔ خواب حقیقت کا روپ دھار چکا تھا۔ مسز احمد کا پوچھا ہوا بارہ تیرہ سال پیشتر کا سوال ایک بار پھر مجھے یاد آ گیا ''تم بڑے ہو کر کیا بنو گے؟''

■■■

یوں تو چھوٹی ہے ذات بکری کی

ذکر ایک پالتو بکری کا
جس نے سب کے دِلوں میں جگہ بنالی تھی

صالحہ محبوب

بچوں کی زندگی کا ہر دور بہت خوبصورت اور انوکھا ہوتا ہے۔ اسی طرح بچوں کی ذہنی، جسمانی اور اخلاقی نشوونما کرتے ہوئے والدین خوش ہوتے ہیں اور پرجوش بھی۔ ہر عمر کے بچوں کی فرمائشیں اور ضروریات مختلف ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی انھیں پورا کرنا ممکن ہوتا ہے مگر اِن کی اہمیت سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا۔

ہمارے تینوں بچوں کی خواہش تھی کہ گھر میں کوئی پالتو جانور ہنا چاہیے۔ ہمارے بھتیجوں نے مچھلیاں پال رکھی تھیں۔ اسی طرح محلے میں دوسروں کے گھروں میں پہلے خوفناک کتے اور معصوم موٹی موٹی بلیاں انھیں بہت متاثر کرتیں۔ تینوں جہاں کہیں جاتے، واپسی پر ٹھنڈی آہ بھر کر کہا جاتا ''کاش ہمارے ہاں بھی کوئی پالتو جانور ہوتا!'' اس کاش کے درد کو چھوٹے بچوں کی مائیں بخوبی سمجھ سکتی ہیں۔

ہمارے بچوں کے صبر کا پیمانہ اس وقت تو بالکل لبریز ہوگیا جب انہوں نے گھریلو سامان کے ٹرک میں لدے ایک خصوصی ڈالے میں پنجرے میں بند قیمتی کتا دیکھا۔ اس کی حفاظت کے لیے دو عدد گارڈ بھی موجود تھے۔ جانے وہ سامان کی حفاظت کر رہے تھے یا کتے کی؟ مگر بچوں کے خیال میں وہاں سب سے قیمتی چیز کتے کے علاوہ کوئی نہیں تھی۔

سرکاری کالونیوں میں تبادلہ اور سامان کا آنا جانا معمول کی بات ہے مگر یہ تبادلہ ہرگز ایسا نہ تھا کہ جسے بچے معمول کی بات قرار دیتے۔ محلے کے تمام بچوں نے بے حد دلچسپی سے کتے کو دیکھا۔ جلد ہی ان کی ملاقات کتے کے مالک یعنی جج صاحب کے بیٹے سے بھی ہوگئی۔ پہلی ملاقات میں تمام باتیں صرف کتے سے متعلق پوچھی گئیں۔ گھر واپسی پر بچے بے حد پرجوش تھے۔

''مما ہمیں بھی ایک کتا چاہیے.....'' تینوں یک زبان ہو کر بولے۔ حالانکہ بچوں کا باہمی اتفاقِ رائے سے بولنا خاصا مشکل کام ہے۔

پھر تینوں نے جج صاحب والے کتے کی شان میں قلابے ملائے۔ حسب نسب پر روشنی ڈالی۔ قیمت اور روز کے کھانے کا بتلایا اور

ہم حیرت اور غصے میں مبتلا!

''بیٹا! جس گھر میں کتا ہو وہاں رحمت کے فرشتے نہیں آتے۔'' ہم نے انہیں سب سے وزنی دلیل دی۔

''ہم اسے گھر نہیں بلکہ باہر سرونٹ کوارٹر یا گیراج میں رکھیں گے۔'' بڑے بیٹے نے فوراً کہا۔

''بلکہ ہم اس کا الگ گھر بنالیں گے۔'' چھوٹے صاحب مزید بولے:

''وہ ناپاک ہوتا ہے، آپ تینوں پلید ہوجاؤ گے۔ ناپاک اور گندے۔''

ہم نے دوسری دلیل دی۔

''ہم اچھی طرح ہاتھ دھولیا کریں گے اور اسے خود سے دور رکھا کریں گے''، بیٹی فوراً بولی۔

''کتوں سے الرجی ہوجاتی ہے۔ بیماریاں لگ جاتی ہیں''، ہم نے تحمل سے انھیں سمجھایا۔

''مما! وہ جج صاحب تو اچھے بھلے صحتمند ہیں۔ ان کے بچے بھی ٹھیک ٹھاک ہیں۔ انھیں تو بیماریاں نہیں لگتیں''، چھوٹا بیٹا بولا۔

''مما! جب ان کا بیٹا اپنے کتے کو گھمانے ساتھ لے کر نکلتا ہے تو بڑا رعب پڑتا ہے۔ سب مڑ مڑ کر دیکھتے ہیں۔'' بڑا بیٹا پھر سنجیدگی سے بولا۔

''ہاں ہاں مڑ مڑ کر کتے کو دیکھتے ہیں اور رعب بھی اسی کا ہی پڑتا ہے، جج صاحب کے بیٹے کا تھوڑی'' اب ہمیں بھی غصہ آگیا۔

''کوئی کتا ہمارے ہاں نہیں آئے گا۔ اب کوئی مجھ سے بات نہ کرے۔'' ہم تینوں کے سامنے سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کی شکلوں پر اس قدر غم کے بادل تھے کہ ہم مسکرائے بنا نہ رہ سکے۔

''اچھا چلیں یوں کریں نانو سے کہیں، امریکا سے واپسی پر ایک کتا ہمارے لیے لیتی آئیں۔'' بیٹی نے تجویز پیش کی۔

''کیوں، نانو کیوں امریکا سے نحوست مارا کتا لے کر آئیں'' اٹھتے اٹھتے ہم پھر بیٹھ گئے۔

''وہاں کے کتے پاک ہوتے ہیں نا..... سارے انگریز گھروں میں کتے رکھتے اور گود میں اٹھاتے ہیں..... اور تو اور سلاتے بھی ساتھ ہیں..... وہاں کے کتوں میں جراثیم بھی نہیں ہوتے اسی لیے انگریز صحت مند رہتے ہیں۔ سارا مسئلہ ہمارے پاکستانی کتوں کا ہے۔''

بیٹی نے ہمیں سمجھایا۔

''بیٹا مسئلہ دیسی اور ولایتی کا نہیں، مسلمان اور غیر مسلمان کا ہے۔ وہ لوگ مسلمان نہیں، اس لیے کتوں کو ناپاک نہیں سمجھتے۔ مگر نانو تو امریکا میں بھی وہاں کے کتوں کو گندا اور ناپاک ہی سمجھتی ہیں۔ بس اب یہ کتے والی تجویز ختم! آپ لوگ مزید ضد نہ کرو۔'' ہم نے بات ہی ختم کردی۔

''اچھا تو چلیں پھر بلی ہی سہی۔'' ہمیں پیچھے سے تینوں کی مشترکہ آواز آئی۔ یعنی پالتو جانور ضروری ہے ہر حال میں، آخر بچوں کی عزت کا سوال تھا۔

مما! بلی تو ناپاک اور نجس نہیں۔ رحمت کے فرشتے کو بھی ہمارے گھر آنے میں کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ بس آپ ہمیں سفید موٹی سی ایرانی بلی لے دیں۔ بیٹی نے اصرار کیا۔

''اچھا یہ ایرانی بلیاں ملتی کہاں سے ہیں؟'' ہم نے بھی تنگ آکر ہتھیار ڈال دیے۔ بڑا بیٹا فوراً اپنا لیپ ٹاپ لے آیا۔ پالتو جانوروں کی ایک سائٹ سے دکان کا پتا دیکھا پھر دکان اور متوقع قیمت! بلی کی قیمت 10,000 روپے تھی۔ عمر تین ماہ خوراک اور رہائش کی تفصیل بھی ساتھ درج تھی۔ یعنی بلی پالنا نہ ہوا ایک اور بچہ پالنا ہوگیا۔

ہم نے ہزار کوشش کی کہ بچے کبوتر، طوطے یا چڑیا پر راضی ہو جائیں مگر تینوں کا فیصلہ تھا کہ پالتو جانور ایسا ہو جس سے ہم کھیل سکیں اور باہر گھما سکیں۔ جو دوستی کرے اور جسے ہاتھ لگایا بلکہ ساتھ سلایا بھی جا سکے۔

کافی بحث و تمحیص کے بعد یہ مسئلہ والد صاحب کی عدالت میں پیش ہوا۔ دونوں طرف کے دلائل سننے کے بعد بچوں کے والد محترم مسکرائے اور پھر بولے۔ ''اس کا تو بڑا آسان حل ہے۔ شرط یہ ہے کہ دونوں فریق میرا فیصلہ ماننے کا وعدہ کریں۔'' موصوف کی مسکراہٹ دیکھ کر ہم سمجھ گئے کہ فیصلہ بچوں کے نہیں بلکہ میرے خلاف ہی متوقع ہے۔ مگر اب ہم پیچھے نہیں ہٹ سکتے تھے۔

انھوں نے فیصلہ کیا کہ تمام شرائط پر صرف اور صرف بکری کا بچہ پورا اترتا ہے۔ وہ ساتھ کھیل بھی سکتا ہے، خوبصورت بھی ہے۔ دوستی بھی کرے گا۔ ناپاک نہیں ہوگا اور سب سے اہم بات یہ کہ رحمت کے فرشتے کو آنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی کیونکہ بکریاں تو نبی ﷺ پالتے تھے۔

''بابا! مگر میرے ساتھ سو تو نہیں سکتا۔'' بیٹی کے ذہن میں نکتہ آیا وہ آپ کے ساتھ نہیں سوئے گا تو آپ اس کے ساتھ سو جانا۔'' ابا نے مسئلہ سلجھا دیا۔

لو جی! اگلے دن ہمارے ہاں ایک خوبصورت سا بکری کا بچہ گلے میں گھنگروؤں والا پٹا ڈالے، پاؤں میں بھی خوب صورت گھنگرو پہنے چھلانگیں لگاتا آن پہنچا۔ بچوں سے دوستی کا یہ عالم تھا کہ تھوڑی دیر تو بچے اس کی رسی پکڑتے اور زیادہ وقت وہ بچوں کے پیچھے چھلانگیں لگاتا پھرتا۔ بچے شام کو اسے ٹہلانے لے کر گئے تو ساری کالونی کتے سے زیادہ اس ننھے منے بکری کے بچے میں دلچسپی لینے لگی۔ عادات و صفات کا مقابلہ ہوا تو ہمارے چھوٹے بیٹے بولے اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ جب یہ آپ کو تنگ زیادہ کرے تو اسے کاٹ کر کھا لو۔ اب بکری کی اس خوبی کا کتے سے کیا مقابلہ؟

تمام ملازم بھی بکری سے بے حد خوش تھے۔ خصوصاً مالی کہ بکری گھاس و فالتو پتے کھا جاتی اور گھر میں کٹی ہوئی گھاس، پھلوں اور سبزیوں کے چھلکے اور پتے بھی۔ بکری کے لیے روز رات کو چنے کی دال بھگو کر صبح ناشتہ کرایا جاتا۔ سردیوں میں جج صاحب کے کتے کے مقابلے کا سویٹر بکری کو پہنایا گیا جسے پہن کر وہ بھی اِتراتی پھری۔ شام میں خشک اور صاف پرالی اسکے گیراج میں ڈالی جاتی۔ بکری خوب اٹکھیلیاں کرتی اور رات کو وہاں چوکیدار کے ساتھ سو جاتی۔

بکری کی ہلکی سی آواز بھی تینوں کو بے چین کر دیتی۔ تینوں اس کا حال معلوم کرنے باہر لپکتے۔ جہاں اس نے آدھا گیراج گندا کیا ہوتا۔ کام والی مائی کا کام کافی بڑھ گیا تھا کہ اسے صبح سویرے سب سے پہلے گیراج دھونا پڑتا، رات کا استعمال شدہ چارہ پھینکنا ہوتا۔

ہمارے چھوٹے صاحبزادے بکری کو روز گندگی پھیلانے سے بچنے کی تمیز کا سبق دیتے جو بقول ان کے بکری سنتی غور سے مگر یاد نہیں رکھتی۔ ہم نے فوراً کہا ''آپ کی طرح!'' موصوف کو ہماری بات بہت بُری لگی، مگر فائدہ یہ ہوا کہ آئندہ وہ تمیز کی باتیں سننے اور یاد بھی رکھنے لگے۔

پالتو جانوروں کا مقابلہ ہنوز جاری تھا۔ سامنے والوں کے کتے کو تو روز اس کا خاص کھانا دن میں تین مرتبہ کھلایا جاتا۔ شام میں اچھا رویہ رکھنے پر اس کی تعریف کر کے اُسے ٹافی دی جاتی۔ نافرمانی پر ٹافی دکھا کر واپس رکھ لی جاتی۔ اب مقررہ وقت پر بکری کو کھانا کھلانا ہمارے بچوں کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ دوپہر اور شام کو ہی اس کے پاس جا پاتے اس دوران وہ معصوم تو جب چاہے جو چاہے چر لیتی تھی۔ مگر ملازم کو حکم

ہوا کہ تین مرتبہ مقررہ وقت پر بکری کو چارہ ڈالا جائے۔ بچوں کو اعتراض تھا کہ بکری کو پھلوں کے صرف چھلکے کیوں دیے جاتے ہیں؟ مکمل پھل کیوں نہیں؟ ہماری نگاہ بچا کر اکثر بچے پورا کیلا، امرود یا سیب بکری کو ڈال دیتے۔ اس حرکت سے جب ایک دو بار بکری کا پیٹ خراب ہوا تو انھیں سمجھ آئی کہ قدرت کے خوراک کے معاملے میں فیصلے بھی کمال کے ہیں۔

اب مسئلہ تھا ٹافی کا! بکری کو ٹافی بالکل پسند نہ آئی جس کا حل گڑ کی صورت میں نکالا گیا۔ اب ہر اچھے برے کام میں تمیز بکری کے معاملے میں ممکن نہ تھی۔ سو شام کو ایک عدد ٹکڑا گڑ کا بکری کو دے دیا جاتا۔ بکری نے جلد ہی سیدھا چلنے کی بجائے چھلانگیں مارنا، بچوں کے پیچھے بھاگنا اور چھوٹے صاحب کے کندھے پر ٹانگیں رکھ کر کھڑا ہونا سیکھ لیا۔ تنہائی سے گھبراتی۔ دن میں گھر اور گیٹ پر چہل پہل میں خوش رہتی مگر شام کو تنہائی میں خوب شور مچاتی۔

بکری کے لیے محبت سب ہی کے دلوں میں جوش مار رہی تھی۔ ایک روز ہم نے ''اپنے کچن گارڈن'' میں اگائی ہوئی سبزی کھاتے ہوئے سوچا کہ اوپر کے تازے پتے بکری کھا لے تو خوش ہو جائے گی۔ سو بکری کو سبزی میں چھوڑنے کا حکم دے دیا۔ ملازم نے پس و پیش کی مگر پھر حکم کی تعمیل کر دی۔ بکری نے بخوشی تمام مولیاں گاجریں، شلجم، پالک، ساگ، میتھی اور دھنیا تناول فرما لیا۔ نتیجے کے طور پر نیچے ہماری سبزی نے مزید بڑھنے اور پھلنے پھولنے سے انکار کر دیا۔ ہماری شکایت پر جب ہمارے شوہر نامدار نے سبزیوں کا جائزہ لیا تو پہلے ملازمین سے جواب طلبی کی کہ سبزی کی کیاریوں میں بکری کو کس نے چرنے کی اجازت دی.....؟ سب یک زبان ہو کر بولے ''باجی نے۔'' مالی بولا ''صاحب ہم نے سمجھایا بھی تھا مگر باجی نہیں مانی۔'' اور ہم الگ شرمندۂ کلیہ میرا جوں کا توں کنبہ میرا ڈوبا کیوں؟ کی تفسیر بنے کھڑے تھے۔ میاں صاحب نے لفظ چبا چبا کر کہا، عقل تو گھاس چرتی ہے۔ بکری کو سبزی چرنے پہ لگا دیا! ذرا خیال نہیں آیا کہ ان پتوں سے ہی پودوں اور جڑوں کو خوراک ملتی ہے۔ ''نان آرگینک سبزی'' اگانے پہ لگی ساری محنت برباد گئی۔

اس دوران بکری بھاگی ہوئی آئی اور ان کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔ میری خاموشی کا فائدہ اٹھا کر شک کا فائدہ بکری کو دیتے ہوئے بولے، ''اب اس میں بکری بیچاری کا بھی کیا قصور!''

''جی جی! خود بھاگ کر اپنی صفائی دینے جو آ گئی ہے۔ میں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ وہ مسکرائے۔

یوں تو چھوٹی ہے ذات بکری کی
دل کو لگتی ہے بات بکری کی

الغرض بچوں اور ہم نے اُس پالتو جانور سے دوسروں کا خیال رکھنا، پیار کرنا اور رحم کھانا سیکھا۔ بکری کی صحبت میں رہ کر اندازہ ہوا کہ نبیوں نے اس کے چرانے کے عملی کام سے تحمل، برداشت، حوصلہ، اور صبر کرنا سیکھا ہوگا۔

خدا کرے ہمارے بچے، گھر اور اسکی خوشیاں اور یہ بکری سب حفاظت سے رہیں۔

عید پر کسی نے بچوں کو کہہ دیا کہ بکری تو ذبح کر دیں گے۔ بچوں کی فکرمندی اور پریشانی دیدنی تھی۔ ہمیں بھی یہ احساس ہوا کہ ہمارا رب کتنا کریم ہے کہ اس نے ہمیں امتحان میں نہیں ڈالا۔ گھر میں پالا ہوا جانور ہی قربان کرنا کتنا مشکل ہے۔ اگر ہمیں اپنی اولاد اللہ کے نام پر قربان کرنے کا حکم ہوتا تو کیا ہوتا؟؟ عید کی رات بچوں کو تسلی دی اور خود بھی رب کا شکر ادا کیا اور خوش دلی سے قربانی کا جانور ڈھونڈنے نکل کھڑے ہوئے۔

■■■

سلگتے سوال

اپنی تاریخ کا عنوان بدلنا ہے تجھے

ایک سوچ کا قصہ جو سوال بن کر یہاں سے وہاں تک پھیلی ہے ''کیا نوکری سب لڑکیوں کیلئے عذاب ہے اور تو قیر گھٹاتی ہے''

مدیحہ انور

ایسے ماحول میں ہم اپنے گھر کی عورتوں کو باہر کیسے نکلنے دے سکتے ہیں؟ اس 'بیمار سوچ' کا مقابلہ کیسے کر سکتے ہیں؟

یہ سوال تھا میرے بہنوئی وہاب کا، جو مکینیکل انجینئر ہے اور ان لوگوں سے مختلف بھی جنھیں خواتین کا نوکری کرنا پسند نہیں۔ وہ اپنی بیگم کو بھی نوکری کرنے کے مشورے دیتا رہتا ہے اور اپنی نومولود بیٹی کو

ہارورڈ یا آکسفورڈ میں پڑھانے کے خواب بن رہا ہے..... لیکن اپنے ڈرائیور کے بیان کردہ ایک واقعے نے اسے پریشان کر دیا تھا۔ وہ بتانے لگا، دفتر سے گھر واپسی پر میرے ڈرائیور نے مجھے ایک قصہ سنایا۔ وہ موٹروے کے ذریعے اپنے گاؤں سے واپس لاہور آ رہا تھا۔ راستے میں جب ٹول پلازہ پر رکا تو اسے یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ ٹول پلازہ پر خواتین بھی ملازمت کرنے لگی ہیں۔ بقول ڈرائیور، 'میں نے خاتون کو ٹول پلازہ کی فیس ادا کی، جب اس نے مجھے بقایا دینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا..... میرا ڈرائیور یہ واقعہ سنا کر دیر تک یوں ہنستا رہا جیسے اس نے واقعی کوئی کارنامہ سرانجام دیا تھا'۔

ایک ملازمت پیشہ خاتون ہونے کے ناطے مجھے یہ واقعہ کسی تازیانے سے کم نہیں لگا..... ابھی چند روز ہوئے بھارت میں ایک تیئس سالہ لڑکی کے ساتھ چلتی بس میں اجتماعی زیادتی اور پھر اس کی موت کا قصہ ابھی ذہن سے محو نہیں ہوا تھا کہ بظاہر اس چھوٹے سے واقعے نے مجھے جیسے کسی زبردست نقصان کا احساس دلایا..... مجھے یوں لگا کہ جیسے کسی نے اندر باہر سے میری روح کو جھلسا دیا ہو..... جیسے موٹروے کے ٹول پلازہ پر اس عورت کی جگہ میں جا بیٹھی..... اور اس سے آگے کا سوچ کر ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

ابھی کل ہی کی تو بات لگتی ہے جب چند سال پہلے میں نے ماسٹرز کے بعد ملازمت کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ میرے والدین کو میرے ملازمت کرنے پر کوئی اعتراض نہ ہونے کے باوجود مجھے خاندان کے چند لوگوں کی طرف سے شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ان کے نزدیک ملازمت اور بالخصوص شعبہ صحافت ان کے گھر کی کسی لڑکی کے لیے کسی طور بھی موزوں نہیں تھا۔ وہی روایتی باتیں، 'کیا ضرورت ہے اسے نوکری کرنے کی..... 'بس گھر بٹھا کر شادی کر دیں'..... 'گھر میں پیسوں کی کیا کمی ہے جو یہ نوکری کرنا چاہتی ہے'..... 'صحافت میں شریف گھرانے کی بچیوں کا کیا کام' وغیرہ وغیرہ۔

اس وقت صحافتی میدان میں اتنی لڑکیاں کام بھی نہیں کر رہی تھیں۔ صحافت کو بطور پیشہ اپنانے کا رواج بھی اتنا 'ان' نہیں تھا..... مگر زمانہ بدلا، الیکٹرانک میڈیا نے جڑیں پکڑیں اور بظاہر ایم بی اے اور آئی ٹی کا شعبہ اپنانے والے طالبعلموں نے بھی اچھے پیسوں کی ملازمت کے حصول کے لیے صحافت کا دامن پکڑنے میں ہی عافیت سمجھی..... کام کا کام اور نام اور شناخت الگ..... ایک بھیڑ چال کا سا ماحول بن گیا لیکن اس بھیڑ چال میں بھی خیر کے کئی پہلو تھے..... جن میں سرفہرست اس شعبے کی جانب لڑکیوں کا رخ کرنا تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بہت سی لڑکیوں نے صحافت میں قدم جمائے..... اور جیسے ہر شعبے میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں..... ویسے ہی صحافت میں آنے والی لڑکیاں بھی مختلف پس منظر سے آئی تھیں اور مختلف مزاج رکھتی تھیں۔ کچھ لڑکیاں بہت فیشن ایبل تھیں، کچھ بہت سادہ بھی تھیں اور کچھ الٹرا ماڈرن تھیں۔

آج پیچھے پلٹ کر اپنے ساتھ لاہور میں ایک نیوز چینل میں کام کرنے والی لڑکیوں کو یاد کرتی ہوں تو کتنے ہی نقش ذہن پر مٹتے ابھرتے چلے جا رہے ہیں۔

بڑے سے دوپٹے میں خود کو لپیٹے وہ لڑکی جو موسم کی شدت سے بے نیاز لاہور کی چلچلاتی دھوپ میں پوری تندہی سے رپورٹنگ کرتی تھی۔ واپس آ کر نیوز رپورٹس فائل کرتی تھی۔ اور کبھی کبھی تو صبح آٹھ بجے کی آئی رات کو بارہ بجے کے بعد ہی اپنے گھر کا رخ کر پاتی تھی۔ وہی جو اپنی چھ بہنوں میں سب سے بڑی تھی اور جس کا کوئی بھائی نہیں تھا۔ جو اپنے والد کا سہارا بننا چاہتی تھی اور انہیں بیٹا بن کر دکھانا چاہتی تھی۔

اور وہ لڑکی جو سندھ کے ایک دور افتادہ علاقے سے آئی تھی۔ سندھی لہجے میں اردو بولتی تھی۔ جس کا باپ کھیتوں میں پانی لگاتا تھا، روکھی سوکھی کھاتا تھا لیکن اپنی بیٹی کو پڑھا کر اپنے خوابوں کی تعبیر پانا چاہتا تھا۔ وہی لڑکی جس نے اپنے باپ کے خوابوں کی لاج رکھی تھی، محنت کی تھی اور نیوز چینل کے پینل پر بطور پروڈیوسر بیٹھتی تھی۔

وہاڑی کی اس لڑکی کو میں کیسے بھول سکتی ہوں..... جو آفس کو آرڈینیٹر کے طور پر آئی تھی، جس کے اکلوتے بھائی نے شادی کے بعد اپنے والدین کو چھوڑ دیا تھا۔ جسے اپنے بارٹ پیشنٹ باپ کی دوائیں لانے کے لیے ملازمت اختیار کرنا پڑی تھی۔ جو ہفتے میں ایک دن کی چھٹی کو غنیمت سمجھ کر باقاعدگی سے وہاڑی جاتی تھی۔ اور اگلے دن سفر کر کے وہاں سے براہِ راست کام پر پہنچتی تھی۔

وہ ادھیڑ عمر خاتون جو پچھلے دس سال سے اسی چینل کے اخبار سے منسلک تھیں اور اب کاپی ایڈیٹر کے طور پر نیوز چینل میں آئی تھیں۔ وہی خاتون جن کے شوہر نے

انہیں شادی کے بارہ سال بعد ایک دوسری عورت پسند آجانے پر چھوڑ دیا تھا اور جن کے تین بچوں کی فیس، کپڑے لتے اور باقی اخراجات کا واحد آسرا ان ہی کی تنخواہ تھی۔

اب یاد کرنے بیٹھی ہوں تو یوں لگتا ہے کہ جیسے ہر چہرے کے پیچھے کوئی کہانی تھی..... ایک ایسی کہانی جس کے تانے بانے گھر، گھر کی ضروریات، ماں باپ، بہن بھائی، شوہر اور بچوں میں چھپے تھے۔ کون عورت پورا دن دفتر میں مغزماری کے بعد گھر کے کام دھندے نمٹا کر 'ڈبل نوکری' کرنا چاہتی ہے؟ تو پھر معاشرے کی اکثریت کو یہ گمان کیوں ہوتا ہے کہ گھر سے نکلنے والی ہر عورت 'بری عورت' ہے۔ جس کی وقعت مٹھائی کی دکان کے رنگین شو کیس میں سجے کیک، پیسٹری سے زیادہ نہیں۔

یادداشت پر تھوڑا زور دیتی ہوں تو یاد آتا ہے کہ 2010 میں صدر پاکستان نے 'کام کرنے کی جگہ پر خواتین کو ہراساں کرنے کے خلاف تحفظ' کے ایک بل پر دستخط کیے تھے..... جسے پارلیمنٹ نے 2010 جبکہ سینیٹ نے 2012 میں منظور کیا تھا۔ اس بل کی 'تعریفات' کی شق 'ح' 'خوف وہراس' کی تشریح کچھ اس طرح کرتی ہے:

'خوف وہراس' سے مراد ہے، 'کوئی ناپسندیدہ پیش قدمی، جسمانی تعلقات کے لیے زبانی یا تحریری درخواست، ایسی صنفی تذلیل جو کام کی انجام دہی میں رکاوٹ کا سبب بنے یا ایسا خوف و ہراس جو جارحانہ یا مخالفانہ ماحول کا باعث بنے..... خواتین ان میں سے کسی بھی شکایت کی صورت میں اس بل کے تحت اپنا تحفظ یقینی بنا سکتی ہیں۔

جرمنی کے نشریاتی ادارے 'ڈوئچے ویلا' کی جانب سے شائع کی گئی ایک رپورٹ کے الفاظ میں، 'پاکستان میں ہر سال ہزاروں خواتین کام پر اپنے مرد ساتھیوں کی جانب سے ہراساں کی جاتی ہیں۔ لیکن خواتین کی اکثریت اس معاملے میں خاموشی اختیار کیے رکھتی ہے۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق 'خواتین کے تحفظ کے بل' کے باوجود پاکستان میں کام کرنے والی 70 فیصد خواتین روزانہ کام پر کسی نہ کسی صورت میں ہراساں کی جاتی ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ زمانے کے انداز بدلنے اور آج سے دس بیس برس پہلے کی نسبت قدرے 'ماڈرن' ہونے کے باوجود آج بھی دفاتر میں کام کرنے والی اکثر خواتین پر تبصرے کیے جاتے ہیں، رائے دی جاتی ہے، بات کی جاتی ہے اور بعض اوقات تو حدود سے تجاوز کرنے کی کوشش بھی کی جاتی ہے۔ اور جو اس پر تیار نہیں ہوتیں، ان کے بارے میں بے بنیاد باتیں پھیلانے سے بھی گریز نہیں کیا جاتا۔

میں بھی اکثر لوگوں کی طرح سوچتی ہوں کہ ہمارے آپ کے روایتی معاشرے میں عورت کو کام کے لیے باہر نکلنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟..... آخر گھر میں ٹک کر کیوں نہیں بیٹھتیں؟ کیوں نوکری کے عذاب میں پھنس کر اپنی توقیر گھٹاتی ہیں؟

لیکن پھر کیفی اعظمی کی مشہور نظم 'عورت' کی کچھ سطریں یاد آجاتی ہیں۔ جہاں وہ عورت سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

قدر اب تک تیری تاریخ نے جانی ہی نہیں
تجھ میں شعلے بھی ہیں بس اشک فشانی ہی نہیں
تُو حقیقت بھی ہے دلچسپ کہانی ہی نہیں
تیری ہستی بھی ہے اِک چیز، جوانی ہی نہیں
اپنی تاریخ کا عنوان بدلنا ہے تجھے
اُٹھ میری جان میرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے!!

100 سال کی کہانی

اسلم خان

برسوں سے لڑتی اکیسویں صدی کی مہذب دنیا کا ماجرا
ایک پوری صدی کا سفر آپ نے یوں آسانی
اور تیزی کے ساتھ پہلے کب طے کیا ہوگا

بحرانوں کا شکار یہ دنیا 20ویں صدی میں کیسے ہنگامہ خیز مراحل سے گزری۔ دو عالمی جنگیں، 6 سلطنتوں کی تباہی، نظریاتی آویزشیں اور اعصاب شکن سرد جنگ، بوڑھے آسمان نے کیا کچھ نہ دیکھا۔ جب گزشتہ صدی کے آخری لمحات میں چنداں سکون اور استحکام نصیب ہوا تو اچانک 9/11 کا سانحہ رونما ہو گیا جس نے ایک بار پھر مہذب دنیا کی ساخت کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔ آیئے 20ویں صدی کے دو دہائیوں میں منقسم 5 حصوں کا سفر کریں، جس سے صرف ایک حقیقت ابھر کر سامنے آتی ہے کہ تمام انسانی دانش، عقل و فہم اور فلسفہ مستقبل کی پیش بینی میں بری طرح ناکام ہو گئے تھے۔

لندن 1900ء موسم گرما

اپنے ذہن کو ماضی میں لے جائیں اور 1900ء کے لندن کا تصور کیجیے جو اس وقت دنیا کا دارالحکومت تھا۔ دنیا جہان پر اس شہر بے مثال سے حکمرانی کی جا

رہی تھی، یورپ جنت ارضی کا منظر پیش کر رہا تھا، ہر طرف خوشحالی اور شادابی تھی۔ یورپ کے مرغزار اپنی خیرہ کن خوبصورتی سے سحر طاری کر رہے تھے، تجارت اور سرمایہ کاری نے سارے یورپ کو ہم آہنگ کر کے ایک کل کا جزو لاینفک بنا دیا تھا۔ جنگ اور اس کی تباہ کاریوں کا دور دور تک شائبہ نہ تھا۔ مستقبل کے منظر نامے میں سدا بہار اور شاداب یورپ، خوشحال اور امن کا مرقع بنا ہوا تھا۔ جس کے متعلق دنیا کے دور دراز خطوں کے دفاعی تجزیہ نگاروں کا خیال تھا کہ اگر کوئی چھوٹا موٹا تنازع اُٹھ کھڑا بھی ہوا تو چند دنوں میں ختم ہو جائے گا کہ یورپ میں بروئے کار عالمی سرمایہ کاری مارکیٹ دباؤ اور تناؤ برداشت نہیں کر سکتی لیکن صرف دو دہائیوں میں ایسی قیامت آئی کہ یورپ کا غذی پرزوں کی طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ کوئی تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ عالمی امن یوں دیکھتے ہی دیکھتے برباد ہو جائے گا۔

1920ء موسم گرما

المناک اور تباہ کن عالمی جنگ کے بعد مستحکم اور خوشحال یورپ کے ٹکڑے ہو چکے ہیں۔ چار بڑی یورپی سلطنتیں آسٹرو ہنگرین، رشیا، جرمنی اور خلافت عثمانیہ ہولناک جنگ کی نذر ہو گئیں۔ یہ ہولناک جنگ امریکی فوجی مداخلت کے بعد ختم ہوئی۔ لاکھوں امریکی فوجی برق رفتاری سے آئے اور باہم گتھم گتھا مختلف یورپی افواج کو علیحدہ کر کے اسی رفتاری سے واپس چلے گئے۔ روس پر اشتراکی قابض ہو گئے۔ کمیونزم عالمی منظر پر جاہ و جلال سے ابھرا۔ اسی طرح یورپی طاقت کے قریبی ہمسائے امریکا اور جاپان عظیم الشان معاشی، اقتصادی اور جنگی طاقت بن کر اُبھرے۔ معاہدۂ امن کی بنیادی اہم شرط جرمنی کو مستقبل قریب میں متحدہ نہ ہونے دینا تھا۔ اس بات کی ضمانت دی گئی تھی کہ جرمنی کو کسی صورت متحد نہیں ہونے دیا جائے گا۔

برلن 1940ء موسم گرما

اب ذرا غور کیجیے تمام تر عالمی کوششوں اور ضمانتوں کے باوجود جرمنی نا صرف متحد ہو چکا ہے بلکہ ہٹلر کی فوجیں فرانس کو چشم زدن میں روند چکی ہیں اور یورپ نازی جرمنی کے تسلط سے آزاد مگر اپنے ہی شکنجۂ استبداد میں جکڑا جا چکا ہے۔ روس میں کمیونزم نے بقا کی جنگ

جیت لی تھی اور سوویت یونین کے نام سے عالمی طاقت مستقبل کے سیاسی منظر نامے پر ابھر آئی تھی۔ جو سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف نازی جرمنی کی فطری اتحادی تھی۔ صرف جمہوری اقدار کا حامل برطانیہ، فاشٹ نازی جرمنی اور اشتراکی سوویت یونین کے مد مقابل کھڑا تھا، عام طور پر کسی نئی جنگ کا دور دور تک کوئی امکان دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اگر ہزار سال کے لیے نہیں تو کم از کم ایک صدی کے لیے تو یورپ کے مقدر کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ اب ہٹلر یورپ کا وارث اور ماضی کی

رفیع الشان یورپی سلطنت کا جائز اور قانونی وارث بن چکا تھا۔ اس وقت دوسری عالمی جنگ یورپ کے دروازے پر دستک دے رہی تھی لیکن معتبر تجزیہ نگاروں اور دانش وروں کو اس کا احساس تک نہیں تھا۔

ماسکو 1960ء موسم گرما

جرمنی تباہ و برباد ہو چکا، ہٹلر کو عبرت ناک شکست کے بعد خودکشی کرنا پڑی۔ امریکا اور سوویت یونین نے باہم اتفاق رائے سے یورپ کو عین وسط سے کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ یورپ غلام ہو چکا اب امریکا اور سوویت یونین یورپ میں اپنے اپنے جانشین ڈھونڈنے کے لیے سر توڑ کوشش کر رہے ہیں۔ سوویت یونین اور امریکا نے اپنے ہلاکت آفرین ایٹمی ہتھیاروں سے یورپ کا محاصرہ کر لیا تھا جو چند گھنٹوں میں تہذیب و تمدن کے مرکز یورپی شہروں کو بھاپ کی طرح تحلیل کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اس بحران میں امریکا ایک طاقتور عالمی طاقت بن کر اُبھرا جس کی تمام سمندروں اور بحری راستوں پر مکمل اجارہ داری تھی اور وہ اپنی ایٹمی آبدوزوں اور بحری طاقت کی وجہ سے ساری دنیا کو احکامات دے رہا تھا۔ سوویت یونین کے ساتھ اعصاب شکن سرد جنگ کا دور شروع ہوا۔ جب ہر لمحے

جنگ کے سائے سروں پر منڈلاتے رہتے تھے۔ صرف روس ہی نہیں بلکہ چیئرمین ماؤ کا چین بھی اُبھرتی ہوئی ایٹمی طاقت کی حیثیت سے سرمایہ دارانہ نظام کی علامت امریکا کو دہشت زدہ کیے ہوئے تھا کہ ماؤ کا سوشلزم یک رخے پن اور سخت گیری کی وجہ سے زیادہ ہراس کا باعث تھا۔

بنکاک 1980ء موسم گرما

1980ء کی تلاطم خیز دہائی کا تصور کیجیے۔ طاقتور امریکا کو سات سال کی طویل جنگ کے بعد شکست فاش ہو چکی۔ مقابلہ ہم پلہ سوویت یونین سے نہیں تھا۔ امریکی افواج قاہرہ کے مقابل، نہتے اور بے آسرا ویت کانگ گوریلے تھے۔ شمالی ویت نامی عوام نے اپنے جذبۂ حریت اور لازوال قربانیوں کے سہارے برتر امریکی افواج کا منہ موڑ کر رکھ دیا تھا۔ امریکی لہولہان اَنا کے ساتھ ذلیل وخوار ہو کر ویت نام سے پسپا ہو رہے تھے۔ امریکیوں کے لیے ذلت کا سفر تمام نہیں ہوا تھا۔ اب انھیں بعد از خرابیٔ بسیار تہران سے بھی بھاگنا پڑا۔ تیل کی دولت سے مالا مال ایران اب ملاؤں کے قبضے میں تھا۔ سوویت یونین کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کا مقابلہ کرنے اور سرخ فوج کی پیش قدمی روکنے کے لیے امریکا کو چار و ناچار چیئرمین ماؤ کے قدموں میں جھکنا پڑا۔ رات کی تاریکی میں اسلام آباد کے راستے ڈپلومیٹک کا سفر ہنری کسنجر نے شروع کیا تھا۔

کابل 2000ء موسم گرما

افغانستان میں لاحاصل لڑائی کے بعد سوویت یونین کب کا ختم ہو چکا، اشتراکی سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو چکی، اس کے بطن سے درجنوں خودمختار ریاستیں معرض

رمضان فانوس (Ramadan Lamp)

رمضان فانوس مصر کی قدیم روایت ہے۔ رمضان المبارک کا مہینا شروع ہوتے ہیں یہ مخصوص ساخت کے فانوس گلیوں، بازاروں اور گھروں کی زینت بن جاتے ہیں۔ جس طرح عید کے تہوار کے لیے کپڑوں اور جوتوں کی خصوصی خریداری ہوتی ہے اسی طرح رمضان میں اس فانوس کو مصری عوام خاص طور پر خریدتے ہیں۔

رمضان فانوس کے بارے میں کئی کہانیاں ملتی ہیں ان میں سے ایک کہانی یہ ہے کہ مصر کا فاطمی خلیفہ الحاکم بامراللہ چاہتا تھا کہ رمضان المبارک میں قاہرہ کی گلیاں روشن رہیں۔ اس نے مساجد کے اماموں کو بھی یہ ہدایات جاری کیں کہ وہ اس ماہِ مقدس میں مساجد کو فانوس سے روشن رکھیں۔ تب سے رمضان فانوس کی روایت شروع ہوئی اور یہ مصر میں آج بھی قائم ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ خلیفہ حاکم بامراللہ ایک کامیاب فوجی مہم کے بعد رمضان المبارک میں جب واپس قاہرہ آیا تو وہ رات کا وقت تھا۔ قاہرہ کے لوگ لیمپ لے کر اس کے استقبال کے لیے شہر سے باہر آگئے۔ پس اس وقت سے رمضان المبارک میں فانوس روشن کرنے کی روایت شروع ہوئی۔

روایت ہے کہ خلیفہ حاکم بامراللہ کے دور میں خواتین کو ماہِ رمضان کے علاوہ کسی اور مہینے میں گھروں سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔ ماہِ رمضان میں بھی وہ کسی بچے کے ساتھ گھر سے باہر نکلتیں اور بچے نے اپنے ہاتھ میں تانبے کا فانوس پکڑا ہوتا تھا۔ یہ فانوس اس بات کی نشاندہی کرتا تھا کہ خواتین آرہی ہیں لہٰذا مرد حضرات راستہ چھوڑ دیں۔

(انتخاب ثمینہ فیروز، ملتان)

وجود میں آچکیں۔ چین دنیا کی سب سے بڑی اقتصادی طاقت بن چکا ہے۔ وہ اب بھی نام کا سوشلسٹ چین ہے لیکن عملاً سرمایہ دارانہ طاقت میں تبدیل ہو چکا ہے۔ نیٹو کا دائرہ کار مشرقی یورپ سے ہوتا ہوا آنجہانی سوویت یونین کے دروازے پر دستک دے رہا ہے کہ

مقابل وارسا پیکٹ، لاوارث قرار دے کر دفن کیا جا چکا۔ 20ویں صدی کے اس جان لیوا اور ہنگامہ خیز سفر کے بعد دنیا ایک بار پھر امن و امان کا گہوارہ بن چکی تھی۔ خوشحالی کا دور دورہ تھا۔ فکر و عمل کا مہتاب اپنی کرنوں سے دنیا کو منور کر رہا تھا۔ روشن مستقبل کے تصور نے ترجیحات کو بدل کر رکھ دیا تھا۔ سیاسی، نظریاتی اور جغرافیائی اور معاشی ترجیحات اور جمہوریت کو کامل فتح نصیب ہوئی تھی، اس دنیا کو صرف چند چھوٹے موٹے علاقائی مسائل کا سامنا تھا۔ ہیٹی، کوسوو، کشمیر اور فلسطین کے تنازعات سے امن عالم کو کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا کہ 9/11، 9 (ستمبر 2011ء) کا واقعہ رونما ہو گیا۔ ایسا سانحہ، جس نے دنیا کا معاشی، سماجی اور سیاسی نقشہ ہی بدل کر رکھ دیا۔ اس بار مہذب دنیا کی لڑائی گوریلوں سے نہیں، نظریات اور سایوں سے ہے، یہ سفر جاری ہے، یہ جنگ جاری ہے، یہ تاریخ کا اختتام نہیں بلکہ اس کا آغاز ہے۔ انجام کیا ہوگا کسی کو خبر نہیں۔ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا کوئی نہیں جانتا۔

■■■

مصریوں نے خوش ہو کر توپ کا نام ہی "حجہ فاطمہ توپ" رکھ دیا

مسلم ممالک میں رمضان المبارک کی قدیم روایات

معظم علی

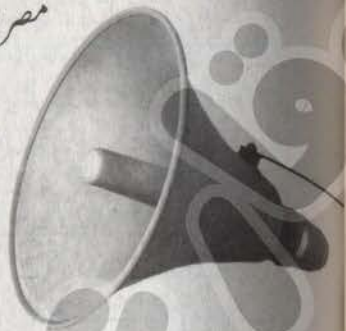

رمضان

المبارک کی آمد کے ساتھ ہی عالمِ اسلام میں ایک مقدس لہر دوڑ جاتی ہے۔ سحر و افطار کا خصوصی اہتمام کیا جاتا ہے۔ برکتوں اور رحمتوں کا یہ پاکیزہ مہینا اپنے ساتھ خوشی اور مسرت کی بہار لے کر آتا ہے۔ اس ماہِ مقدس کو مختلف اسلامی ممالک میں کس انداز سے خوش آمدید کہا اور اس کی برکتوں سے کس طرح فیض یاب ہوا جاتا ہے اس کی ایک جھلک نذرِ قارئین ہے:

رمضان کے ڈھولیے

عرب دنیا میں رمضان کے مقدس مہینے کے حوالے سے بعض ثقافتی روایات اب بھی جاری ہیں۔ ان قدیمی روایات میں ایک ڈھول بجا کر لوگوں کو سحری کے وقت جگانے کی روایت بھی ہے۔ یہ روایت تقریباً 400 سال پرانی ہے اور یہ سلطنت عثمانیہ کے دور سے شروع ہوئی۔ سحری کے لیے جگانے والوں کو رمضان کے ڈھولیے (Ramadan Drummers) کہا جاتا ہے۔ رمضان المقدس کے مہینے میں سحری سے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ قبل ڈھولیے گلی گلی ڈھول بجاتے ہوئے گھومتے ہیں۔ یوں سحری کے لیے جگانے کی روایت اب بھی قائم ہے۔

تُرکی

سحری کے وقت ڈھول بجا کر لوگوں کو جگانے کی روایت ترکی سے شروع ہوئی جب ترکی سلطنت عثمانیہ کا حصہ تھا۔ 400 سال پرانی یہ روایت اب تک پورے جوش و خروش کے ساتھ قائم ہے۔ اس وقت سلطنت کا دارالحکومت استنبول تھا۔ سلطنت عثمانیہ کے دور میں لوگوں کے پاس گھڑیاں نہیں ہوتی تھیں جن سے ان کو سحری کے وقت کا اندازہ لگانے میں مشکل کا سامنا ہوتا تھا۔ اس مسئلہ کا یہ حل نکالا گیا کہ سحری کے وقت ڈھول بجا کر لوگوں کو سحری کے لیے بیدار کیا جائے۔ ڈھول بجانے کے ساتھ ساتھ روایتی ثقافتی شاعری

اور مذہبی گیت بھی گائے جاتے ہیں۔ روایتی ثقافتی اشعار کے ساتھ ساتھ لوگوں کو نماز اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف رجوع کی تحریک دلانے والے ایسے اشعار بھی پڑھے جاتے ہیں جن میں لوگوں کو آخرت کی یاد دلائی جاتی ہے۔ان میں سے کچھ اشعار یوں ہیں۔

تم کیوں سو رہے ہو؟
تم اس نیند سے کیا کما سکتے ہو؟
نماز پڑھو اور اپنے گناہوں کی معافی مانگو
تمہیں جلد آسمانوں پر مدعو کیا جائے گا

استنبول کی میونسپل کمیٹی ہر سال رمضان المبارک میں سب سے بہتر ڈھول بجانے کا مقابلہ کرواتی ہے۔ اس مقابلے میں رمضان المبارک میں سحری کے وقت ڈھول بجا کر لوگوں کو جگانے والے شریک ہوتے اور اپنی بہترین صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ استنبول کے میئر بھی مقابلہ جیتنے کا اعلان کرنے والی جیوری کا حصہ ہوتے ہیں۔

استنبول میں سحری کے وقت ڈھول بجانے والوں کے درمیان شاعری کا زبردست مقابلہ بھی ہوتا ہے۔ تمام ڈھول بجانے والے اپنے علاقے کے کسی کافی ہاؤس میں جمع ہوتے اور سال کے بہترین گلوکار کے گائے ہوئے گانے گا کر باہم مقابلہ کرتے ہیں۔ ایک ڈھول والا کوئی گانا گاتا ہے تو اس کا حریف اس کے جواب میں دوسرا گانا گاتا ہے۔ جب کوئی فریق جوابی گانا نہ گا سکے تو وہ ہار جاتا ہے۔ رمضان المبارک کے اختتامی دنوں میں ڈھول والے گلیوں میں جاتے اور لوگوں سے ان کو سحری کے لیے جگانے کے صلہ میں رقم کا مطالبہ کرتے ہیں اور لوگ بخوشی ان کو اپنی استطاعت کے مطابق پیسے دیتے ہیں۔

ترکی کے جنوبی شہر میں ان ہی ڈرم بجانے والوں میں ایک 44 سالہ خاتون ہانم پولات بھی شامل ہے۔ شاید اسلامی دنیا میں یہ واحد خاتون ہے جو لوگوں کو سحری کے وقت ڈھول بجا کر جگاتی ہے۔ ہانم پولات اسپراتا شہر کے جنوبی حصے میں لوگوں کو سحری کے لیے ڈھول بجا کر جگاتی ہے۔ پولات کا کہنا ہے کہ اس کا خاوند روس میں کام کرتا ہے اور اسے اپنی اور اپنے بچوں کی ضروریات پورا کرنے کے لیے یہ کام کرنا پڑتا ہے۔ میرے آٹھ بچے ہیں اور میں اپنے بڑے بچے کے ساتھ ڈھول بجاتے ہوئے گلیوں میں گھوم کر لوگوں کو سحری کے لیے جگاتی ہوں۔

فلسطین

فلسطین کے شہر غزہ میں بھی رمضان المبارک میں لوگوں کو سحری کے وقت جگانے کے لیے ڈھول بجایا جاتا ہے۔ انہی ڈھول بجانے والوں میں وائل ابوشاوس بھی شامل ہے۔ وائل کو یہ کام خاندانی وراثت کے طور پر ملا ہے۔ اس کے والد یہ کام کرتے تھے۔ آدھی رات گزرنے کے دو گھنٹے بعد وائل اپنا ڈھول اٹھاتا اور غزہ کی گلیوں میں نکل پڑتا ہے۔ وہ ڈھول بجاتا ہے تاکہ لوگ سحری کے لیے بیدار ہو جائیں۔ وائل کا کہنا ہے کہ جب وہ سحری کے وقت ڈھول بجاتے ہوئے گلیوں میں گھوم رہا ہوتا ہے تو اس وقت لوگوں کا اس سے رویہ بہت دوستانہ ہوتا ہے اور چھوٹے بچے کھڑکیوں سے ہاتھ ہلا ہلا کر اس کا استقبال کرتے ہیں۔

امریکا

2009ء میں امریکا کے شہر نیویارک میں 54 سالہ پاکستانی محمد بوٹا بھی ڈھول بجا کر مسلمانوں کو سحری کے لیے جگاتا تھا۔ محمد بوٹا لیموزین ڈرائیور تھا۔ سحری کے

وقت محمد بوٹا مسلمانوں کے اکثریتی علاقے میں آتا، اپنی کار سے ڈھول نکالتا اور گلیوں میں گھومتے ہوئے اسے زور زور سے بجاتا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس طریقے سے وہ نہ صرف اپنی قدیم روایت کو زندہ کر رہا ہے بلکہ مسلمانوں کو سحری کے لیے جگا کر ثواب بھی کماتا ہے۔ محمد بوٹا کے ڈھول بجانے سے گوروں کو پریشانی کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ اس سے ان کی نیند میں خلل پڑتا تھا۔ شام اور پاکستان سمیت کئی مسلم ممالک میں ڈھول بجا کر لوگوں کو سحری کے لیے جگانے کی قدیم رسم اب بھی جاری ہے۔

رمضان توپ (Ramadan Cannon)

آج کے جدید دور میں بھی دنیا کے کئی اسلامی ممالک میں توپ کا گولہ داغ کر افطار اور سحر کے اوقات کا اعلان کرنے کی قدیم روایت برقرار ہے۔

مصر

رمضان توپ کا آغاز مصر کے دارالحکومت قاہرہ سے ہوا۔ قاہرہ پہلا شہر تھا جہاں شہریوں کو افطار کا وقت بتانے کے لیے پہلی بار توپ کا گولہ داغا گیا۔ یہ 865 ہجری کا واقعہ ہے جب مملوک سلطان خوش قدم اپنی نئی توپ کا گولہ چلا کر اس کو چیک کرنا چاہتا تھا۔ ماہِ رمضان میں اتفاقی طور پر جب اس توپ کو شام کے وقت چلایا گیا تو اس کے گولے کی آواز پورے شہر میں سنی گئی اور لوگوں نے سمجھا کہ شاید افطاری کا وقت ہو گیا ہے۔ اگلے دن جب توپ کے گولے کی آواز سنائی نہ دی تو لوگوں کی ایک بڑی تعداد جمع ہو کر عثمانی محل میں آئی اور انھوں نے خلیفہ کی بیوی چہ فاطمہ سے مطالبہ کیا کہ توپ کا گولہ داغ کر افطار کا وقت بتایا جائے۔ اس سے ان کو افطار کے وقت کا پتا چلنے میں سہولت ہوتی ہے۔ فاطمہ نے اپنے خاوند خلیفہ خوش قدم سے اس بارے میں سفارش کی جو اس نے بخوشی قبول کر لی اور اعلان کیا کہ سحری اور افطاری کے وقت توپ سے گولہ داغا جائے تاکہ لوگوں کو پتا چلے کہ سحری یا افطاری کا وقت ہو گیا ہے۔ مصریوں نے خوش ہو کر سحری اور افطاری کے اوقات میں گولہ داغنے والی توپ کو ''چہ فاطمہ'' کا نام دے دیا جس نے اس روایت کا آغاز کیا۔ افطاری کا گولہ داغنے والی توپ کو ''افطار توپ'' بھی کہا جاتا ہے۔

سعودی عرب

مکہ مکرمہ میں بھی رمضان المبارک کا چاند نکلنے پر توپ کا گولہ داغا جاتا ہے۔ یہ توپ مکہ مکرمہ کے قریب سب سے اونچی پہاڑی پر نصب کی جاتی ہے اور سحر اور افطار کے وقت اس توپ سے گولہ داغا جاتا ہے۔ اس توپ کی حفاظت خصوصی سکیورٹی آفیسر کرتے ہیں۔ عید الفطر کا چاند نظر آنے پر اس توپ سے آخری گولہ داغا جاتا اور پھر اسے واپس سٹور میں بھیج دیا جاتا ہے۔ پورے رمضان میں اس توپ سے 150 گولے داغے جاتے ہیں۔

متحدہ عرب امارات

متحدہ عرب امارات کی ریاستوں شارجہ، دبئی، کویت اور راس الخیمہ میں توپ کا گولہ داغ کر سحری اور افطاری کے اوقات سے لوگوں کو آگاہ کرنے کی قدیمی روایت ابھی تک قائم ہے۔ متحدہ عرب امارات میں توپ کا گولہ داغ کر سحری اور افطاری کے اوقات بتانے کی ابتدا سلطان بن سقر کے دور (1803ء تا 1866ء) میں شارجہ سے شروع ہوئی۔ دبئی میں رمضان توپ خلیفہ شیخ سعید المکتوم کے دورِ حکومت (1912-1958ء) میں متعارف کرائی گئی۔

■■■

یہاں یہ سوال ہمیشہ سر اُٹھاتا ہے کہ فجر اور مغرب کب پڑھیں؟

قطب شمالی کے آخری شہر ترومسو میں رمضان

محمد ارشد فخر الدین۔ اوسلو

دھند سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں کے درمیان قطب شمالی کے لیے مہماتی سفر کی روانگی کے لیے آخری شہر ترومسو (Tromso) کی کل آباد 67000 نفوس پر مشتمل ہے۔ یہ شہر اپنے محل وقوع کے اعتبار سے شمال میں سب سے آخری یونیورسٹی، نباتاتی باغ، پروٹسٹنٹ چرچ اور سمفونی آرکسٹرا کے لیے مشہور ہے۔ ایک صدی قبل ناروے جینین ہیرو رونالڈ ایمنڈسن نے اسی شہر سے قطب جنوبی تک کے سفر کا آغاز کیا تھا۔

ترومسو سرکل سے 350 کلومیٹر دور اس شہر کی ایک خصوصیت اور بھی ہے کہ یہاں شمال کی سب سے آخری مسجد النور بھی واقع ہے۔ ترومسو میں شمالی افریقہ، مشرقی وسطیٰ اور پاکستان سے تعلق رکھنے والے تقریباً 1000 مسلمان قیام پذیر ہیں۔ ترومسو میں مسلمان مہاجرین 1968ء سے آنا شروع ہوئے تھے۔ آج بھی سیاسی پناہ گزینوں میں سومالیہ، اریٹیریا اور افغان مہاجرین اپنے بارے میں فیصلوں کے منتظر ہیں۔ جب آپ النور مسجد میں داخل ہوں گے تو استقبالیہ پر آپ کا سامنا مسکراتی ہوئی حکیمہ منبرور سے ہوگا۔ وہ اب بھی اپنے خیالوں میں مسکرانے لگتی ہے جب اسے پہلی مرتبہ ترومسو سے واسطہ پڑنا یاد آتا ہے۔ اس کی شادی مراکو میں مقیم ایک نارویجین مسلمان محمد سے ہوئی تھی۔ شادی کے بعد یورپ میں قیام کرنا اس کے لیے کسی سنہرے خواب سے کم نہ تھا۔

وہ کہتی ہے جب میں اپریل 1979ء میں ناروے آئی تو ڈھائی میٹر برف کی تہہ میری منتظر تھی۔ یہ تھا میرے خوابوں کے شہر میں میرا استقبال۔ حکیمہ کا اگلے چند مہینوں میں دوسری حیرتوں سے بھی واسطہ پڑنا تھا۔ مارچ سے ستمبر تک ترومسو کے دن رات کی طوالت یکساں رہتی ہے لیکن 20 مئی سے 22 جولائی تک سورج مسلسل آسمان پر چمکتا رہتا ہے اس لیے کہ ترومسو خورشید نیم شب (Midnight sun) کے علاقے میں واقع ہے۔ 25 نومبر سے 21 جنوری تک سورج اُفق سے بالکل غائب رہتا ہے یعنی یہاں مسلسل رات یوم بلا خورشید (Polar Nights) کا سماں رہتا ہے۔

مسجد النور میں یہ سوالات اپنے علاقے کی خصوصی جغرافیائی نوعیت کی وجہ سے ہمیشہ زیر بحث رہتے ہیں کہ جن مہینوں میں سورج طلوع اور غروب نہیں ہوتا، ان میں فجر اور مغرب کن اوقات میں پڑھی جائیں گی؟ اسی طرح ان مہینوں میں سحر اور افطار کا تعین کس طرح کیا جائے گا؟

Sandra شاندار مریم اور اندریو ابراہیم جو مسجد النور میں ڈائریکٹر اور سیکرٹری کے عہدے پر فائز ہیں، اُن کے لیے اکثر یہ سولات وجہ نزاع بنے رہتے ہیں۔ ان دونوں کی ذمہ داریوں میں نماز کے اوقات میں مسجد کھولنے کے علاوہ مقامی آبادی کو اسلام کے بارے میں معلومات فراہم کرنا، مختصر کتابوں کی بذریعہ ڈاک ترسیل، نکاح، طلاق اور اموات کے مواقع پر سہولتیں فراہم کرنا ہیں۔ ترومسو سے مزید شمال میں واقع دوسرے شہروں مثلاً کرکینس (Kirkenes) اور ہیمر فیسٹ (Hammer Fest) میں رہائشی مسلمانوں کو نماز اور رمضان کے اوقات مہیا کرنا بھی ان کی ذمہ داری ہے۔

جغرافیائی اعتبار سے منفرد صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے النور مسجد کی انتظامیہ نے سعودی عرب کے دارالافتاء سے مستقل فتویٰ حاصل کرلیا ہے۔ دارالافتاء سے انھیں تین ممکنہ حل موصول ہوئے ہیں۔ 1۔ سعودی عرب (مکۃ المکرمہ) کے اوقات پر عمل کریں۔ 2۔ نزدیک ترین مسلم آبادی جہاں سورج طلوع اور غروب ہو رہا ہو، کے مطابق عمل کریں مثلاً اوسلو یا گلاسکو، 3۔ پانچ اوقات نماز کا تعین کرکے نماز ادا کریں۔

2012ء میں رمضان کا آغاز 20 جولائی اور اختتام 19 اگست کو ہوا تھا۔ آغاز میں روزوں کا دورانیہ مکۃ المکرمہ کے مطابق فجر صبح 4 بج کر 24 منٹ سے افطار شام 7 بج کر 6 منٹ تک تھا لیکن 24 رمضان سے مقامی طور پر اوقات طلوع وغروب آفتاب کے مطابق فجر صبح ڈھائی بجے سے مغرب 10 بج کر 10 منٹ تک تھا۔ اس طرح آخری 7 روزوں کا دورانیہ 12 سے 20 گھنٹوں تک طویل تھا۔ اتنے طویل اوقات کے باوجود موسم کی خوشگواری اور سرد ہونے کی وجہ سے روزوں کی شدت محسوس نہیں ہوتی جتنی اپنے آبائی گرم ممالک میں ہوتی تھی۔ 2013ء میں رمضان ان دنوں میں ہوگا جب سورج مسلسل آسمان پر رہے گا، لہٰذا 2013ء میں مکہ المکرمہ کے مطابق اوقات مقرر کیے جائیں گے۔

رمضان کے دوران شام 9 بجے ہی سے خواتین و حضرات مسجد النور میں اپنے اپنے مخصوص حصوں میں جمع ہونا شروع ہوجاتے ہیں۔ چھوٹے بچوں کو ہمراہ لانے کی خصوصی ہدایت کی جاتی ہے تاکہ وہ بچپن ہی سے اپنے مذہبی تہواروں سے آشنا ہوسکیں۔

تمام رمضان میں افطار وسحر میں عورتوں کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اپنی باری کے مطابق کھانوں کا انتظام کریں۔ ان کھانوں میں مختلف ممالک کی نمائندگی کرتے ہوئے سومالی سموسہ، عراقی پلاؤ، فن لینڈ کا سلاد، مراکو کا سوجی اور گوشت کا بنا ہوا کھس کھس اور بین الاقوامی مشروبات موجود ہوتے ہیں۔ اس سوشل اجتماع میں مسلمان باہم گفتگو کے ذریعے اپنے معاشرتی مسائل کا حل بھی ڈھونڈھ لیتے ہیں۔

روزہ چاہے کسی بھی ٹائم ٹیبل کے مطابق ہو، افطار مسنون طریقے سے کھجور سے کیا جاتا ہے۔ کھجور اور دوسری حلال غذا ال آنیا انٹرنیشنل سے خریدے جاسکتے ہیں جو ترکش حسین اور سعودہ مل کر چلا رہے ہیں۔ سعودہ جب 2002ء میں شادی کرکے ترومسو پہنچی تو اسے یہ بات پسند نہیں آئی کہ اس کا شوہر حسین ایک ریستوران چلا رہا ہے جہاں شراب بھی مہیا کی جاتی ہے۔ چنانچہ سعودہ نے اپنے شوہر کو نہایت حکمت سے اس بات پر قائل کرلیا کہ وہ کیا غلطی کر رہا ہے؟ حسین کو بھی اپنی غلطی کا اندازہ ہوگیا تو اس نے ریستوران بند کرکے غذائی اسٹور کھول لیا جہاں مسلمانوں کو حلال گوشت کے علاوہ روایتی مسالے اور موسمی پھل مہیا کیے جاتے ہیں۔

■■■

کیا خود طے اور طاری کردہ مشکلیں سہنے سے اللہ زیادہ خوش ہوتا ہے؟

رمضان آرہا ہے

دوستوں پر بیتے کچھ ناقابل فراموش لمحات سے اُٹھتے سوالات

جو زندگی سے قریب لانے کے بجائے دوری کا باعث بننے والے تھے

نوید اسلام صدیقی

کل صبح جلیل صاحب تشریف لائے تھے۔ کچھ پریشان پریشان سے نظر آرہے تھے۔ میں نے کہا نصیب دشمناں خیریت تو ہے آپ کا چھوٹا بھائی جو ابوظہبی گیا تھا اُس کا کیا حال ہے۔

جلیل صاحب نے بتایا کہ خلیل مجھ سے بڑا ہے، خلیل مجھ سے زیادہ ذہین اور محنتی ہے۔ بچپن میں وہ اور میں قریبی مسجد میں قرآن پاک پڑھنے جاتے تھے، وہیں ہم دیکھتے تھے کہ کچھ بچے قرآن مجید حفظ کر رہے ہیں۔ خلیل اُن کی دیکھا دیکھی اپنا روز کا سبق حفظ کر لیتا، مولوی صاحب نے والد صاحب سے بات کی کہ آپ اِس بچے کو قرآن پاک حفظ کرائیں، وہ قرآن بھی حفظ کرتا رہا اور مسجد میں ہر وقت دینی مسائل سُن سُن کر اچھا خاصا دینی عالم بن گیا۔ بچپن سے ہی نماز روزہ کی سخت پابندی اس کا وتیرہ رہا۔ آپ کو معلوم ہی ہے میں بینک میں ملازمت کرتا ہوں، وہ میری اس ملازمت کے بھی خلاف ہے۔ اُس نے پولی ٹیکنیک کے ادارے سے کورس کیا تھا پھر وہ مختلف تجربات کرتا رہا، اب مارچ 2013ء میں کئی لاکھ روپے کا ویزہ خرید کر بطور ہیوی ڈیوٹی ٹرک ڈرائیور ابوظہبی چلا گیا۔ اپنے بچوں سے کہتا تھا کہ ایک اسلامی عربی ملک میں رہنا جنت میں رہنے سے کم نہیں۔

ابوظہبی پہنچ کر پہاڑوں کے درمیان ایک سیمنٹ فیکٹری میں سارا دن ایک ہیوی ڈیوٹی ٹرک چلاتا ہے۔ وہاں مارچ میں بھی شدید گرمی تھی۔ گرمی کے علاوہ گرد و غبار

کا ایک طوفان ہے جو ہر وقت چلتا رہتا ہے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد پانی گلے میں نہ ڈالیں تو وہ مٹی گلے تک پہنچ جاتی اور سانس بند ہونے لگتی ہے۔ اب پریشانی کی بات یہ بنی ہے کہ وہ تو 'اللہ لوک' ہے۔ رمضان سر پر کھڑا ہے، اُس نے کل رات فون پر بتایا ہے کہ یہاں روزہ رکھنا بہت مشکل ہے، قضا کرنے کا کوئی جواز نہیں بنتا۔ کہتا ہے کہ اب کروں تو کیا کروں۔ واپس بھی نہیں آسکتا کیونکہ جن لوگوں سے قرض لے کر گیا ہے وہ اُس کے واپس آتے ہی اُس کی جان کھانے لگیں گے۔ اب آپ بتائیں وہ کیا کرے، اس مسئلے کا کوئی شرعی حل ہے؟ میں نے کہا سوچتے ہیں، کسی عالم دین سے پوچھ کر بتاتے ہیں لیکن ابھی تو خود میرا سر چکرا رہا ہے۔

☆☆☆

کل اُن کے جانے کے بعد محمود صاحب یاد آگئے۔ آپ فنا فی اللہ آدمی تھے۔ میں جب مسقط آرمی میں تھا وہ وہاں بطور واٹر انجینئر نوکری کر رہے تھے۔ 1976ء تھا، رمضان کا مہینا، ہم صلالہ میں تھے جہاں گرمی کوئی خاص نہیں پڑتی اس لیے روزے ٹھیک ٹھاک گزر رہے تھے۔ ایک دن محمود صاحب افطاری سے ذرا قبل تشریف لے آئے، کہنے لگے آپ کو کیا بتاؤں پچھلے جمعہ کو کیا ہوا ہے، بس مرتے مرتے بچا ہوں۔ ہوا اس طرح کہ میرے ڈائریکٹر نے جمعرات کو مجھے اپنے دفتر میں بلایا اور کہا کہ کل آپ نے صحرا میں جو ٹیوب ویل نمبر 13 لگ رہا ہے، اُسے چیک کرنے جانا ہے۔ میرے منہ سے بے اختیار نکلا کہ کل تو جمعہ ہے، ڈائریکٹر جو کہ ایک عربی تھا، اُس نے کہا کہ آپ پاکستانی لوگوں نے مذہب کو ایک ابنارمل چیز بنا دیا ہے۔ یاد رکھو اسلام ایک نارمل مذہب ہے، اسلام انسان سے کوئی ابنارمل مطالبہ نہیں کرتا۔ سیدھی سی بات ہے جمعہ کی نماز آپ پر صرف اِس صورت میں فرض ہے کہ آپ کسی قصبہ یا شہر میں ہوں، اگر آپ آبادی سے دور ہیں تو آپ نے عام ظہر کی نماز ادا کرنی ہے۔ میں یہ بات کر ہی نہ سکا کہ یہ رمضان کا مہینا ہے اور یہ رمضان کا پہلا جمعہ ہے۔'' بہرحال میں سحری کھا کر اپنی جیپ لے کر ٹیوب ویل نمبر 3 کا معائنہ کرنے روانہ ہوگیا۔ مسقط کی حکومت صحرا میں 12 ہزار فٹ کی گہرائی سے پانی نکالنے کا تجربہ کر رہی تھی۔ میں ایک طویل سفر کر کے ٹیوب ویل پر پہنچا۔ وہاں کچھ دیر رہا، رپورٹ تیار کی، واپسی کا قصد کیا، چلتے چلتے مقامی لوگوں سے میں نے پوچھا کہ یہاں سے صلالہ جانے کے لیے کوئی شارٹ کٹ راستہ ہے کیونکہ جس رستے سے میں آیا ہوں یہ بہت طویل اور تھکا دینے والا ہے۔ ایک آدمی نے مجھے شارٹ کٹ راستہ بتایا۔ اُس نے چند علامات بتائیں، اُس نے کہا کہ ان سے ذرا سا اِدھر اُدھر ہوئے تو آپ بھٹک جائیں گے۔

ہوا آخر یہی کہ میں بھٹک گیا، مجھے سخت پیاس لگ رہی تھی لیکن میرا روزہ تھا، پینے کا پانی بھی ویسے میرے پاس نہیں تھا، گاڑی کے انجن میں ڈالنے کے لیے گاڑی میں پانی کا ایک کین پڑا ہوا تھا، جو میں پینے پر آمادہ نہ تھا۔ نوبت یہاں تک آگئی کہ سانس رکنے لگا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا اور موت دونوں ناچنے لگے۔'' انھوں نے پوری تفصیل بیان کی جس کا نچوڑ یہ تھا کہ سفر میں جب اجازت ہے کہ آپ روزہ نہ رکھیں تو بلاوجہ اپنے آپ کو آزمائش میں کیوں ڈالتے ہیں۔

شب گزشتہ لیٹے لیٹے مجھے تجمل صاحب کے بیٹے کی یاد آگئی، تجمل صاحب کالج میں میرے ساتھ پڑھتے

رہے۔ بی کام کرنے کے بعد آپ انگلینڈ چلے گئے تھے، پھر وہ وہیں کے ہوگئے، وہ پچھلے سال پاکستان آئے تھے تو رمضان تھا، وہ پاکستان میں ہی عید منانا چاہتے تھے، اُنھوں نے بتایا تھا کہ ان کا بڑا بیٹا اشتیاق بہت لائق نکلا ہے وہ برما شیل کمپنی میں پیٹرولیم انجینئر ہے۔ برطانیہ کے شمال میں ساحل سے دور سمندر میں رگ لگی ہوئی ہے، وہاں سے پیٹرول نکلتا ہے۔ وہاں کی آب وہوا ایسی ہے کہ ہر ایک گھنٹہ بعد ایک دوائی نما شربت پینا پڑتا ہے، ورنہ چھاتی پر بوجھ محسوس ہونے لگتا ہے۔ ہر 2 ہفتے بعد دو ہفتے کی چھٹی بھی دی جاتی ہے۔ اب حساب کچھ ایسا بنا کہ پہلے پندرہ روزے اُس نے وہاں سمندر میں گزارنے تھے۔ اُس نے سوچا کہ میں ہر گھنٹے بعد وہ شربت نہ لوں گا لیکن انتظامیہ نے اسے اجازت نہ دی۔ رگ پر موجود ڈاکٹر نے کہا کہ یہاں آپ اپنی مرضی نہیں چلا سکتے۔ وہ تو نوکری چھوڑنے پر تیار ہوگیا تھا میں نے اُسے بڑی مشکل سے روکا۔ چند دن قبل اُس کا فون آیا تھا اُس نے بتایا تھا کہ اُس نے وہاں سے اپنی ٹرانسفر کروالی ہے۔ اِس سال اِن شاء اللہ وہ پورے روزے رکھے گا۔

شبیر صاحب میرے عزیز ہیں اور آج کل اپنے گاؤں میں ہوتے ہیں۔ چند سال قبل آپ ملازمت کرنے سعودی عرب گئے تھے۔ جس کمپنی میں ملازمت کرنی تھی وہ امریکن کمپنی صحرا میں ہائی ٹرانسمیشن لائن لگا رہی تھی۔ پہلے مرحلے میں بلند و بالا کھمبے لگائے جارہے تھے، کھمبوں کی لائن کے ساتھ ملازمین کا قافلہ چلتا تھا، ٹریلرز پر ملازمین کے کیبن رکھے ہوئے تھے۔ دفاتر بھی اسی طرح کے کیبن میں بنے ہوئے تھے۔ اسی دوران رمضان شروع ہوگیا۔ امریکن انجینئر کھمبے کے پاس زمین پر کھڑا ہوتا، کھمبے پر چڑھے ہوئے ورکرز کو نیچے سے ہدایات دیتا، ہر کھمبے کا ایک فارم مکمل ہوتا جس میں پوری تفصیل لکھی جاتی۔ امریکن نے کہا کہ آپ کا روزہ ہے آپ کیبن ہی میں بیٹھنا میں آپ کو موبائل سے نوٹ کرنے کے لیے معلومات دیتا رہوں گا۔ شبیر صاحب کچھ دیر تو اندر بیٹھے پھر اُن کو شرم آئی یا یہ خیال آیا کہ یہ اچھا نہیں لگتا کہ گورا باہر گرمی میں کھڑا ہو اور میں یہاں ایئر کنڈیشنڈ کیبن میں بیٹھا رہوں۔ حضرت اُس گورے کے پاس پہنچ گئے۔ ایک گھنٹہ نہ گزرا ہوگا کہ آپ بے ہوش ہوکر نیچے گر گئے۔ ہیلی کاپٹر کے ذریعے ہسپتال پہنچایا گیا۔ معلوم ہوا کہ ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ کچھ دن ہسپتال میں رکھا گیا پھر واجبات کے ساتھ اُن کو ملازمت سے فارغ کر دیا گیا۔

آج صبح سے پروفیسر عبدالحمید صاحب یاد آرہے ہیں۔ ہمارے محلے میں ہی رہتے تھے، شوگر اور بلڈ پریشر کا شکار ہو چکے تھے، عمر بھی اتنی زیادہ نہیں تھی، روزے ہر سال باقاعدگی سے رکھتے تھے۔ ڈاکٹروں نے کئی مرتبہ اُن کو سمجھایا کہ اچانک صورتِ حال بگڑ سکتی ہے اس لیے آپ روزے نہ رکھا کریں۔ مریضوں کے لیے تو باقاعدہ شریعت نے گنجائش رکھی ہے۔ کہنے لگے ایک تو میں یہ پسند نہیں کرتا کہ اپنے آپ کو مریضوں میں شامل کروں کیونکہ جب آپ اپنے آپ کو مریض سمجھیں گے تو آپ واقعی مریض بن جائیں گے۔ میں نے اُن سے ایک مرتبہ سوال کیا کہ آپ کی نظر میں شوگر یا بلڈ پریشر بیماریاں ہیں بھی یا نہیں۔ اُنھوں نے کہا کہ آپ مجھ کو اُلٹے پلٹے سوال پوچھ کر چکر دینا چاہتے ہیں لیکن میں آپ کے چکر میں نہیں آنے والا۔ پھر یہ بھی دلچسپ بات کی کہ اگر میں روزہ نہ بھی رکھوں تو بھی مجھ

کو دوسروں کے سامنے کھاتے پیتے شرم آئے گی کیونکہ دیکھنے میں تو بالکل ٹھیک ٹھاک لگتا ہوں لیکن پچھلے سال حضرت کو شوگر اور بلڈ پریشر نے مل کر چکر میں ڈال دیا۔ اُن کے بیٹے نے بتایا کہ رات کو اباجی نے 20 تراویح باجماعت پڑھیں، پھر رات گیارہ ساڑھے گیارہ بجے تک گپ شپ کرتے رہے، پھر اپنے کمرے میں جاکر لیٹ گئے۔ اچانک میں نے اُن کی عجیب سی آواز سنی۔ دوڑتا ہوا اُن کے پاس گیا تو منہ سے کچھ عجیب سی آوازیں نکل رہی تھیں اور وہ بار بار دائیں بازو کی طرف اشارہ کررہے تھے۔ ہم بازو مل رہے تھے۔ چھوٹے بھائی نے گاڑی اسٹارٹ کی اور نزدیکی ہسپتال لے گئے۔ اُنھوں نے انجکشن وغیرہ لگائے۔ ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ فالج کا اٹیک ہوا تھا لیکن بچت ہوگئی ہے۔ 6 ماہ ہوگئے ہیں ابھی تک اُس بازو میں پوری طرح جان نہیں ہے۔ بائیں ہاتھ سے کوئی چیز اٹھا نہیں سکتے۔ کافی عرصے سے ملاقات نہیں ہوئی وہ ہمارا محلہ چھوڑ کر ایک دوسری کالونی میں چلے گئے ہیں۔

یہاں تک مضمون لکھا تھا کہ رفیق صاحب تشریف لے آئے۔ اُنھوں نے پوچھ لیا کہ کیا لکھا جارہا ہے میں نے ان کو پڑھنے کے لیے اپنا مضمون دے دیا۔ کہنے لگے واقعی ایک بہت اہم حقیقت کی طرف آپ نے اس مضمون میں اشارہ کیا ہے۔ اب آپ دیکھیں کہ نماز جس کو مسلم اور کافر کے درمیان فرق بتایا گیا ہے، اُس کے بارے میں اسلامی احکامات کتنے زبردست ہیں، نماز پڑھنے کی کیا صورت ہو، یہ آپ کی صحت اور ہمت پر منحصر ہے۔ آپ کھڑے ہوکر، کرسی پر بیٹھ کر، بستر پر لیٹ کر، وضو کرکے، بغیر وضو تیمم کرکے، پڑھ سکتے ہیں بلکہ یہاں تک اجازت دی گئی کہ آپ اشاروں سے بھی نماز ادا کرسکتے ہیں۔

> اب ہمارے ہاں صورتِ حال یہ ہے کہ ایک تو وہ لوگ ہیں جو روزہ رکھتے ہی نہیں ہیں اور دوسری طرف وہ ہیں جو روزہ کو اپنے لیے ایک مسئلہ بنا لیتے ہیں۔ نماز کی طرح روزہ کے سلسلے میں بھی اسلام نے بہت سہولتیں دی ہوئی ہیں۔ آپ سفر میں روزہ قضا کر سکتے ہیں۔ رکھنا چاہیں تو رکھ بھی سکتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ صورت نہ ہو کہ نماز و روزہ و قربانی و حج، یہ سب باقی ہیں تُو باقی نہیں ہے۔ ہمارے ہاں فقہی مسائل ہیں۔ ان مسائل نے اسلام کو بہت مشکل بنا دیا ہے۔ اللہ کے نزدیک جانے اور اس کی قربت پانے کے بجائے اکثر ڈاکٹروں کی قربت کے لیے دوڑنا پڑتا ہے۔

وہ بولے: حضرت اِس موضوع پر زیادہ بات نہیں کرنا چاہیے، میں نے کہا کہ بات کیسے نہ کریں، ایڈیٹر صاحب نے تو خاص فرمائش کی ہے کہ رمضان کے حوالے سے فرائض ثواب تو سبھی جانتے ہیں۔ کچھ وہ لکھیں جس پر بات نہیں کی جاتی اور پھر تنگی سہنی پڑتی ہے۔ وہ بولے کہ بس اللہ سے دعا کرتے رہا کریں کہ روزے کے دوران ہی خاتمہ بالایمان ہو جائے۔ میں نے اُن کی بات سن لی۔ دل کڑا کر کے آمین بھی کہہ دیا مگر خدا جانے کیوں..... ایک مرتبہ تو لرز ہی گیا ہوں۔

■■■

دُنیائے فلم کے عظیم داستان گو

جیمز کیمرون

کی ناقابلِ یقین داستان

اُسے ناکامیوں نے بہت غوطے دیے

ہر بار اپنا بنایا ہوا ریکارڈ خود ہی توڑنا کب آسان ہوتا ہے

فیصل وڑائچ

وہ ایک داستان گو ہے۔ وہ ایک گہرے سمندر کی فرش تک کھوجنے والا غوطہ خور اور وہ ایک موجد ہے۔ وہ ہالی وڈ کا فلم ساز، مصنّف اور پروڈیوسر جیمز ہے۔ جیمز کیمرون کی گھٹی میں تجسّس رچا ہوا ہے۔ اسے سمندر کی تہہ میں جانے کا اتنا شوق تھا کہ اس نے دنیا کے سب سے گہرے سمندروں کی تہہ تک جانے کی درجن بھر کامیاب کوششیں کیں۔ 2012ء میں جیمز کیمرون نے ایک ورلڈ ریکارڈ بنا ڈالا۔ وہ ایک ڈاکومنٹری فلم بنانے کے لیے دنیا کے سب سے گہرے سمندر کی سب سے گہری کھائی کی تہہ میں تن تنہا اُتر گیا۔ یہ جگہ چین کی مشرقی سمت میں بحرالکاہل میں جاپان اور انڈونیشیا کے درمیان ہے۔ اسے ماریانا ٹرینچ کہتے ہیں۔ سطحِ سمندر سے اس کی گہرائی 11 کلومیٹر ہے۔ اس گہرائی تک اس سے پہلے کبھی کوئی انسان نہیں پہنچا تھا۔ جیمز نے یہاں تک پہنچنے کے لیے خصوصی طور پر ایک سب میرین تیار کروائی جسے ڈیپ سی چیلنجر کا نام دیا گیا۔ اس 7 میٹر لمبی مشین کو صرف ایک ہی پائلٹ چلا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ مشین میں کسی اور کے بیٹھنے کی گنجائش ہرگز نہیں تھی۔ اس لیے جیمز کیمرون کو تن تنہا اس میں بیٹھ کر 11 میل سمندر کے نیچے جانا پڑا اور یوں وہ اس دوران ایک ہی وقت میں پائلٹ، غوطہ خور، کیمرا مین، ڈائریکٹر، انجینئر اور محقق تھا۔ آج بھی جیمز کیمرون کے بعد اس جگہ صرف دو اور آدمی پہنچ پائے ہیں۔

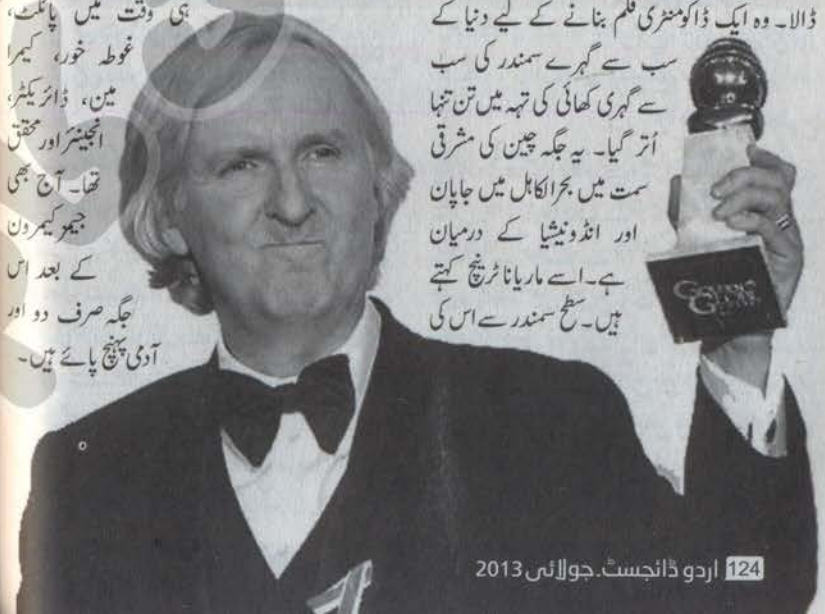

سائنسدان ڈرائیور بن گیا

جیمز کیمرون کینیڈا کے صوبے اونٹاریو میں رہنے والی ایک نرس کا بیٹا تھا۔ یہ 1973ء کی بات ہے جب وہ فزکس کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے امریکی ریاست کیلی فورنیا آیا۔ سائنس اس کا پسندیدہ مشغلہ اور مضمون تھا اور وہ فزکس میں ہی اپنا مستقبل بنانا چاہتا تھا۔ اس نے گریجوایشن کر لی لیکن اسے کوئی نوکری دینے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے ایک ٹرک ڈرائیور کی حیثیت سے ایک چھوٹی سی نوکری کر لی لیکن نوکری میں بھی اسے نالائق ہی گردانا جاتا رہا کیونکہ وہ اچھا ڈرائیور نہیں تھا۔ اس نے شادی کر لی لیکن بیوی سے اس کی بنتی نہیں تھی۔ وہ ڈرائیوری اور خانگی معاملات سے وقت بچاتا تو کچھ لکھنا شروع کر دیتا لیکن اس کے لکھے کو کوئی چھاپتا نہیں تھا۔ اسے فلمیں دیکھنے اور ان میں استعمال ہونے والی تکنیکوں کو سمجھنے کا بہت شوق تھا۔ یہی شوق اسے امریکا کی عظیم الشان کانگریس لائبریری لے جاتا جہاں ٹی وی اور فلموں میں خاص بصری تکنیکوں پر نت نئی تحقیقات پڑھتا رہتا۔ بس یہی اس کا شوق تھا اور عمر کی 23 بہاریں گزارنے کے بعد وہ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں سوچ رہا تھا لیکن پھر ایک جادو ہو گیا۔

اسے سٹار وار ہو گئی

ایک دن اس نے ہالی وڈ کے شاندار ہدایت کار جارج لوکاس کی فلم سٹار وار دیکھ لی۔ اسے یوں لگا جیسے اسے منزل کا نشان مل گیا ہو۔ اس دن اس نے ٹرک ڈرائیوری چھوڑ دی اور طے کر لیا کہ میں بھی ایسی ہی فلمیں بناؤں گا جن میں سائنسی انداز سے سکرین پر محیرالعقول چیزیں دکھائی جاتی ہیں۔ اس نے ایسی فلمیں بنانے کا فیصلہ کیا جن میں انسانی نفسیات کو لبھانے والی دیومالائی چیزیں یوں دکھائی جائیں جیسے وہ اصل میں وقوع پذیر ہو رہی ہوں۔ جس طرح ہر بڑا کام ایک چھوٹی سی سوچ سے شروع ہوتا ہے بس ایسی ہی ایک چھوٹی سی سوچ نے جیمز کے ذہن میں جنم لے کر شرارتیں شروع کر دیں۔

شٹ اپ جمیز

لیکن چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ دو چار ہدایت کاروں کے ساتھ کام کرنے کے بعد جیمز نے سمجھا واہ بھئی اب میں بھی ڈائریکٹر بن گیا ہوں۔ اس نے 'زینو جینسس' نام کی ایک فلم لکھ ڈالی۔ چند دوستوں کی مدد سے پیسے اکٹھے کیے، ایک کیمرا کرائے پر لیا اور فلم بنانے میں جت گیا لیکن بجٹ اتنا کم تھا کہ فلم چھوٹی کرتے کرتے 10 منٹ کی رہ گئی۔ جیمز کیمرون نے پھر بھی ہمت کی اور اسی کی شوٹنگ کا آغاز کر دیا لیکن یہ کیا؟ جس کیمرے کو وہ ایک دن کے لیے کرائے پر لائے تھے وہ انھیں چلانا ہی نہ آیا۔ چلانے کی کوشش میں کیمرا کھل گیا اور اب اسے بند کرنا ایک دشوار ترین کام تھا۔ اس رات کام کرنے کے بجائے کیمرون اور اس کے دوست کیمرا جوڑنے میں جتے رہے اور ساتھ میں پریشان بھی رہے کہ یہ کھلا ہے یا ٹوٹ گیا ہے۔ بہرحال صبح تک کیمرا ٹھیک کیا اور چند شارٹس بھی لیے لیکن سکرین پر یہ اتنے بھدے اور بدمزہ لگے کہ جن دوستوں کے سامنے کیمرون نے خود کو بہت بڑے فلم ڈائریکٹر کی حیثیت سے پیش کیا تھا اس کا مذاق اڑاتے ہوئے چلے گئے۔

دو دن تک ایک کلوزاپ نہ لے سکا

ناکامیوں سے دوچار جیمز کیمرون نے اب کم بجٹ کی فلموں میں بطور مددگار کچھ پروڈیوسروں اور

ہدایتکاروں کے ساتھ کام شروع کر دیا۔ وہ چند پیسوں کے عوض کہیں معاون ڈریس ڈیزائنر اور کہیں معاون ہدایت کار بن جاتا لیکن زیادہ تر اسے معاون اسپیشل ایفکٹس کا کام ملتا۔ اسی دوران ایک تھوڑے بجٹ کی اطالوی فلم 'پیرانا' کے دوسرے حصے پر معاون ہدایت کار کا کام مل گیا لیکن فلم بنانے کے دوران میں اصل ہدایت کار اور پروڈیوسر کے جھگڑے کے باعث ہدایتکار فلم چھوڑ کر چلتا بنا۔ مجبوراً پروڈیوسر 'اوائیڈو' نے فلم کی ہدایت کاری جیمز کے حوالے کر دی۔ جیمز نے جی جان سے فلم کو اچھا بنانے کی کوشش کی۔ یہ ایک ہارر فلم تھی۔ فلم کے دوران ہی پروڈیوسر نے جیمز پر عدم اعتماد کا اظہار کر دیا۔ پروڈیوسر اسے ایک فنکار کا کلوزاپ لینے کو کہہ رہا تھا لیکن جیمز باوجود کوشش کے اس کا قریب سے شاٹ نہیں بنا پایا۔ اسی کوشش میں سارا دن ضائع ہو گیا۔ اگلا دن بھی ضائع ہو گیا۔ پروڈیوسر نے جیمز کو دھکے دے کر سیٹ سے نکال دیا لیکن کچھ دیر بعد پھر بلا لیا اور بطور معاون ساتھ رکھا لیکن یہاں پھر مسئلہ ہو گیا اور وہ یہ کہ کیمرون فوڈ پوائزننگ کا شکار ہو گیا۔ اب کیمرون کوئی کام نہیں کر سکتا تھا یعنی معاونت کی مزدوری بھی گئی۔ یہ بدترین وقت تھا اس سے زیادہ ناکامی ہو نہیں سکتی تھی اور اس وقت جیمز زندگی کی 28 بہاریں دیکھ چکا تھا۔

ڈراؤنا خواب

اسی دوران میں جب وہ شدید بیمار اور پیٹ درد کا شکار تھا اس نے ایک ڈراؤنا خواب دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ ایک لوہے کا انسان اس کے اوپر چڑھ دوڑا ہے۔ شاید یہ مسلسل ناکامی اور پروڈیوسر کا خوف تھا جو ایک خواب کی صورت میں اس کے تخیل میں جلوہ گر ہوا لیکن اُمید پرست جیمز کو یہی ڈراؤنا خواب آسمان کی بلندیوں پر لے گیا۔ جیمز نے اسی لوہے کے انسان کو اپنی اگلی فلم کا موضوع بنانے کا فیصلہ کر لیا۔

اور وہ ایک ڈالر میں بک گیا

جیمز نے خواب میں دیکھا کہ ایک لوہے کا انسان اسے مارنے کے لیے آرہا ہے۔ اسی موضوع پر اس نے ایک فلم لکھ ڈالی۔ فلم میں مستقبل سے لوہے سے ڈھلا انسان زمین پر آن وارد ہوتا اور اودھم مچا دیتا ہے۔ اس وقت تک ایسی چیزیں کسی نے نہیں دیکھی تھیں۔ اسے کیسے بنانا ہے، یہ بھی جیمز نے پلان کر لیا لیکن بجٹ پلان نہ کر سکا کیونکہ اس کے لیے بہت زیادہ رقم چاہیے تھی جو ظاہر ہے جیمز کے پاس بالکل نہیں تھی۔ اس کے لیے اس نے مختلف پروڈکشن کمپنیوں سے رابطہ کیا۔ سب کمپنیوں نے فلم کی کہانی کو پسند کیا اور اس کو خریدنے کی خواہش کا اظہار بھی کیا لیکن وہ جیمز کے ماضی کو دیکھتے ہوئے اسے بطور ہدایت کار لینے کو تیار نہیں تھے اور جیمز کیمرون اپنی کہانی کو خود ہی ڈائریکٹ کرنا چاہتا تھا۔ ایسے میں اُسے یاد آیا کہ ناکامیوں کے دور کی ایک دوست گیل ہرڈ بہت امیر ہو چکی ہے اور اس نے بھی ایک فلم پروڈکشن کمپنی بنائی ہے کیوں نہ اس کے پاس قسمت آزمائی جائے۔

جیمز قسمت آزمانے اس کے پاس پہنچ گیا۔ دوست نے دوستی کی لاج تو رکھی اور جیمز کی کہانی پر فلم بنانے کے لیے رقم لگانے کا اعلان کیا۔ اسے ہدایت کار لینے کا بھی اقرار کیا لیکن کہانی اور ہدایت کاری کے عوض اسے ایک پھوٹی کوڑی دینے سے صاف انکار کیا۔ صرف کاغذی کارروائی کے لیے اس کے معاوضے کے خانے میں ایک ڈالر لکھ دیا گیا۔ جیمز ہر کامیاب انسان کی

2 ارب 29 کروڑ ڈالر کمانے والی ٹائی ٹینک

جیمز کیمرون کو سمندر کی اتھاہ کھوجنے کا بچپنے کی حد تک شوق تھا۔ اس کا یہی شوق اسے ٹائی ٹینک بنانے کی طرف لے کر گیا کیونکہ ٹائی ٹینک کو تلاش کرنے اور اسے دیکھنے کے لیے جیمز کو کئی بار اس جگہ سمندر کی تہہ میں جانا پڑا جہاں اس عظیم الشان جہاز کا ملبا زنگ آلود ہو رہا ہے۔ اسی ملبے کو دیکھ کر جیمز نے ایک کہانی تلاش کی اور پھر ایک ایسی فلم بنا دی جس نے انسانی تاریخ میں کہی جانے والی تمام کہانیوں سے زیادہ پیسے بٹورنے والی کہانی کا اعزاز حاصل کیا اور پھر چند سال بعد اس اعزاز کو خود جیمز کیمرون نے ہی ''اوتار'' بنا کر توڑ دیا۔ ٹائی ٹینک نے 2 ارب 29 کروڑ ڈالر کمائے تھے جبکہ اوتار نے 2 ارب 78 کروڑ ڈالر۔ یہ رقم کتنی ہوتی ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ اگر ایک نوجوان 20 سال کی عمر میں روزانہ اڑھائی کروڑ روپے خرچ کرنا شروع کرے تو 80 سال کی عمر تک پہنچ کر بھی اس کے پاس چند کروڑ روپے باقی ہوں گے۔

طرح اپنی ناکامی کے دنوں میں بھی جانتا تھا کہ اسے ایک دن کامیاب ہونا ہے لہٰذا وہ مان گیا اور کام شروع کر دیا۔ اور یہ فلم تھی ٹرمینیٹر ون۔

فلم کی پروڈکشن کے بعد جب سینما گھروں میں تقسیم کرنے والی کمپنیوں سے رابطہ کیا گیا تو سب نے کہا کہ یہ ایک ہفتے سے زیادہ نہیں چلے گی۔ اس لیے اسے کم قیمت میں خریدا گیا لیکن فلم جیسے ہی سینما گھروں میں چلنا شروع ہوئی تو ایک تہلکہ مچ گیا۔ وہ فلم جسے بنانے میں ہر طرح سے بچت کرتے ہوئے صرف 64 لاکھ ڈالر میں تیار کیا گیا تھا اس فلم نے 8 کروڑ ڈالر کما لیے۔ فلم ڈسٹری بیوشن کمپنی، پروڈیوسر اور فلم کی کاسٹ جیمز کیمرون کی دیوانی ہو گئی۔ فلم کی پروڈیوسر جس نے جیمز کی شاندار کہانی اور ہدایت کاری کے بدلے اسے پھوٹی کوڑی دینے سے انکار کر دیا تھا اس کی بیوی بننے کو تیار ہو گئی۔ اس نے جیمز سے شادی کر لی اور اپنے شوہر کے قدموں میں اپنی ساری دولت رکھ دی۔ بس اب کیا تھا جیمز نے ایک کے بعد ایک سپر ہٹ فلم بنانا شروع کر دی۔

پھر سمندر کی تہہ میں

جیمز کو سمندر کی تہہ بہت متاثر کرتی تھی۔ وہ اسے دیکھنا چاہتا تھا۔ یہی شوق اسے ٹائی ٹینک پر فلم بنانے کی طرف لے گیا۔ اس نے ایک جاندار کہانی لکھی اور پھر سمندر میں کود گیا۔ اس نے بحراوقیانوس میں ڈوبے جہاز کو خود کئی بار دیکھا اور اسی دوران سمندر کی تہہ میں بیٹھ کر فلم کے بیشتر مکالمے بھی لکھے۔ سب تیاری مکمل کر کے جب کیمرون صاحب بجٹ کا حساب لگانے لگے تو پتا چلا کہ اس فلم کے لیے تو 20 کروڑ ڈالر سے زیادہ رقم چاہیے لیکن اب جیمز کیمرون کو ہر کوئی ایک کامیاب ہدایت کار مانتا تھا، اس لیے بہت سے پروڈیوسر اور فلم اسٹوڈیو بجٹ لگانے پر تیار تھے لیکن ایک چھوٹا سا مسئلہ ضرور تھا اور وہ یہ تھا کہ فلم صرف مہنگی نہیں تھی بلکہ بہت

بہت مہنگی تھی۔ اتنی مہنگی کہ آج تک کبھی کسی نے اس بجٹ کی فلم بنانے کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ یہ 1997 کی بات ہے۔ جیمز کے دلائل دینے پر پروڈیوسر نے جوا کھیل دیا۔ ٹائی ٹینک جب سینما گھروں میں چلی تو اس کی کامیابی نے ہالی وڈ میں فلم سازی کا انداز ہی بدل دیا کیونکہ اس فلم نے ہالی وڈ کو اتنا منافع دیا جس کا کبھی اس نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ یہ فلم آج کی تاریخ تک 2 ارب 29 کروڑ ڈالر سے زیادہ منافع کما چکی ہے جبکہ اس کی ڈی وی ڈی اور سینما فروخت اب بھی جاری ہے۔

دس سال کی خاموشی

جیمز کیمرون نے اس بے مثال کامیابی کے بعد 10 سال تک سینما سکرین کا رُخ نہیں کیا بلکہ بچوں کے لیے ٹی وی پر سائنس فکشن سیریز بناتا رہا لیکن اس دوران اس کے دماغ میں ایک اور ہی دنیا کی کہانی سمائی ہوئی تھی۔ گو کہ یہ کہانی وہ 1994ء میں لکھ چکا تھا۔ وہ ایک ایسی فلم بنانا چاہتا تھا جس میں کسی دوسری دنیا کی مخلوق دکھائے جسے انسانوں سے خطرہ لاحق ہے لیکن جیسے مناظر فلمانے کا وہ تصور کر بیٹھا تھا اکیسویں صدی کے آغاز تک ایسی کوئی ٹیکنالوجی ایجاد نہیں ہوئی تھی جو انھیں بنا سکے۔ یہاں اس کی فزکس کی صلاحیتیں کام آئیں۔ اس نے ایک ایسا کیمرا ڈیزائن کیا جو ہمہ جہتی ویڈیو بنا سکتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے جدید تھری ڈی ٹیکنالوجی متعارف کروائی جسے دیکھا جا سکتا ہے فی الحال لفظوں میں سمجھانا تھوڑا مشکل ہے۔ بس یوں سمجھیں کہ فلم سکرین محض سکرین نہیں رہتی بلکہ آپ خود کو فلم کے سیٹ کے اندر بیٹھا محسوس کرتے ہیں جیسے سب کچھ آپ کے اردگرد ہو رہا ہو۔

اوتار

اس تمام جدت کے ساتھ جیمز نے اوتار بنانے کا منصوبہ مکمل کر لیا۔ اس کا 12 سالہ انتظار ختم ہوا اور 2009 میں اسی کہانی پر اوتار فلم بنا ڈالی۔ گو کہ یہ فلم بھی بہت مہنگی بنی اور اس پر 30 کروڑ ڈالر خرچ اٹھا لیکن اس فلم نے ٹائی ٹینک کا ریکارڈ بھی توڑ ڈالا۔ یہ فلم دنیا

کی تاریخ میں آج تک کہی جانے والی، پڑھی جانے والی اور دیکھی جانے والی کہانیوں میں سب سے زیادہ کمائو پوت کہانی ثابت ہوئی۔ اس نے 2 ارب 78 کروڑ ڈالر سے بھی زیادہ منافع کمایا اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔

سخت گیر لیڈر

جیمز کے ساتھیوں کو اس سے ہمیشہ شکایت رہی۔ اس کی یادگار فلم ٹائی ٹینک میں کام کرنے والی مرکزی اداکارہ کیٹ ونسلیٹ نے فلم کے بعد بیان دیا کہ وہ زندگی میں کبھی دوبارہ جیمز کے ساتھ کوئی فلم سائن نہیں کرے گی لیکن جیمز کہتا ہے کہ وہ جب تک مطمئن نہیں ہوگا، سیٹ نہیں چھوڑے گا، خواہ اُس کی یا کسی اور کی جان چلی جائے۔

■■■

اردو کا 2006ء میں بند ہونے والا دبستان۔۔۔زندہ ہے

لاہور شہر کی خوبیوں اور خوبصورتیوں میں شامل دو ڈیروں میں سے ایک ان کا تھا

قاسمی صاحب کی کھڑاویں

ان کی بیٹھی بیٹھی گھمبیر آواز کی مٹھاس آخر تک قائم رہی

ان کی کمال خوبی یہ تھی کی نئے لکھنے والے کو ظرف اور شفقت کے ساتھ اپنا لیتے

ڈاکٹر انور سدید کی تحریر سے وہ مسرور ہوئے

اختر عباس

شہر لاہور کی خوبیوں اور خوب صورتیوں میں اردو کے دو بڑے ادیبوں کے دو ڈیرے بھی شامل رہے ہیں۔ ایک داستان سرائے ماڈل ٹاؤن میں جناب اشفاق احمد کا گھر اور دوسرا کلب روڈ پر مجلس ترقی ادب میں جناب احمد ندیم قاسمی کا دفتر۔ اشفاق صاحب کے ہاں ان کی کتابوں، سوچ اور ذات سے محبت کرنے والوں کا اکٹھ ہوتا، ادبی، علمی اور روحانی مسائل پہ محفل جمتی اور آنے والے عقیدت اور محبت کی سرشاری لیکر لوٹتے۔ اس عہد کے بڑے ادیب اور شاعر وہاں جمنے والی محفلوں، کھانوں، مکالموں میں موجود ہوتے۔ اکثر ان کو ان کی گفتگو کے ترازو میں تولتے، ان کا ادبی کام اور قد کاٹھ کہیں پیچھے

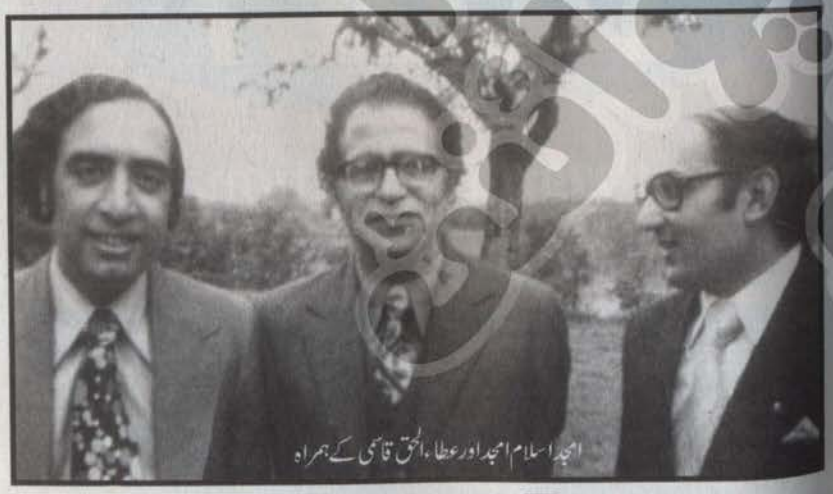

امجد اسلام امجد اور عطا الحق قاسمی کے ہمراہ

ڈال دیتے، کئی تو موقع دیکھ کر ان کے بعض خیالات کی بے وجہ تردید کرنے لگتے۔ یہ ڈیرہ اردو سائنس بورڈ میں بھی برسوں رہا، جمعرات کا لنگر بھی اس کا حصہ ہوتا جو بانو آپا کی نگرانی میں تیار ہوتا۔ اس سوچ کے گھنے سایے میں جوان ہونے والے بہر حال اسے کسی ادارے کی شکل نہ دے سکے اور اشفاق احمد کی پہچان ادیب سے زیادہ، زاویے والے بابا جی کی بن کے رہ گئی۔

1974ء میں مجلس ترقی ادب کے ڈائریکٹر بننے کے بعد احمد ندیم قاسمی کا ڈیرہ یوں آباد ہوا کہ 2006ء تک جب 10 جولائی کو وہ رخصت ہوئے اس ڈیرے کی رونق کم نہیں ہوئی۔ فنون کی ادارت لکھنے والوں کی مسلسل تربیت کی صورت ایک تنظیم میں ڈھلتی گئی۔

آج 2013 میں شاید کسی فرد کی شخصی محبت سے اوپر اٹھ کر جائزہ لینا اور انھیں یاد کرنا نسبتاً زیادہ آسان ہو گیا ہے کہ ادبی آسمان کی پرچھائی بدلیوں میں احمد ندیم قاسمی کا عکس ہے، یا ان کے نام پر برسنے والی بدلیاں بہت ہیں، یہ خوش نصیبی سب کے ہاتھ میں نہیں آتی۔

بچپن میں ہی والد کی وفات کے صدمے نے بقول ان کے ''بوڑھا'' کر دیا تھا۔ اس صدمے نے انھیں آنے والی زندگی میں پختگی اور ذمہ داری عطا کر دی۔ 70 سال کے طویل ادبی کیریئر میں کم سے کم تین نسلوں کے شعراء اور ادیبوں نے ان سے فیض پایا۔ یہ ان کی کمال خوبی تھی کہ نئے لکھنے والوں کو ظرف اور کمال شفقت سے اپنا لیتے، ان کو خط لکھتے، ملنے کے لئے آتے تو خوش دلی سے وقت دیتے، باتیں کرتے، لطیفے سناتے، اصلاح کرتے۔ وہ کبھی بھی مصلح نہیں تھے بلکہ ایک عمدہ شاعر اور افسانہ نگار کے طور پر ان کی پہچان مسلم ہے اس سے پہلے ان کا تعارف ایک فکاہیہ کالم نگار کا تھا، ہم تک آتے آتے وہ شاعروں کے پیش امام اور بڑے افسانہ نگاروں کے سرخیل بن چکے تھے۔ البتہ کالم نگاری نے ان کا بہت قیمتی اور تخلیقی وقت لے لیا۔ میں نے دو ادیبوں کا قابلِ رشک بڑھاپا دیکھا۔ ''اشفاق صاحب کا اور احمد ندیم قاسمی کا۔'' قاسمی صاحب کی بیٹھی بیٹھی گھمبیر آواز کی مٹھاس آخر تک قائم رہی۔

پاکستان میں شاید ہی کسی بوڑھے آدمی کی اتنی محبت اور شان سے سالگرہ منائی جاتی رہی ہو، بے شک سالگرہ کی یہ سالانہ تقریب ایک طرح کی لاہور کی مستقل ادبی روایت کا روپ دھار گئی تھی۔ نوجوان، بزرگ، نئے، پرانے، کافی پرانے، ادبی، غیر ادبی ہر طرح اور ہر سطح کے لوگ ان سالگرہوں میں آتے اور قاسمی صاحب بار بار اپنی سیٹ سے اٹھ کر مہمانوں سے گلدستے اور خوبصورت تحفے وصول کرتے، میز پھولوں سے ''لبالب'' بھر جاتے تو منصورہ احمد کچھ گلدستے پرے کر دیتیں۔ میں نے ان مواقع پر جناب اشفاق احمد، عطا الحق قاسمی، امجد اسلام امجد، اصغر ندیم سید، ڈاکٹر یونس جاوید سمیت آج کے ہر اہم اور مشہور شاعر اور ادیب کو وہاں شریک ہوتے اور اظہارِ خیال کرتے دیکھا۔ جناب اشفاق احمد اور عطاالحق قاسمی کی بعض گفتگوئیں جنھوں نے سماں باندھا مجھے آج بھی یاد ہیں۔ دل میں ممکن ہے سب کے ہو کہ کبھی ان کی بھی اسی طرح دھوم دھام سے سالگرہ منائی جائے مگر ایسے کام خواہشوں سے نہیں ان لوگوں کی محبت سے ہوتے ہیں جنھوں نے آپ سے فیض پایا ہو۔ آپ سے جُڑے رہے ہوں۔

میرے ان سے تعارف اور تعلق میں کئی چھوٹی

چھوٹی یادیں شامل ہیں۔

مارچ 1981ء ابوظہبی میں جشن قاسمی منایا گیا تو انہی دنوں بہاولپور میں صادق ایجرٹن کالج کے سو سال مکمل ہونے پر ہونے والے جشن کی کاغذی کارروائیاں زوروں پر تھیں۔ مہمانوں کے بڑے بڑے ناموں میں احمد ندیم قاسمی صاحب کا نام بار بار آتا کہ وہ اس کالج کے گلِ سرسبد تھے۔ کالج کی اسٹوڈنٹس یونین

مجھے ان کے نقوشِ پایہ چلتے ہوئے دورِ نو کے پھول کی ادارت کا 13 سال اعزاز ملا۔ اب کے ان تفصیلی انٹرویو کا موقع ملا جو پھول کی زینت بنا، کئی دفعہ وہ نہ ملتے تو ڈاکٹر یونس جاوید بہت عمدہ میزبانی کرتے۔

جناب انور سدید نے عربی کتاب ''بہانے باز'' کا دیباچہ لکھتے ہوئے جو جملے لکھے وہ جناب احمد ندیم قاسمی کے کام اور اس کی گہرائی کا بہت عمدہ اعتراف ہے

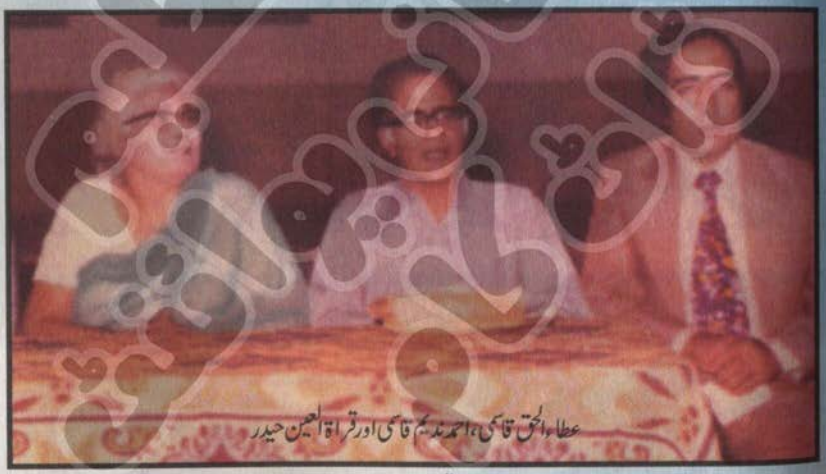

عطاء الحق قاسمی، احمد ندیم قاسمی اور قرۃ العین حیدر

میں ہونے کے باعث ایسی محفلوں میں شرکت کا موقع ملتا تو ان کو دیکھنے اور ملنے کا اشتیاق اور بھی گہرا ہوا۔

اب اسے اتفاق ہی جانیے کہ لاہور آکر پنجاب یونیورسٹی میں پڑھنے کے دوران کوئی وقت ہی نہ بن پایا۔ فیروز سنز میں ایڈیٹر مطبوعات مقرر ہونے کے بعد لاہور اور بیرون لاہور ادیبوں اور شاعروں سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا تو اُن سے پہلی ملاقات ہوئی۔ پھول کے علاوہ وہ تہذیب نسواں، ادب لطیف سویرا، امروز، نقوش اور فنون کے مدیر رہے۔ یہاں حسنِ اتفاق سے

انھوں نے ''لکھا جب جب اختر عباس کا ذکر آئے گا مجھے احمد ندیم قاسمی یاد آتے ہیں۔ قاسمی صاحب جب اختر عباس کی عمر کے تھے تو وہ دارالاشاعت لاہور سے مولوی ممتاز علی کی نگرانی میں رسالہ پھول نکالتے تھے جسے میری عمر کے بچے سکول کی لائبریری میں پڑھتے تھے۔ بعد میں قاسمی صاحب بڑے ہو گئے جیسے ہر بچہ بڑا ہو جاتا ہے مگر جس طرح انھوں نے صحافت سے ابتدا کی اور صحافت کے ساتھ عمر بھر کا سنجوگ قائم رکھا اسی طرح اختر عباس نے بھی ادب کا آغاز صحافت سے کیا ہے اور

احمد ندیم قاسمی لیجنڈ شاعر

عہد حاضر کے اُردو ادب میں احمد ندیم قاسمی صاحب کی شخصیت اس لحاظ سے منفرد ہے کہ وہ بیک وقت بلند پایہ شاعر اور صاحب طرز نثر نگار ہیں۔ آزاد، پابند نظم ہو یا تخلیقی و تنقیدی نثر، ہر سمت ان کا قلم رواں ہے۔ تقریباً 35 سال سے اُنھوں نے ادب کی خدمت کو وظیفہ حیات بنا رکھا ہے اور یار و اغیار کی تحسین و نفرین سے بے نیاز اور حکومتوں اور اداروں کی سرپرستی سے مستغنی اپنے راستہ پر مستقل مزاجی سے گامزن ہیں۔ کیونکہ ان کے فن و کردار میں تضاد نہیں اسی لیے اُن کی تحریروں میں اثر اور خلوص کی تابانی ہے۔ یہ اُن کے ریاض کا کرشمہ ہے کہ عمر کے ساتھ اُن کے قلم کی رفتار زیادہ تیز ہوتی جارہی ہے۔ ماحول کی تاریکی میں تلاش و تحقیق کے مشعل لیے وہ ضم کدہ سے چلتے چلتے خانہ کعبہ تک جا پہنچے ہیں۔ ترقی پسندی کا مفہوم ان کے ذہن میں ایک ایسی تحریک نہیں جو وقت کے تقاضہ کو پورا کرچکی اور نہ انجمن سازی ہے، بلکہ ایک ایسا فلسفہ حیات ہے جو ہر ملک اور ہر دور کے مسائل کی کلید ہے۔

(ڈاکٹر حسین رائے پوری)

آہستہ آہستہ اسی نجوگ کو پختہ اور مائل بہ ارتقا کررہے ہیں۔ وہ خوش قسمت ہیں کہ انھوں نے پاؤں اس 'کھڑاواں' میں ڈالے ہیں جو کبھی قاسمی صاحب نے پہنی تھی۔

پھر انھوں نے ایک دلچسپ اور انوکھی بات لکھی ''توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ اس سفر میں مختلف فلیگ سٹاپ'' عبور کر کے مرکز ادب ہی نہیں مرکز نگاہ بھی بن جائیں گے اس وقت زندہ رہا تو اختر عباس کا ایک طویل خاکہ لکھوں گا اور اگر عقبیٰ کو چلا گیا تو وہاں سے کسی فرشتے کے ہاتھ اختر عباس کے پرچے میں اشاعت کے لئے بھجواؤں گا۔ مجھے خوشی ہے، پھول کے پہلے دور نے اردو ادب کو احمد ندیم قاسمی جیسا افسانہ نگار دیا اور دوسرے دور سے ایک اور بڑا کہانی نگار ابھر رہا ہے جس کی ابتداء میں مستقبل کی کامرانیاں نمایاں ہیں۔''

سچی بات یہ ہے کہ ڈاکٹر انور سدید کی تحریر نے ایک بار تو حیران، پریشان بلکہ سوالیہ نشان ہی کردیا۔ جناب قاسمی کا ذکر ایک ایسے لجنڈ کے طور پر کیا کہ جس کی کھڑاویں پہننا ہی نہیں چھونا بھی اعزاز سے کم نہیں۔

ڈاکٹر انور سدید اس عہد کے صاحب مطالعہ، نقاد اور بڑے دانشور ہیں۔ ایک زمانے تک وہ ڈاکٹر وزیر آغا کی اعلانیہ محبت اور دبستانِ ندیم کے خلاف قلم بکف رہے۔ ان کی ایک تحریر پڑھ کر قاسمی صاحب بہت مسرور ہوئے تھے۔ حسنِ اتفاق سے اس کی وجہ میری ایک کتاب بنی۔

اس عہد کی اس بڑی ادبی شخصیت کو یاد کرنے کے لئے اُردو ڈائجسٹ نے خصوصی گوشے کا اہتمام کیا ہے۔ اس کی تیاری میں جناب ایوب خاور نے ہماری بہت راہنمائی کی۔ گلزار صاحب سے انڈیا رابطہ بھی کیا ان کا مضمون ابھی ادھورہ تھا اس لئے آئندہ کے لئے اُٹھا رکھا ہے۔ خصوصی گوشے میں کسی بھی شخصیت کا پورا کامل احاطہ کرنا ممکن ہی نہیں رہتا بس یہ تو ایک اظہارِ محبت ہوتا ہے۔ اپنے ممدوح سے کچھ جُڑی خوشگوار یادوں کا تذکرہ، بس اتنا کہنا ہے کہ اُردو کا یہ خوبصورت دبستان جو بظاہر 10 جولائی 2006ء کو بند ہوگیا تھا..... ان کے کتنے ہی چاہنے والوں کے دلوں، لفظوں اور تحریروں میں تو زندہ ہے۔

ہم یونان کے باسیوں سے 5 ہزار سال پیچھے کیوں ہیں

"ایلیا" کا سردار

ہمارا ہر دانشور، شاعر عمر بھر زندگی کی چکی میں کیوں پستا اور ضرورتوں کی ہانڈی میں ابلتا رہتا ہے؟

جاوید چودھری

یونان کے بادشاہوں نے شاعروں، ادیبوں، دانشوروں اور فلسفیوں کے لیے ایک خوبصورت بستی آباد کی۔ یہ پہاڑوں کے دامن میں دریا کے کنارے ایک دلفریب اور پر امن بستی تھی۔ بستی میں لکڑی کے چھوٹے چھوٹے پُر آسائش مکان تھے اور ان مکانوں میں اس دور کے تمام بڑے فلسفی، دانشور اور شاعر رہتے تھے۔ اس ساری بستی کا نان نفقہ بادشاہِ وقت کی ذمہ داری ہوتی تھی۔ بادشاہ نے شاعروں کے نان نفقے کے لیے بستی سے پانچ میل دور باغ لگوا دیئے، کھیت اور فارم ہاؤسز بنوا دیئے اور پورے یونان سے غلام اکٹھے کر کے ان باغوں اور ان کھیتوں میں آباد کر دیئے۔ یہ غلام دانشوروں کی بستی کے لیے پھل، پھول، سبزیاں اور اناج اُگاتے تھے، یہ ان کے لیے جانور پالتے تھے اور ان دانشوروں کے لیے دودھ، دہی اور شہد کا بندوبست کرتے تھے۔ دانشوروں کی بستی اور غلاموں کے گھروں کے درمیان اک پہاڑ حائل تھا۔ یہ پہاڑ کھیت کھلیانوں، غلاموں اور جانوروں کے شور سے دانشوروں سے دور رکھتا تھا۔ اس بستی کے قوانین بھی انوکھے تھے۔ اس بستی میں صرف خوبصورت غلام اور کنیزیں داخل ہو سکتی تھیں۔ اس بستی میں کوئی بیرونی شخص جوتا پہن کر داخل نہیں ہو سکتا تھا، کوئی شخص گھوڑے پر سوار ہو کر اس بستی کے قریب سے نہیں گزر سکتا تھا اور اس بستی میں کوئی فوجی اور تاجر داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ امن، دانش

اور فکر کی بستی تھی اور اس بستی میں اپنے وقت کے پانچ ہزار فلسفی، شاعر اور دانشور رہتے تھے۔ حکومت نے ان دانشوروں کو معاش، سیاست اور اندیشوں سے آزاد کر رکھا تھا۔ ان لوگوں کا صرف ایک ہی کام ہوتا تھا، مطالعہ، غور و فکر اور شعر کہنا۔ اس بستی کے بارے میں یونان کے تمام بادشاہوں نے آپس میں یہ سمجھوتا کر رکھا تھا کہ وہ اپنی جنگوں میں اس بستی اور اس بستی کے باسیوں کو نقصان نہیں پہنچائیں گے۔

اس بستی کا نام ''ایلیا'' تھا۔ یہ بستی سن ایک میں زلزلے کے ہاتھوں برباد ہوگئی۔ لیکن اس کے آثار آج بی اولیپیا شہر کے قریب موجود ہیں۔ پاکستان کے معروف شاعر ''جان ایلیا'' نے اپنا تخلص ''ایلیا'' اسی بستی سے مستعار لیا تھا۔ یونان کے بادشاہوں نے ایلیا نام کی یہ بستی کیوں بسائی؟ یہ سوال آج کے دور میں سوال نہیں رہا، انسان کی دس ہزار سالہ تاریخ نے طویل غور و فکر کے بعد ثابت کر دیا، وہ لوگ جنھیں اللہ تعالیٰ خصوصی صلاحیتوں سے نوازتا ہے، خدا جنہیں غور و فکر اور تخلیق کی قدرت بخشتا ہے، وہ لوگ عام روزمرہ کے کام نہیں کر سکتے۔ وہ دفتر نہیں جا سکتے، دوکانوں پر نہیں بیٹھ سکتے، فیکٹریاں نہیں لگا سکتے، پلاٹوں کی خرید و فروخت نہیں کر سکتے۔ وہ معاش کی فکروں میں مبتلا نہیں رہ سکتے اور وہ بچے نہیں پال سکتے۔ تاریخ نے ثابت کر دیا ذہنی طور پر بالغ اور زرخیز لوگوں کو یکسوئی اور معاشی فراغت درکار ہوتی ہے۔ یہ لوگ خوبصورت ماحول اور مسائل سے آزاد زندگی چاہتے ہیں۔ چنانچہ اس وقت کے بادشاہوں نے یونان کو ارسطو، سقراط، بقراط، فیثا غورث، دیوجانس کلبی اور ہومر جیسے تخلیق کار دینے کے لیے ''ایلیا'' نام کی بستی آباد کر دی لہٰذا اس کا یہ نتیجہ نکلا، آج ہم جدید علوم کے جس بھی شعبے کی جڑیں تلاش کرتے ہیں تو ہم یونان کے دروازے پر آ نکلتے ہیں، ہمیں فلسفیوں مصوروں اور سائنس دانوں سے محبت کا گر یونان نے سکھایا۔ لہٰذا روم کی تہذیب ہو، ایران کی تاریخ ہو، بابل اور نینوا کے باغات ہوں، فرعون کا دربار ہو یا قرطبہ کا تخت ہو، ہر دور کے سمجھدار بادشاہوں اور مہذب معاشروں نے اپنے شاعروں، اپنے اپنے فلسفیوں اور اپنے مصوروں کی اسی جذبے کے ساتھ خدمت کی۔ قرطبہ میں شراب پر پابندی تھی لیکن شاعروں اور ادیبوں پر حد نافذ نہیں ہوتی تھی۔ عبدالرحمن الداخل نے قرطبہ کے یہودیوں کو شہر سے بے دخل کر دیا تھا لیکن جب دو یہودی فلسفی شہر چھوڑنے لگے تو وہ ان کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا اور جب تک ان فلسفیوں نے اپنا سامان نہ کھول دیا، وہ اسی طرح ہاتھ باندھے کھڑا رہا۔ امیر تیمور جب کسی شہر پر حملہ کرتا تھا تو وہ اس شہر کے تمام عالموں، شاعروں ادیبوں، دانشوروں اور فلسفیوں کو امان دے دیتا تھا۔ وہ شہر فتح کرنے کے بعد ان تمام لوگوں کو اپنے آبائی شہر ''سبز'' منتقل کر دیتا تھا اور اس کے بعد پوری زندگی ان کو وظیفہ دیتا تھا۔ شاعر اور ادیب پروری کا یہ سلسلہ ہندوستان میں بھی جاری رہا۔ مغل بادشاہ اپنے وقت کے نامور شاعروں، ادیبوں اور فلسفیوں کو وظیفے دیا کرتے تھے۔ 1857ء میں جب مغل سلطنت آخری سانسیں لے رہی تھی، اس وقت بھی بہادر شاہ ظفر مرزا اسداللہ غالب، ابراہیم ذوق اور سرسید احمد کو وظیفے دیتا تھا۔ شاعر پروری کی یہ روایت نوابوں کے درباروں میں بھی موجود تھی۔ رام پور کے نواب غالب کو 200 روپے ماہانہ وظیفہ دیتے تھے جبکہ نواب آف بھوپال ہر مہینے علامہ اقبال کو رقم بھجواتے تھے۔ میر تقی میر لکھنؤ کے دربار سے وابستہ تھے۔ میر انیس نے اپنی کتاب نوابین کی معاونت سے تخلیق کی تھی اور انگریز ہندوستان

کے تخلیق کاروں کو شمس العلما اور سر کا خطاب دے کر فکرِ معاش سے آزاد کر دیا کرتے تھے۔

امریکا یونان کے بعد دوسرا ملک ہے جس نے شاعروں، ادیبوں اور فلسفیوں کی خدمت کو سٹیٹ پالیسی بنایا۔ اس وقت دنیا میں سب سے زیادہ پی ایچ ڈی، سب سے زیادہ ادیب، شاعر، دانشور اور مصور امریکا میں ہیں اور ان تمام لوگوں کا شمار خوشحال لوگوں میں ہوتا ہے۔ امریکا دنیا بھر کے باصلاحیت لوگوں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے وظائف دیتا ہے۔ وہ انھیں فیملی سمیت امریکا بلاتا ہے، جب یہ لوگ تعلیم مکمل کر لیتے ہیں تو امریکا ان لوگوں کو بھاری مشاہرے پر نوکری دیتا ہے۔ اس نے تھنک ٹینک کے نام سے ایک ایسا سسٹم بنا رکھا ہے جو اپنے وقت کے تمام اعلیٰ دماغوں کو ریسرچ، مقالے، پالیسی اور لیکچر کی آڑ میں بہت اچھا معاوضہ دیتے ہیں، ان لوگوں کی ادب پروری کا یہ عالم ہے کہ یہ سکھوں کی تاریخ پر کتاب لکھنے کے لیے خوشونت سنگھ کو پانچ سال تک گھر بٹھا کر تنخواہ دیتے رہتے ہیں اور یہ لوگ قرآن مجید اور اسلامی تاریخ پر ریسرچ کرنے کے لیے مسلمانوں کو وظائف دیتے ہیں۔ ان لوگوں کی ادب پروری صرف حکومت تک محدود نہیں، ان لوگوں نے اسے ایک معاشرتی عادت بنا دیا ہے۔ آج امریکا میں جب کوئی کتاب شائع ہوتی ہے تو امریکا کے لاکھوں شہری قطاروں میں لگ کر یہ کتاب خریدتے ہیں۔ لوگ ہر سال نوبل، پلٹزر (Pulitzer) اور بکر ایوارڈز کی شکل میں ادیبوں اور شاعروں کو اربوں روپے دیتے ہیں۔ یہ سب کیوں ہے؟ یہ ادب، فلسفے اور تحقیق کو زندہ رکھنے کا بہانہ ہے۔ یہ لوگ جانتے ہیں اگر انھوں نے ادیب، شاعر اور تخلیق کار کو معاش کی فکر سے آزاد نہ کیا تو معاشرہ تخلیقی جوہر اور فکری کلچر سے محروم ہو جائے گا لیکن جب ہم اپنے معاشرے کو دیکھتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ اس ملک میں جتنا محروم دانشور ہے، اتنا محروم شاید ہی کسی شعبے کا کوئی رکن ہو۔ اس ملک کا ادیب، شاعر اور دانشور تمام عمر زندگی کی چکی میں پستا اور ضرورتوں کی ہانڈی میں اُبلتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس کی کتابیں، اس کی ساری عمر کی تخلیقات اس کے کفن تک کے پیسے پورے نہیں کرتیں۔ میں نے ایک بار اس ملک کے بڑے تخلیق کار احمد ندیم قاسمی صاحب سے پوچھا تھا، پاکستان نے آج تک عالمی سطح کا کوئی شاعر، کوئی ادیب پیدا کیوں نہیں کیا تو انھوں نے مسکرا کر جواب دیا ''کیونکہ ہمارا شاعر پوری زندگی چولھے اور رکابی سے آزاد نہیں ہوتا۔'' ان کی بات میرے دل میں کھب گئی۔

آج جب میں جناب احمد قاسمی کی ذات پر چند سطریں لکھنے بیٹھا ہوں تو مجھے محسوس ہو رہا ہے، ہم کتنے بدنصیب لوگ ہیں۔ ہمارے ملک میں بھکاری تک خوشحال ہوتے ہیں۔ لیکن ادیب، شاعر، فلسفی اور تخلیق کار وہ نسل ہوتی ہے جو اپنی جائز ضرورتوں تک کو ترستی رہتی ہے۔ معاشرہ ان کے ساتھ جذام کے مریضوں جیسا سلوک کرتا ہے۔ میں نے سوچا المیہ دیکھیے اس ملک میں احمد ندیم قاسمی جیسی ہستی 90 سال کی عمر میں بھی فکرِ معاش سے آزاد نہ ہو سکی۔ انھیں ادب کی 70 سالہ خدمت کے بعد بھی چیک کا انتظار رہتا تھا۔ وہ آخری وقت تک نوکری کے دکھ میں مبتلا تھے۔ یہ وہ سلوک تھا جو ہم اس ملک کے سب سے بڑے دانشور کے ساتھ کرتے رہے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں وہ دریا تھے اور وہ ہمارا سارا سماجی گند سمیٹ کر چپ چاپ سمندر میں اتر گئے لیکن ان کی موت یہ ثابت کرتی ہے، ہم لوگ یونان کے باسیوں سے پانچ ہزار سال پیچھے ہیں۔ یونان کے لوگ ہم سے کہیں سو لائزڈ اور مہذب تھے۔ اگر احمد ندیم قاسمی پانچ ہزار سال پرانے یونان کے باسی ہوتے تو وہ ''ایلیا'' کے سردار ہوتے اور وقت کے بادشاہ تک جوتے اتار کر ان

کے دربار میں حاضر ہوتے۔

احمد ندیم قاسمی صاحب کی موت اس معاشرے کا کتبہ ہے اور اس کتبے پر لکھا ہے جو معاشرہ اپنے دانشوروں کی قدر نہیں کرتا، جو سوسائٹی اپنے تخلیق کاروں کو عزت، سکون، اور روٹی نہیں دیتے وہ معاشرہ معاشرہ نہیں قبرستان ہوتا ہے۔ اس معاشرے میں رہنے والا ہر شخص ایک قبر، ایک کفن، اور ایک جنازہ ہوتا ہے۔

■■■

قومیایا ہوا بینک

احمد ندیم قاسمی ہماری ادبی تاریخ میں ایک ستون، ایک مینار، ایک سنگِ میل، ایک تحریک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ (اور یہ سب کچھ وہ ہمارے دیکھتے بلکہ روکتے روکتے بن گئے ہیں۔) زندگی نے، اُن کے فن و فکر سے توانائی بھی حاصل کی ہے اور رعنائی بھی۔ وہ انسان کی عظمت اور محبّت کے شاعر ہیں۔ ذرّوں میں ستارے بننے کی یہ جو ایک اُمنگ آج نظر آرہی ہے اس میں ندیم کے دل کی روشنی بھی شامل ہے۔ اُردو زبان و ادب کی خالص گنگا جمنی فضا کو، راوی، چناب، جہلم اور سندھ کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ کرنے میں ندیم کے شعر و افسانہ نے ایک عہد ساز کردار ادا کیا ہے۔ ہمارے دور کو ندیم کا ممنون ہونا چاہیے بلکہ میرے محترم دوست (اُردو کے البیلے مزاح نگار) کرنل محمد خاں صاحب کے بقول یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ......''ندیم اُردو ادب کا سب سے بڑا قومیایا ہوا بینک ہے۔ ہم سب اس کے مقروض ہیں۔''

ندیم دل میں اُتر جانے والا ادیب ہے تو روح میں سما جانے والا انسان بھی ہے۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے، میں ایک ایک جملہ چوم چاٹ کر لکھنا چاہتا ہوں۔

(سید ضمیر جعفری)

مجھے ''منو بھائی'' احمد ندیم قاسمی نے بنایا

میرے لیے فخر کی بات ہے کہ مجھے ''منو بھائی'' [illegible] قلمی نام احمد ندیم قاسمی نے دیا تھا۔ 1954 [illegible] روزنامہ امروز، لاہور میں میری پہلی تحریر کی اشاعت کے وقت اُنھوں نے بطور ایڈیٹر اپنے قلم سے میرا اصلی نام کاٹ کر منو بھائی رکھ دیا تھا اور میں منیر احمد قریشی سے منو بھائی ہوگیا تھا۔ تب سے اب تک باون سالوں کے دوران میں نے ہمیشہ اور ہر حالت میں احمد ندیم قاسمی کے دیے ہوئے اس نام کی حفاظت کی ہے۔ اس نام کو بد[illegible] ہونے سے بچانے کی جہاں تک ہوسکتا تھا، بھرپور کوشش کی ہے جس میں شاید کسی حد تک کامیاب بھی رہا ہوں۔

نام کو بدنام ہونے سے بچانے کی کوشش [illegible] کامیابی کا بہت سارا کریڈٹ بھی احمد ندیم قاسمی کو [illegible] ہے کہ اُنھوں نے مجھے صحافت کے میدان میں [illegible] ہوئے اور راولپنڈی میں ''امروز'' کا نامہ نگار [illegible] کرتے وقت نام کو بدنام ہونے سے بچانے اور نیک نامی کی راہ پر چلانے کا ایک آسان نسخہ مرحمت فرمایا تھا کہ [illegible] پوٹہ چھوٹا رکھو گے تو زیادہ بھوک نہیں لگے گی۔ اپنے [illegible] سے بڑا نوالہ منہ میں ڈالنے کی کوشش نہیں کرو گے تو نوالہ تمھارے گلے میں نہیں پھنسے گا۔''

(منو بھائی)

اس عہد کے ایک بڑے افسانہ نگار احمد ندیم قاسمی کی منتخب کہانی

ایسی کہانیاں عمروں یاد رہتی ہیں، ستاتی ہیں، تڑپاتی ہیں

کپاس کا پھول

ایک کرموں جلی مائی کی دل فگار داستان

زندگی اس پر کچھ ایسی مہربان نہ تھی، پھر بھی کسی کو لگتا تھا کہ وہ مرے گی تو پوری دنیا مر جائے گی

احمد ندیم قاسمی

مائی تاجو ہر رات کو ایک گھنٹہ تو ضرور سو لیتی تھی لیکن اُس رات غصے نے اُسے اتنا سا بھی سونے کی مہلت نہ دی۔ پو پھٹے جب وہ کھاٹ پر سے اتر کر پانی پینے کے لیے گھڑے کی طرف جانے لگی تو دوسرے ہی قدم پر اسے چکر آگیا تھا اور وہ گر پڑی تھی۔ گرتے ہوئے اس کا سر کھاٹ کے پائے سے ٹکرا گیا تھا اور وہ بے ہوش ہوگئی تھی۔

یہ بڑا عجیب منظر تھا۔ رات کے اندھیرے میں صبح ہولے ہولے گھل رہی تھی۔ چڑیاں ایک دوسرے کو رات کے خواب سنانے لگی تھیں۔ بعض پرندے پر ہلائے بغیر فضا میں یوں تیر رہے تھے جیسے مصنوعی ہیں اور کوک ختم ہوگئی تو گر پڑیں گے۔ ہوا بہت نرم تھی اور اس میں ہلکی ہلکی لطیف سی خنکی تھی۔ مسجد میں وارث علی اذان دے رہا تھا۔ یہ وہی سریلی اذان تھی جس کے بارے میں ایک سکھ سمگلر نے یہ کہہ کر پورے گاؤں کو ہنسا دیا تھا کہ اگر میں نے وارث علی کی تین چار اذانیں اور سن لیں تو واہگورو کی قسم کھا کے کہتا ہوں کہ میرے مسلمان ہوجانے کا خطرہ ہے۔ اذان کی آواز پر گھروں میں گھر گھر چلتی ہوئی مدھانیاں روک لی گئی تھیں۔ چاروں طرف صرف اذان حکمران تھی اور اس ماحول میں مائی تاجو اپنی کھاٹ کے پاس ڈھیر پڑی تھی۔ اس کی کپٹی کے پاس اس کے سفید بال اپنے ہی خون سے لال ہو رہے تھے۔

مگر یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی، مائی تاجو کو تو جیسے بے ہوش ہونے کی عادت تھی۔ ہر آٹھویں دسویں روز وہ صبح کو کھاٹ سے اٹھتے ہی بے ہوش ہوجاتی تھی۔ ایک بار تو وہ صبح سے دوپہر تک بے ہوش پڑی رہی تھی اور چند چیونٹیاں بھی اسے مردہ سمجھ کر اس پر چڑھ آئی تھیں اور اس کی جھریوں میں بھٹکنے لگی تھیں۔ تب پڑوس سے چودھری فتح دین کی بیٹی راحتاں پنجوں کے بل کھڑی ہوکر دیوار پر سے جھانکی تھی اور پوچھا تھا ''مائی! آج لسّی نہیں لوگی کیا؟'' پھر اس کی نظر بے ہوش مائی پر پڑی تھی اور اس کی چیخ سن کر اس کا باپ اور بھائی دیوار پھاند کر آئے تھے اور مائی کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مار مار کر اور اس کے منہ میں شکر ڈال ڈال کر خاصی دیر کے بعد اسے ہوش میں لائے تھے۔ حکیم منور علی کی تشخیص یہ تھی کہ مائی خالی پیٹ سوتی ہے۔

اُس دن سے راحتاں کا معمول ہوگیا تھا کہ وہ شام کو ایک روٹی پر دال ترکاری رکھ کر لاتی اور جب تک مائی کھانے سے فارغ نہ ہوجاتی وہیں پر بیٹھی مائی کی باتیں سنتی رہتی۔ ایک دن مائی نے کہا تھا: ''میں تو ہر وقت تیار رہتی ہوں بیٹی کہ جانے کب اوپر سے بلاوا آجائے۔ جس دن میں صبح کو تمھارے گھر لسّی لینے نہ آئی تو سمجھ لینا میں چلی گئی۔ تب تم آنا اور اُدھر وہ چارپائی تلے صندوق رکھا ہے نا، اس میں سے میرا کفن نکال لینا، کبھی دکھاؤں گی تمھیں۔ وارث علی سے کہہ کر مولوی عبدالمجید سے اس پر خاکِ پاک سے کلمہ شہادت بھی لکھوا لیا تھا۔ ڈرتی ہوں اسے بار بار نکالوں کی تو کہیں خاکِ پاک جھڑ ہی نہ جائے۔ بس یوں سمجھ لو کہ یہ وہ لٹھا ہے جس سے بادشاہ زادیاں برقعے سلاتی ہیں گی۔ کپاس کے خاص پھولوں کی روئی سے تیار ہوتا ہے یہ کپڑا۔ ٹین کے پترے کی طرح کھڑ کھڑ بولتا ہے۔ چکی پیس پیس کر کمایا ہے۔ میں لوگوں کو عمر بھر آٹا دیتی رہی ہوں اور ان سے کفن لیتی رہی ہوں۔ کیوں بیٹی! یہ کوئی گھاٹے کا سودا تھا؟ نہیں تھانا! میں ڈرتی ہوں کہ کہیں کھدر کا کفن پہن کر جاؤں تو لوگ جنت میں بھی مجھ سے چکی ہی نہ پسوانے لگیں۔'' پھر اپنے پوپلے منہ سے مسکرا کر اس نے پوچھا تھا ''تمھیں دکھاؤں؟''

''نا مائی!'' راحتاں نے ڈر کر کہا تھا ''خاکِ پاک جھڑ گئی تو!'' پھر اس نے موضوع بدلنے کی کوشش کی ''ابھی تو تم بیس سال اور جیو گی۔ تمھارے ماتھے پر تو پانچ لکیریں ہیں۔ پانچ بیسیاں سَو!''

مائی کا ہاتھ فوراً اپنے ماتھے کی طرف اٹھ گیا ''ہائے پانچ کہاں ہیں بیٹی، کل چار ہیں۔ پانچویں تو یہاں سے

ٹوٹی ہوئی ہے۔ تُو چھری کی نوک سے دونوں ٹکڑوں کو ملا دے تو شاید ذرا سا اور جی لوں۔ تیرے گھر کی لسّی تھوڑی سی اور پی لوں۔'' مائی کے پوپلے منہ پر ایک بار پھر گول سی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔

اس پر راحتاں نے زور سے ہنس کر آس پاس پھیلے ہوئے کفن اور کافور کی بُو سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی مگر کفن اور جنازے سے مفر نہ تھا۔ یہی تو مائی کے محبوب موضوع تھے۔

ویسے راحتاں کو مائی تاجو سے اُنس ہی اس لیے تھا کہ وہ ہمیشہ اپنے مرنے ہی کی باتیں کرتی تھی جیسے مرنا ہی اس کی سب سے بڑی کامیابی ہو اور جب راحتاں نے ایک بار مذاق مذاق میں مائی سے وعدہ کیا تھا کہ اس کے مرنے کے بعد وہ اسے یہی کفن پہنا کر اپنے باپ کی منت کرے گی کہ مائی کا بڑا ہی شاندار جنازہ نکالا جائے تو مائی اتنی خوش ہوئی تھی کہ جیسے اسے نئی زندگی مل گئی ہے۔ راحتاں سوچتی تھی کہ یہ کیسی بدنصیب ہے جس کا پوری دنیا میں کوئی بھی اپنا نہیں ہے اور جب یہ مرے تو کسی آنکھ سے ایک بھی تو آنسو نہیں ٹپکے گا۔ بعض موتیں کتنی آباد اور بعض کتنی ویران ہوتی ہیں۔ خود راحتاں کا ننھا بھائی کنویں میں گر کر مرگیا تھا تو کیا شاندار ماتم ہوا تھا۔ کئی دن تک بین ہوتے رہے تھے اور گھر سے باہر چوپال پر دُور دُور سے فاتحہ خوانی کے لیے آنے والوں کے ٹھٹ لگے رہے تھے۔ اور پھر انھی دنوں کریمے نائی کا بچہ نمونیے سے مرا تو بس اتنا ہوا کہ اس روز کریمے کے گھر کا چُولھا ٹھنڈا رہا اور تیسرے ہی روز وہ چوپال پر بیٹھا چودھری فتح دین کا خط بنا رہا تھا۔ موت میں ایسا فرق نہیں ہونا چاہیے۔ مر کر تو سب برابر ہوجاتے ہیں۔ سب مٹی میں دفن ہوتے ہیں۔ امیروں کی قبروں کے لیے مٹی ولایت سے تو نہیں منگائی جاتی، سب کے لیے یہی پاکستان کی مٹی ہوتی ہے۔

''کیوں مائی؟'' ایک دن راحتاں نے پوچھا تھا ''کیا اس دنیا میں سچ مچ تمھارا کوئی نہیں ہے؟''

''واہ! کیوں نہیں ہے!'' مائی مسکرائی۔

''اچھا!'' راحتاں کو بڑی حیرت ہوئی۔

''ہاں ایک ہے۔'' مائی بولی۔

راحتاں بہت خوش ہوئی کہ مائی نے اسے ایک ایسا راز بتا دیا جس کا گاؤں کے بڑے بوڑھوں تک کو علم نہیں ''کہاں رہتا ہے وہ؟'' اس نے بڑے شوق سے پوچھا۔

''وہ؟'' مائی مسکرائے جا رہی تھی ''وہ یہاں بھی رہتا ہے وہاں بھی رہتا ہے۔ دنیا میں کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں وہ نہ رہتا ہو۔ وہ بارڈر کے اُدھر بھی رہتا ہے بارڈر کے اِدھر بھی رہتا ہے۔ وہ تو.....''

راحتاں نے بے قرار ہوکر مائی کی بات کاٹی ''ہائے ایسا کون ہے وہ؟''

اور مائی نے اسی طرح مسکراتے ہوئے کہا ''خدا بیٹی، اور کون ہے!''

☆☆☆

راحتاں کو اس کے باپ کے ذریعے پتہ چلا تھا کہ آج سے کوئی آدھی صدی اُدھر کی بات ہے، گاؤں کا ایک نوجوان پٹواری مائی تاجو کو یہاں لے آیا تھا۔ کہتے ہیں مائی تاجو اُن دنوں اتنی خوبصورت تھی کہ اگر وہ بادشاہوں کا زمانہ ہوتا تو مائی ملکہ ہوتی۔ اُس کے حسن کا چرچا پھیلا تو اس گاؤں سے نکل کر پٹواری کے آبائی گاؤں تک جا پہنچا جہاں سے اس کی پہلی بیوی اپنے دو بچوں کے ساتھ یہاں آدھمکی۔ پٹواری نے مائی تاجو کو دھوکا دیا تھا کہ وہ کنوارا ہے۔ تاجو نے اپنے باپ کی

مرضی کے خلاف رو پیٹ کر اور نہر میں کود جانے کی دھمکی دے کر شادی کی تھی۔ اوپر سے پہلی بیوی نے جب اپنا سینہ دوہتڑوں سے پیٹنا شروع کیا اور ہر دو ہتڑ پر تاجو کو ایک گندی بساندی گالی تھمادی تو تاجو چکنا چور ہوکر یہاں سے بھاگی اور اپنے گاؤں میں جا کر دم لیا۔ ماں نے تو اسے لپٹا لیا مگر باپ آیا تو اسے بازو سے پکڑ کر باہر صحن میں لے گیا اور بولا ''چاہے پٹواری کی تین بیویاں اور ہوں، تمھیں اُسی کے ساتھ زندگی گزارنی ہے۔ تم نے اپنی مرضی کی شادی کی ہے، ہمارے لیے یہی بے عزتی بہت ہے۔ اب یہاں بیٹھنا ہے تو طلاق لے کر آؤ ورنہ وہیں رہو چاہے نوکرانی بن کر رہو۔ ہمارے لیے تو تم اُسی دن مرگئی تھیں جب تم نے پوری برادری کی عورتوں کے سامنے چھوکروں کی طرح اکڑ کر کہہ دیا تھا کہ شادی کروں گی تو پٹواری سے کروں گی ورنہ کنواری مروں گی۔ جاؤ ہم یہی سمجھیں گے کہ ہمارے ہاں کوئی اولاد ہی نہیں تھی۔''

اس کی ماں روتی پیٹتی رہی مگر باپ نے ایک نہ مانی اور جب تاجو آدھی رات کو واپس اس گاؤں میں پہنچ کر پٹواری کے دروازے پر آئی تو اس میں تالا پڑا ہوا تھا۔ رات وہیں دروازے سے لگی بیٹھی رہی۔ صبح لوگوں نے اسے دیکھا تو پنچائت نے فیصلہ کیا کہ تاجو پٹواری کی باقاعدہ منکوحہ ہے اس لیے اس کا پٹواری کے گھر پر حق ہے اور اس لیے تالا توڑ دو۔

گاؤں والوں نے چند روز تک تو پٹواری کا انتظار کیا مگر اس کی جگہ ایک نیا پٹواری آگیا۔ معلوم ہوا کہ اس نے کسی اور گاؤں میں تبادلہ کرالیا ہے۔ گاؤں کے دو آدمی اسے ڈھونڈنے نکلے۔ اور جب وہ مل گیا تو پٹواری نے انھیں بتایا کہ اس نے ان کے گاؤں کا رخ کیا تو اس کی پہلی بیوی کے چھ فٹے بھائی اسے قتل کر دیں گے۔ ''میں نے یہ بات اپنی پہلی بیوی کو بھی نہیں بتائی کہ میں تمھارے گاؤں کے جس مکان میں رہتا تھا وہ میں نے خرید لیا تھا اور وہ میری ملکیت ہے۔ یہ مکان میں اپنی دوسری بیوی تاجو کے نام لکھ دیتا ہوں۔ میں اسے طلاق نہیں دوں گا۔ مجھے اس سے محبت ہے۔'' یہ کہہ کر وہ رونے لگا تھا۔

سو گاؤں والوں کی مہربانی سے پٹواری نے اسے طلاق کے بدلے مکان دے دیا اور وہ بھی صبر شکر کر کے بیٹھ گئی کیونکہ اس کے پیٹ میں بچہ تھا۔ یہ بچہ جب پیدا ہوا تو اس کا نام اس نے حسن دین رکھا۔ محنت مزدوری کر کے اسے پالتی پوستی رہی۔ مڈل تک پڑھایا بھی مگر اس کے بعد ہمت نہ رہی۔ تاجو کے حسن کی وجہ سے اس پر ترس تو سب کو آتا تھا مگر پٹواری سے جدا ہونے کے بعد وہ اپنی جوانی پر سانپ بن کر بیٹھ گئی تھی۔ ایک بھلے آدمی نے حسن دین کو اعلیٰ تعلیم دلوانے کا لالچ دے کر تاجو سے عقد کرنے کی خواہش ظاہر کی تو تاجو نے اس کی سات پشتوں کو تُوم ڈالا اور حسن دین کلہاڑی لے کر اس خدا ترس کے پیچھے پڑ گیا۔ اس کے بعد کسی کو کچھ کہنے کا حوصلہ نہیں ہوا۔ حسن دین چند برس آوارہ پھرتا رہا۔ پھر جب اس کے عشق کرنے کا زمانہ آیا تو وہ فوج میں بھرتی ہوگیا۔ اس کے بعد مائی تاجو کے چند برس اچھے گزرے۔ حسن دین حوالداری تک پہنچا۔ اس کے رشتے کی بھی بات ہوئی۔ مگر پھر دوسری جنگ چھڑ گئی اور حسن دین اُدھر بنِ غازی میں مارا گیا۔ تب مائی تاجو نے چکی پیسنی شروع کی اور اس وقت تک پیستی رہی جب وہ ایک دن چکی کے پاٹ پر سر رکھے بے ہوش پائی گئی۔ اس روز جب وہ ہوش میں آئی تھی تو حکیم کے

ہاتھ کو چکی کی ہتھی سمجھ کر گھما دیا تھا۔

اگر اس کے پڑوس میں چودھری فتح دین کی بیٹی راحتاں نہ ہوتی تو وہ اپنی بار بار کی بے ہوشیوں میں سے کسی بے ہوشی کے دوران کوچ کر جاتی۔ وہ راحتاں سے کہا کرتی تھی کہ ''بیٹی اگر میرا حسن دین ہوتا تو میں تجھے تیری شادی پر سونے کا ست لڑا ہار دیتی۔ اسے خدا نے اپنے پاس بلا لیا۔ سو اب میں ہر وقت تیرے لیے دعا کرتی ہوں کہ تو جگ جگ جیے اور شادی کے بعد اسی طرح سکھی رہے جیسی اپنے باپ کے گھر سکھی ہے۔''

☆☆☆

ایک رات مائی تاجو کو اس بات کا غصہ تھا کہ جب اندھیری شام تک راحتاں اس کی روزانہ کی روٹی نہ لائی تو وہ خود ہی لاٹھی ٹیکتی فتح دین کے گھر چلی گئی۔ فتح دین کی بیوی سے راحتاں کا پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ کسی سہیلی کی شادی میں گئی ہے اور آدھی رات تک واپس آئے گی۔ پھر اس نے روٹی مانگی تو راحتاں کی ماں نے صرف اتنا کہا ''دیتی ہوں۔ پہلے گھر والے تو کھالیں۔''

راحتاں کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو فتح دین کے گھر والوں ہی میں شامل سمجھتی تھی۔ اس لیے ضبط نہ کر سکی۔ بولی ''تو بی بی کیا میں بھکارن ہوں؟''

سونے کی بالیوں سے بھرے ہوئے کانوں والی بی بی کو بھی مائی تاجو کی سی مسکین عورت کے منہ سے یہ بات سن کر تکلیف ہوئی۔ اس نے کہا ''نہیں مائی بھکارن تو خیر نہیں ہو مگر محتاج تو ہو نا!''

اور مائی کو کپکپی سی چھوٹ گئی۔ وہ وہاں سے اٹھ کر چلی آئی۔ ایک دو بار راحتاں کی ماں نے اسے پکارا بھی مگر اس کے کانوں میں تو شاں شاں ہو رہی تھی۔ گھر آ کر آنگن میں پڑی ہوئی کھاٹ پر گر پڑی اور روتی رہی۔ اور اپنی موت کو یوں پکارتی رہی جیسے وہ دیوار سے ادھر بیٹھی ہوئی اس کی باتیں سن رہی ہے۔

آدھی رات کو جب چاند زرد پڑ گیا تھا، دیوار سے راحتاں نے اسے پکارا۔

''مائی جاگ رہی ہو؟''

''میں سوتی کب ہوں بیٹی۔'' اس نے کہا۔

''اِدھر آ کر روٹی لے لو دیوار پر سے۔'' راحتاں بولی۔

''نہیں بیٹی! اب نہیں لوں گی۔'' مائی کی آواز بھرانے لگی۔ ''آدمی زندہ رہنے کے لیے کھاتا ہے نا۔ تو میں کب تک زندہ رہوں گی، جب کہ میں جدھر جاتی ہوں میری قبر میرے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ میں کیوں تمھارا اناج ضائع کروں بیٹی۔''

راحتاں دیوار کے پاس کچھ دیر تک خاموش کھڑی رہی۔ پھر پنجوں کے بل ہو کر بڑی منت سے کہا ''لے لو مائی، میری خاطر اسے لے لو۔''

''نہیں بیٹی۔'' مائی اب کھل کر رو رہی تھی۔ ''لے لیتی پر آج تمھاری ماں نے مجھے بتایا کہ میں محتاج ہوں اور چکی پیس پیس کر میرے ہاتھوں میں جو گٹے پڑ گئے ہیں وہ مجھے کچھ اور بتاتے ہیں۔ سو بیٹی! یہ روٹی میں نہیں لوں گی۔ اب کبھی نہیں لوں گی۔ تمھاری لائی ہوئی کل شام والی روٹی میری آخری روٹی تھی۔ یہ روٹی اپنے کتے کے آگے ڈال دو۔''

اس کے بعد اس نے سنا کہ راحتاں اور اس کی ماں کے درمیان کچھ تیز باتیں ہوئیں۔ پھر راحتاں رونے لگی اور ماں اسے ڈانٹنے لگی۔ اس کے بعد فتح دین کی آواز آئی۔

''سونے دو گی یا میں چوپال پر جا کر پڑ رہوں؟''

پھر جب سب خاموش ہو گئے تو مائی تاجو اٹھ

بیٹھی۔ اسے لگا کہ راحتاں اپنے بستر پر پڑی آنسو بہا رہی ہے۔ وہ دیوار تک گئی بھی مگر پھر فتح دین کے ڈر سے پلٹ آئی۔ گھڑے میں سے پانی پیا اور دیر تک ایلومینیم کا کٹورا اپنے چہرے پر پھیرتی رہی۔ آج وہ کتنی تپ رہی تھی اور یہ پیالہ کتنا ٹھنڈا تھا۔ اب گرمیاں ختم سمجھو۔ اسے اپنے لحاف کا خیال آیا جس کی رُوئی لکڑی کی طرح سخت ہوگئی تھی۔ اب کے اسے دُھنواؤں گی۔ پر اللہ کرے اس کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ اللہ کرے اب کے لحاف کے بجائے میں اپنا کفن اوڑھوں۔

وہ گھڑے کے پاس سے اٹھ کر چارپائی پر آ گئی۔ کچھ دیر تک پاؤں لٹکائے بیٹھی رہی۔ پھر اسے ایک لمبی سانس سنائی دی۔ یہ راحتاں کی سانس ہوگی..... ہائے خدا کرے وہ سدا سکھی رہے۔ ایسی پیاری بچی اس نک چڑھی کے ہاں کیسے پیدا ہوگئی! اسے تو میرے ہاں پیدا ہونا چاہیے تھا..... اسے اپنا حسن دین یاد آ گیا اور وہ رونے لگی۔ پھر آنسو پونچھ کر لیٹی تو آسمان پر سے ستارے جیسے نیچے لٹک آئے اور ہوا کے جھونکوں کے ساتھ ہلنے لگے۔ فتح دین کا کتا غرا کر ایک بلی پر جھپٹا اور بلی دیوار پر سے پھاند کر اس کے سامنے سے گولی کی طرح نکل گئی۔ کسی گھر میں مرغے نے بانگ دی اور پھر بانگوں کا مقابلہ شروع ہوگیا۔

یکا یک سب مرغے ایک دم یوں خاموش ہو گئے جیسے ان کے گلے ایک ساتھ گھونٹ دیئے گئے ہیں۔ پورے گاؤں کے کتے بھونکنے لگے۔ پھر مشرق کی طرف سے ایسی آوازیں آئیں جیسے قریب قریب ہر رات آتی تھیں۔ بارڈر پر رینجرز سمگلروں کے تعاقب میں ہوں گے۔ پھر اس پر غنودگی سی چھانے لگی اور اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ پھر ایک دم کھول دیں..... بڑی آئی وہاں سے مجھے محتاج کہنے والی۔ چکی پیستے پیستے ہاتھوں کی جلد ہڈی بن گئی ہے، اور مجھے محتاج کہتی ہے! قیامت کے دن شور مچاؤں گی کہ اسے پکڑو، اس نے مجھ پر بہتان باندھا ہے..... مگر وہاں کہیں یہ میری راحتاں بیچ میں نہ بول پڑے۔

اٹھ کر اس نے پانی پیا اور واپس جا کر چارپائی پر پڑ رہی۔ پھر جب پوپھٹی تو اس کا حلق اس کے جوتے کے چمڑے کی طرح خشک ہو رہا تھا۔ وہ پھر پانی پینے کے لیے اٹھی مگر دوسرے ہی قدم پر چکرا کر گر پڑی۔ سر کھاٹ کے پائے سے ٹکرایا اور بے ہوش ہوگئی۔

☆☆☆

جب مائی تاجو ہوش میں آئی تو اسے پہلا احساس یہ ہوا کہ نماز قضا ہوگئی ہے۔ پھر ایک دم وہ ہڑبڑا کر اٹھی اور دیوار کی طرف بھاگی۔ ہر طرف گولیاں چل رہی تھیں اور عورتیں چیخ رہی تھیں اور بچے بلبلا رہے تھے اور دھوپ میں جیسے سوراخ ہوگئے تھے جن میں سے دھواں خارج ہو رہا تھا۔ دور سے گڑگڑاہٹ اور دھماکوں کی مسلسل آوازیں آرہی تھیں اور گلی میں سے لوگ بھاگتے ہوئے گزر رہے تھے۔

''راحتاں..... اے بیٹی راحتاں!'' وہ پکاری۔

راحتاں اندر کوٹھے سے نکلی۔ اس کا سنہرا رنگ مٹی ہو رہا تھا اور اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ اس کی آواز میں چیخیں اور آنسو اور کپکپی اور نہ جانے کیا کچھ تھا ''جلدی سے نکل جاؤ مائی! گاؤں میں سے نکل جاؤ۔ لاہور کی طرف بھاگو۔ ہم بھی لاہور جا رہے ہیں، تم بھی لاہور چلو۔ ہندوستان کی فوج آ گئی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ پھر اندر بھاگ گئی۔

ہندوستان کی فوج آ گئی ہے! یہاں ہمارے گاؤں

میں کیوں آ گئی ہے۔ بارڈر تو تین میل اُدھر ہے.....!

''یہ فوج یہاں کیوں آئی ہے بیٹی؟'' مائی حیران ہو کر پکاری ''کہیں غلطی سے تو نہیں آ گئی! بھائی فتح دین کہاں ہے؟ اسے بھیجو نا، وہ انھیں سمجھائے کہ یہ پاکستان ہے۔''

مگر راحتاں کا کوئی جواب نہ آیا۔ شور بڑھ رہا تھا۔ مشرق کی طرف کوئی گھر جلنے بھی لگا تھا۔ چند گولیاں اس کے کوٹھے کے دروازے کے اوپر والے حصے میں تڑاخ تڑاخ سے لگیں اور مٹی کی لپائی کے بڑے بڑے ٹکڑے زمین پر آ رہے۔ چند گولیاں ہوا کو چیر دینے والی سیٹیاں بجاتی چھت پر سے گزر گئیں۔ فتح دین کے صحن کی ٹاہلی پر سے پاگلوں کی طرح اڑتا ہوا ایک کوا اچانک ہوا میں لڑھکنیاں کھاتا ہوا آیا اور مائی تاجو کے گھڑے کے پاس پتھر کی طرح گر پڑا۔

پھر زور کا ایک دھماکا ہوا اور مائی جو دیوار سے ہٹ آئی تھی، پھر دیوار کی طرف بڑھی۔ ایک دم چودھری فتح دین کے دروازے کو کسی نے کوٹ ڈالا۔ پھر کواڑ دھڑام سے گرے۔ اکٹھی بہت سی گولیاں چلیں اور اکٹھی بہت سی چیخیں بلند ہوئیں۔ مائی نے ان میں سے راحتاں کی چیخ کو صاف پہچان لیا۔ ''راحتاں بیٹی!'' وہ چلائی۔ لاٹھی ٹیکتی ہوئی لپکی اور اپنے دروازے کی کنڈی کھول کر باہر گلی میں آ گئی۔

گلی میں شہاب دین، نور دین، محمد بشیر، حیدر خاں اور جانے کس کس کی لاشیں پڑی تھیں۔ چودھری فتح دین کے گرے ہوئے دروازے کے پاس مولوی عبدالمجید مردہ پڑے تھے۔ ان کا آدھا چہرہ اڑ گیا تھا۔ مائی نے مولوی صاحب کو ان کی نورانی داڑھی سے پہچانا۔

چودھری فتح دین کے صحن میں خود فتح دین اور اس کے بیٹے مرے پڑے تھے۔ فتح دین کی بیوی کے بالیوں بھرے کان غائب تھے۔ اندر کوٹھوں میں اٹھا پٹخ مچی ہوئی تھی اور باہر راحتاں خوف سے فوجیوں میں گھری اپنی عمر سے چودہ پندرہ سال چھوٹے بچوں کی طرح چیخ رہی تھی۔ پھر ایک سپاہی نے اس کے گریبان میں ہاتھ ڈال کر جھٹکا دیا تو کُرتا پھٹ گیا اور وہ ننگی ہو گئی۔ فوراً ہی وہ گٹھڑی سی بن کر بیٹھ گئی۔ مگر پھر ایک سپاہی نے اس کے کُرتے کا باقی حصہ بھی نوچ لیا اور قہقہے لگاتا ہوا اس سے اپنے جوتے پونچھنے لگا۔ پھر مائی تاجو آئی، راحتاں پر گر پڑی اور ایک عجیب سی آواز میں، جو اس کی اپنی نہ تھی، بولی ''اللہ تیرا پردہ رکھے بیٹی، اللہ تیری حیا قائم رکھے۔''

ایک سپاہی نے مائی کا سفید چونڈا پکڑ کر اسے راحتاں پر سے کھینچنا چاہا تو خون سے اس کا ہاتھ بھیگ گیا اور مائی، وہیں راحتاں کو ڈھانپے ہوئے بولی ''یہ لڑکی تم میں سے کسی کی بہن بیٹی ہوتی تو کیا تم جب بھی اس کے ساتھ یہی کرتے؟ یہ لڑکی تو.....''

کسی نے یہ کہہ کر مائی تاجو کی پسلیوں میں زور کی ٹھوکر ماردی کہ ''ہٹو یہاں سے، ہمیں دیر ہو رہی ہے اور ابھی دوپہر تک ہمیں لاہور پہنچنا ہے۔'' اور مائی یوں ایک طرف لڑھک گئی جیسے چیتھڑوں سے بنی ہوئی گڑیا تھی۔ پھر سب کے ہاتھ راحتاں کی طرف بڑھے جو اب چیخ نہیں رہی تھی۔ اب وہ ننگی کھڑی تھی اور یوں کھڑی تھی جیسے کپڑے پہنے کھڑی ہے۔ اس کا رنگ مائی تاجو کے کفن سے لٹھے کا سا ہو رہا تھا اور اس کی آنکھیں اتنی پھیل گئی تھیں کہ معلوم ہوتا تھا ان میں پتلیاں کبھی تھیں ہی نہیں۔

☆☆☆

مائی تاجو ہوش میں آئی تو اس نے دیکھا کہ اس کے پاس وارث علی موذن کھڑا ہے۔ پھر اس نے ادھر اُدھر دیکھا، لاشوں کے چہرے ڈھپے ہوئے تھے۔

''راتاں کہاں ہے؟'' وہ یوں چیخ کر بولی جیسے اس کے جسم کی دھجیاں اڑ گئی ہیں۔ وارث علی سر جھکائے ایک طرف جانے لگا ''میری راتاں کہاں ہے؟'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور وارث علی کی طرف یوں قدم اٹھایا جیسے اسے قتل کرنے چلی ہے۔ ''کہاں ہے وہ؟''

وارث علی کے پاس آ کر وہ جیسے سُن ہو کر رہ گئی۔ وارث علی کا چہرہ لہولہان ہو رہا تھا اور اس کے بازو پر سے گوشت ایک طرف کٹ کر لٹک رہا تھا۔ وہ بولا تو مائی تاجو نے دیکھا کہ اس کے ہونٹ بھی کٹے ہوئے ہیں اور اس کے منہ میں بھی خون ہے۔

''کسی کو کچھ پتا نہیں مائی کہ کون کہاں گیا۔ بس اب تُو یہاں سے چلی جا۔ ہندوستانی فوج یہاں سے آگے نکل گئی ہے اور گاؤں کے گردان کے آدمی گھیر اڈالے بیٹھے ہیں۔ تو کماد کے کھیتوں میں چھپتی چھپاتی لاہور کی طرف جا سکتی ہے تو چلی جا۔ وہاں مرے گی تو کوئی تیرا جنازہ تو پڑھے گا۔ اب جا مجھے کام کرنے دے۔''

''دیکھ بیٹا!'' مائی بولی ''میں پانی لاتی ہوں، تو ذرا کُلی کر لے۔ تو موذن ہے اور منہ میں اتنا بہت سا خون لیے کھڑا ہے! خون تو حرام ہوتا ہے بیٹا۔''

''میں سب کر لوں گا۔'' وارث علی چلایا مگر پھر ادھر اُدھر دیکھ کر آہستہ سے بولا ''خدا کے لیے مائی، اب چلی جا یہاں سے۔ میں نے اتنے بہت سے لوگ مرتے دیکھے ہیں کہ اب تُو مرے گی تو میں سمجھوں گا پوری دنیا مر گئی۔ چلی جا خدا کے لیے۔''

''پہلے بتا میری راتاں بیٹی کدھر گئی؟'' مائی نے ضد کی۔

وارث علی نے پوچھا ''تجھے یاد ہے نا اسے ننگا کر دیا گیا تھا؟''

''ہاں!'' مائی نے سر ہلایا۔ اور اس کی ایک خون آلود لٹ رسی کی طرح اس کے منہ پر لٹک آئی۔

''تو پھر تُو یہ کیوں پوچھتی ہے کہ وہ کدھر گئی۔''

اور مائی نے اپنے سینے پر اس زور کا دو ہتڑ مارا جیسے چودھری فتح دین کی حویلی کا دروازہ ٹوٹا ہے۔ وہ دھپ سے بیٹھ کر اونچی آواز میں رونے لگی۔

وارث علی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''کسی نے سن لیا تو آ جائے گا۔'' وہ بولا۔ پھر اسے بڑی مشکل سے کھینچ کر اٹھایا۔ ''تُو میری حالت دیکھ رہی ہے مائی۔ میں صرف اپنے خدا کی قدرت اور اپنے ایمان کی طاقت سے زندہ ہوں ورنہ میرے اندر کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ میں گلیوں میں سے لاشیں گھسیٹ گھسیٹ کر ایک گڑھے میں جمع کر رہا ہوں۔ ابھی مجھے فتح دین اور لال دین اور نور الدین اور ماسی جنت کی لاشیں وہاں پہنچانی ہیں۔ پھر میں ان پر مٹی ڈال کر ان کا جنازہ پڑھوں گا اور مر جاؤں گا۔ مائی بے جنازہ نہ مر۔ لاہور چلی جا..... ہندوستانی فوج ادھر سے آ گئی ہے۔ تو ادھر کھیتوں میں چھپتی چھپاتی نکل جا میرے پاس بہت تھوڑا وقت ہے۔ دیکھ لو میرے تو جوتے بھی خون سے بھر گئے ہیں۔''

ٹوٹے ہوئے دروازے پر سے گزرتے ہوئے وہ رک گئی۔ ''وارث بیٹا!'' وہ بولی۔ ''لاہور تُو چلا جا جنازہ میں پڑھ دوں گی۔ میں بچ گئی تو یونہی کسی کو روز ایک روٹی حرام کرنی پڑے گی۔ تُو مر گیا تو تیرے ساتھ اذان بھی مر جائے گی۔''

''نہیں مائی۔'' وارث علی جلدی سے بولا۔ ''اذان

بھی کبھی مری ہے۔ خدا کے لیے اب تُو چلی جا۔''

گلی میں قدم رکھتے ہوئے اس نے پلٹ کر پوچھا ''میرا کیا خیال ہے بیٹا! راتاں کو انھوں نے مار تو نہیں ڈالا ہو گا؟''

وارث علی نے آسمان کی طرف انگلی اٹھا دی اور چودھری فتح دین کی لاش پر جھک گیا۔

مائی تاجو گلی میں سے گزر رہی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ میں لاٹھی تھام رکھی تھی۔ دوسرا ہاتھ پیٹھ پر تھا اور وہ یوں جھکی ہوئی چل رہی تھیں جیسے بھوسے کے ڈھیر میں سے سوئی ڈھونڈنے نکلی ہے۔

مائی تاجو گاؤں کی آخری گلی میں سے نکل کر کھیت میں قدم رکھنے لگی تھی کہ جیسے ہر طرف سے گولیاں چلنے لگیں اور وہ ایک کھالے میں لڑھک کر لیٹ گئی۔ ہائے کہیں وہ وارث علی کو نہ مار رہے ہوں! مگر کیا ایک آدمی کو مارنے کے لیے اتنی بہت سی گولیوں کی ضرورت ہوتی ہے! کھالے میں سے اس نے کھیت کے کئی گنے گولیوں کی زد میں آ کر ٹوٹتے ہوئے دیکھے۔ اس نے یہ تک دیکھا کہ جہاں سے گنا ٹوٹتا ہے وہاں سے رس کی ایک دھار نکل کر جڑ کی طرف بہنے لگتی ہے..... اور اسے راتاں یاد آ گئی اور وہ کھالے میں سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ایک گولا اس کے سر کے پاس سے گزر کر پیچھے ایک درخت کے تنے میں جا لگا اور پورا درخت جیسے جھرجھری لے کر رہ گیا۔ وہ پھر کھالے میں لیٹ گئی اور اسے ایسا لگا کہ وہ مر گئی ہے اور قبر میں پڑی ہے۔ تب اسے اپنا کفن یاد آیا اور وہ اتنی تیزی سے سے کھالے میں سے نکل کر گلی میں داخل ہوئی جیسے اس کے اندر کوئی مشین چلنے لگی ہے۔ اسے پہلی بار یاد آیا کہ وہ تو خالی ہاتھ لاہور جا رہی تھی۔ وہ تو اپنی کمائی گھر ہی میں بھول آئی تھی۔ اس کا کفن تو وہیں بکسے میں رکھا رہ گیا تھا۔ زندگی سے اتنی محبت بھی کیا کہ انسان بچانے کے لیے بھاگے تو اپنا کفن ہی بھول جائے اور یہ کفن اس نے کتنی مشقت سے تیار کیا تھا۔ اور اس پر کتنے چاؤ سے کلمہ شہادت لکھوایا تھا۔ خاکِ پاک سے۔ اچھے کفن اور اچھے جنازے ہی کے لیے تو وہ اب تک زندہ تھی۔

اب وہ اتنی تیزی سے چل رہی تھی کہ جوانی میں بھی یوں نہیں چلی ہو گی۔ اس کے قدم کا خم بھی ایک دم ٹھیک ہو گیا تھا اور لاٹھی کو ٹیکنے کی بجائے اسے تلوار کی طرح اٹھا رکھا تھا۔ راتاں کے گھر کے سامنے سے بھی وہ آگے نکلی چلی گئی، مگر پھر جیسے اس کے قدم جکڑے گئے۔ پلٹی، ٹوٹے ہوئے دروازے میں سے جھانکا۔ وارث علی سب لاشیں سمیٹ لے گیا تھا۔ صرف راتاں کے کُرتے کی ایک دھجی ہوا کے جھونکوں کے ساتھ پورے صحن میں یہاں سے وہاں ایک بے چین روح کی طرح بھٹکتی پھرتی تھی۔

مائی تاجو کا جی چاہا کہ دو ہتڑ مار کا اپنا سینہ ادھیڑ دے مگر ساتھ ہی اسے وارث علی یاد آ گیا جس نے کہا تھا..... فوراً اسے اپنا کفن یاد آیا۔ اس کے کوٹھے کا دروازہ کھلا تھا۔ گھڑے کے پاس کوا اسی طرح پڑا تھا۔ اس کا کھٹولا اسی طرح بچھا تھا۔ اندر اس کا بکسا کھلا پڑا تھا مگر اس میں کفن موجود تھا۔ کیسی منہ کی کھائی ہو گی انھوں نے جب بکسا کھولا ہو گا اور اس میں سے صرف کفن نکلا ہو گا۔

مائی کفن کو سر کی چادر میں چھپا کر باہر آئی تو چوہدری فتح دین کا کتا بھاگتا ہوا آیا اور اس کے قدموں میں لوٹنے لگا۔ اس کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہنس نہیں سکتا ورنہ خوب خوب ہنستا۔

"چل ہٹ۔" مائی نے اسے ڈانٹا۔ "میرے نمازی کپڑے پلید نہ کر۔"

کتا اٹھ کھڑا ہوا۔

مائی نے دوسری گلی میں مڑتے ہوئے پلٹ کر دیکھا تو کتا وہیں کھڑا تھا اور اس طرح کھڑا تھا جیسے لکڑی کا بن کر رہ گیا ہے۔ "چچ چچ" مائی نے کتے کو اپنی طرف بلانا چاہا مگر وہ پلٹا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا ایک دیوار کے سائے میں ایک دم یوں بیٹھ گیا جیسے گر پڑا ہے۔ "ہائے بے چارہ۔" مائی کا احساس جرم پکارا۔

مگر پھر اوپر فضا میں اس زور کے دو دھماکے ہوئے کہ مائی تاجو کو زمین اپنے قدموں تلے ٹکڑے ٹکڑے ہوتی محسوس ہوئی۔ تیزی سے چلتی ہوئی وہ پھر سے کھالے میں جا گری۔ اب زمین ہل رہی تھی۔ فضا میں جیسے بہت سے شیر ایک ساتھ دہاڑے جا رہے تھے اور دھماکوں اور گولیوں اور گڑگڑاہٹوں کا شور قریب آتا جا رہا تھا۔ اب وہ کفن کو اپنے سینے سے چمٹائے کھالے میں رینگنے لگی۔ برسوں پہلے چراغوں کا میلہ دیکھنے کے لیے وہ گاؤں کی دوسری عورتوں کے ساتھ اسی کھالے کے کنارے کنارے چلتی ہوئی لاہور چھاؤنی میں جا نکلی تھی۔ اور وہاں کیسا غضب ہوا تھا۔ بے چاری شہابی ایک ٹانگے کے پہیے تلے آ کر وہیں شالا مار کے دروازے پر ہی مر گئی تھی..... تو کیا راتاں مر گئی ہو گی؟ کیا راتاں مرنے کے لائق تھی؟ لا بیٹی! میں تیرے ہاتھ کی روٹی واپس نہیں کروں گی۔ روٹھ مت مجھ سے راتاں..... اے راتاں بیٹی!"

اس نے سنا کہ وہ اونچی اونچی بول رہی ہے..... مگر اتنے شور میں اس کی آواز کون سنے گا..... "راتاں!" ..... اے میری اچھی، میری نیک، میری خوبصورت راتاں!"

ہائے یہ کپاس بھی عجیب پودا ہے۔ اس کے پھول کا رنگ کیسا الگ ہوتا ہے دوسرے پھولوں سے۔

"راتاں! اے راتاں بیٹی!"

کھالے سے کپاس کے کھیت میں اور وہاں سے وہ گنے کے کھیت میں گھس گئی۔ دھماکے اتنے تیز ہو رہے تھے جیسے اس کے اندر ہو رہے ہیں۔ کہتے ہیں گولا لگے تو انسان گولے کی طرح پھٹ جاتا ہے۔ کون چُنتا پھرے گا میری ہڈیاں اور پھر میرا کفن جس پر خاکِ پاک سے کلمہ شہادت لکھا ہے۔

کتنا گھنا ہے گنے کا یہ کھیت! یہ چودھری فتح دین کا کھیت ہے۔ راتاں اسی کھیت کے گنے چوس چوس کر کہتی تھی کہ مائی مجھے بڑھاپے سے صرف اس لیے ڈر لگتا ہے کہ منہ پوپلا ہو جاتا ہے اور گنا نہیں چوسا جا سکتا۔

مائی تاجو مسکرائی اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے..... "راتاں بیٹی!..... اے میری راتاں بیٹی!"

☆☆☆

"مائی!" آواز جیسے پاتال سے آئی تھی۔

انسان بھی عجیب مخلوق ہے۔ چاہے زمین اور آسمان بج رہے ہوں مگر اس کے کان بجنے سے باز نہیں آتے۔

"مائی!"

ہائے یہ آواز تو جیسے میری پسلی سے آئی ہے۔

وہ کفن کو سینے سے چمٹا کر دبک گئی۔ اس کی انگلیوں نے محسوس کیا کہ اس کا دل اس کے سینے سے نکل کر کفن میں آ گیا اور یوں دھڑک رہا ہے جیسے توپیں چل رہی ہیں۔

■■■

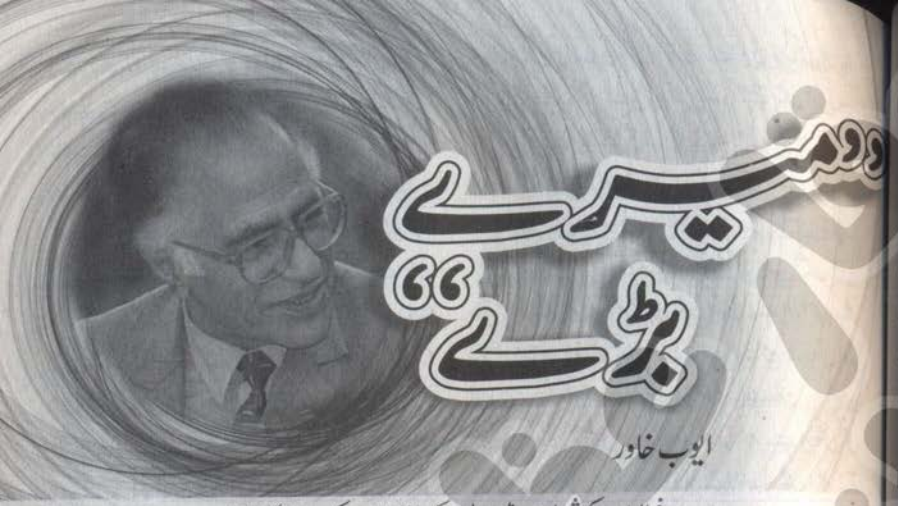

دوسرے بڑے

ایوب خاور

خوابوں کے شہر لاہور میں بسے ایک خاندان کے سربراہ کا ماجرا

ایک اپنا پن تھا جس کے باعث انہوں نے باہم اختلاف رکھنے والوں کو بھی جوڑے رکھا

یہ 10 جولائی 2006ء کی صبح ہے۔ بے آب و تاب، بے رنگ اور کچے امرود جیسے کسیلے ذائقے والی کھردری صبح۔ میری پچھلی کئی صبحیں اسی طرح گزر رہی تھیں۔ ہوا یوں کہ مجھے 6 جولائی کو امریکا روانہ ہونا تھا اور 2 جولائی کی رات کو میرا موبائل، گھڑی، پرس اور بریف کیس گھر کی پارکنگ میں داخل ہوتے ہی 2 نامعلوم افراد چھین کر بھاگ گئے۔ بریف کیس میں پاسپورٹ اور امریکا کا ٹکٹ بھی تھا۔ پلک جھپکنے میں یوں ہوا کہ میں اپنی ساری شناختیں کھو بیٹھا۔

2 جولائی سے میں ایک Absurd شخص کی طرح اپنے آپ سے الجھ رہا تھا کہ آتے جاتے اگر قانون نافذ کرنے والے کسی ادارے کے فرض شناس ملازم نے مجھ سے یہ سوال کر ڈالا کہ میں کون ہوں تو میرے پاس اپنی شناخت کے لیے دکھانے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ یہی الجھاؤ تھا جس نے پچھلے ایک ہفتے کی ساری صبحیں، شامیں گڈمڈ کر دی تھیں۔

جب میری گاڑی پرل کانٹی نینٹل کے سامنے والے سگنل پر رُکی تو میرے فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف علی اکبر عباس تھے جو مجھے جب بھی فون کرتے ہیں تو چھیڑنے والے انداز میں مخاطب ہوتے ہیں، مگر دس جولائی کی صبح ان کے لہجے میں بلا کی سنجیدگی محسوس کر کے میرے دل کی دھڑکن ایک لمحے کو رُکی اور دوسرے لمحے چیخ اُٹھی جب میں نے سنا، وہ کہہ

رہے تھے ''ایوب خان! قاسمی صاحب کا انتقال ہوگیا ہے۔'' ہم نے ایک دوسرے کو تسلی دی۔ بڑی مشکل سے جنگ بلڈنگ کی پارکنگ میں گاڑی پارک کروائی، دوڑا دوڑا آفس پہنچا۔ گلزار صاحب کو فون کیا اور اپنے کو آرڈی نیٹر سے کہا کہ مجھے کسی بھی طرح لاہور پہنچا دو۔ اُس نے بھی کمال کردیا۔ میں بارہ بجے سے پہلے پہلے کراچی ایئرپورٹ پر تھا۔ اس ساری بھاگم دوڑ میں سناٹا اس قدر تھا کہ نظر بھی جیسے معدوم سی ہوگئی۔ ایک شخص جو سیکڑوں ادیبوں، شاعروں، دانشوروں، صحافیوں، کالم نگاروں اور ادبی رسالوں کے مدیروں کا آئیڈیل ہو اور دُنیا بھر میں لاکھوں کروڑوں لوگ اس کے مداح ہوں اور جو پچھلے پچاس برسوں میں ہر نئی آنے والی نسل کے افسانہ نگاروں، شاعروں کے لیے مشعل راہ رہا ہو، اس کے وجود کے یوں اچانک بجھ جانے سے اندھیرا کس قدر گہرا ہوسکتا ہے، اس کا اندازہ مجھے علی اکبر عباس کی آواز سننے سے جہاز میں بیٹھنے تک کے درمیانی عرصے میں ہوا۔ پھر اندھیرے کی اس گہری سیاہ چادر میں یادوں کے کئی جگنو ایک ایک کر کے نکلنے لگے۔

1971ء کا زمانہ ہے۔ سقوطِ ڈھاکا یوں ہمارے اوپر آ کر گرا کہ ہم میں سے ہر ایک کا ایک ایک کاندھا اپنے جوڑوں میں سے نکل کر دریائے کرنافلی کی موجوں کی نذر ہوگیا۔ میں سیکنڈ ائیر کا طالب علم تھا اور کراچی ریڈیو اسٹیشن کے ''بزمِ طلبہ'' پروگرام کا کرتا دھرتا تھا۔ میں نے ایک نظم لکھی اور ''فنون'' کے مدیر کے نام پوسٹ کر دی۔ میرا کوئی ریفرینس تھا نہ کوئی نام، نہ ایسا کوئی کام مگر..... ایک آدھ مہینے کے بعد جب کراچی کے ریگل چوک کے بیچ کتابوں کی ایک دکان پر ''فنون'' کا نیا پرچہ لٹکا ہوا دیکھا (ہم کچھ طالب علم ہمیشہ ریگل چوک کی اُسی دکان سے ادبی رسائل خرید کرتے تھے) تو اسے خریدا۔ پلک جھپکتے میں فہرست آنکھوں کے سامنے تھی۔ اپنا نام دیکھا، نظم کا عنوان دیکھا، صفحہ نمبر اُلٹا اور دس منٹ میں پڑھی جانے والی نظم دس سیکنڈ میں پڑھ لی۔ ریڈیو اسٹیشن کی کینٹین پہنچے۔ اقبال فریدی کو پرچہ دکھایا۔ مجھے ابھی تک یقین نہیں آرہا تھا کہ میری نظم فنون میں چھپی ہے اور احمد ندیم قاسمی صاحب نے چھاپی ہے۔ تب سے میرے دل اور روح نے قاسمی صاحب کو اپنا معنوی باپ مان لیا۔ فنون سے واقفیت تو اس کے جدید غزل نمبر سے ہوچکی تھی جس میں اُنھوں نے 1964ء کے زمانے میں اُبھرتے ہوئے دس پاکستانی نوجوان شعرا کو فنون میں چھاپ کر ان کے ناموں اور اُن کی شاعری کو اعتبار بخشا۔ یہ اور بات ہے کہ بعد میں اُن میں سے کچھ نوجوان اُن سے علیحدہ ہوگئے۔ ان نوجوانوں کی طرح جو خود کفیل ہونے کے احساس سے سرشار ہو کر اپنے ماں باپ سے علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ حقیقت احمد ندیم قاسمی صاحب کے لیے کبھی وجہ ملال نہیں بنی۔ پتوں سے بھری ہوئی شاخوں والے پیڑ کی نسلی مجبوری ہوتی ہے کہ وہ سایہ دے، ہر کسی کو جو بھی اس کی چھاؤں تلے بیٹھ جائے۔ چاہے بیٹھنے والا اس کی چھاؤں کو کاٹنے میں کیوں نہ لگ جائے مگر چھاؤں منافقت کے چہرے چاقوؤں سے کب کٹتی ہے۔

اُنھوں نے اپنی زندگی کا بہت سارا حصہ نوجوان نسل کو بنانے میں صَرف کیا۔ مجھے فخر ہے کہ میں بھی اُنھی میں سے ایک ہوں۔ اقبال فریدی بھی انھی میں سے تھا۔ ابھی چند سال پہلے تک وہ اس کا مجھ سے پوچھتے تھے کہ وہ لڑکا مختلف لکھتا تھا، شاعری چھوڑ کر

کیا اُس نے۔

طالب علمی کے زمانے میں کراچی کے جن نوجوانوں سے وہ بہت پیار کرتے تھے، اُن میں میرے علاوہ خاص طور پر ثروت حسین، پروین شاکر اور جمال احسانی تھے، تینوں اب اس دُنیا میں نہیں۔

جب میں نے ٹیلی ویژن جوائن کیا تو خاص طور پر لاہور آیا۔ لاہور مجھے ہمیشہ خوابوں کا شہر لگتا تھا۔ آپ خود سوچیے جس شہر میں احمد ندیم قاسمی، فیض احمد فیض، منیر نیازی، ڈاکٹر نذیر احمد، صوفی تبسم، اشفاق احمد اور بانو قدسیہ، خدیجہ مستور، پروفیسر ڈاکٹر محمد اجمل، اسلم کمال، شعیب ہاشمی، انتظار حسین، اینا مولکا، ڈاکٹر انور سجاد اور اُن جیسے اور بہت سے لوگ ہوں، وہ شہر کتنا ہرا بھرا، کتنا خوبصورت، کتنا گھنا اور سایہ دار ہوگا۔ اور انھیں لوگوں کا سوچتے ہوئے جب میں ٹرین میں اپنے کمپارٹمنٹ کے دروازے پر کھڑا ٹرین کو لاہور اسٹیشن میں داخل ہوتے دیکھ رہا تھا تو خدا کی قسم میری آنکھوں میں آنسو تھے۔ ان تمام لوگوں کے قُرب کے احساس سے میرا گلا رُندھ گیا تھا اور سوچیے کہ کچھ دیر بعد جب میں اپنے سامنے کتابوں سے لدی ایک میز کی دوسری طرف احمد ندیم قاسمی کو سگریٹ کے ہلکے ہلکے کش لیتے ہوئے، اُن کو اپنی خیریت معلوم کرتے ہوئے دیکھ اور سُن رہا ہوں گا تو میری کیا کیفیت ہوگی۔

میرا باپ مجھے ملازمت ملنے کی مبارک باد دے رہا تھا۔ خوابوں کا شہر یک لخت میرا اپنا شہر ہوگیا۔ پتا ہی نہیں چلا اور خالد احمد، نجیب احمد، منصورہ احمد، ناہید قاسمی، امجد اسلام امجد، پروین شاکر، عطاء الحق قاسمی ایک ہی خاندان کے ہوگئے جس کے سربراہ احمد ندیم قاسمی ہیں۔ یاد رہے کہ یہ کوئی نظریاتی خاندان ہرگز نہیں تھا۔ بس ایک اپنا پن تھا جس میں پوری طرح ایک دوسرے سے اختلاف کرنے کی گنجائش بھی تھی۔ برسوں اس خاندان کو اُنھوں نے جوڑے رکھا۔ مجھے فخر ہے کہ احمد ندیم قاسمی میرے گھر کی ہر چھوٹی بڑی تقریب میں میرے گھر کے ''بڑے'' کی حیثیت سے موجود رہے ہیں۔

پھر اس خاندان میں ایک اور فرد کا اضافہ ہوگیا۔ کچھ پندرہ سولہ برس پہلے گلزار صاحب اس خاندان کا حصہ بنے اور خاندان کے سربراہ نے اپنی ذاتی حیثیت میں اور مدیر فنون کی حیثیت سے بھی گلزار صاحب کو کچھ اس انداز میں گود سے اُٹھا کر محبت بھرے ہاتھوں سے سر سے اوپر تک بلند کیا کہ پاکستان اور بھارت ہی نہیں، دُنیا کے ہر کونے میں جہاں جہاں ''فنون'' پہنچتا ہے، گلزار صاحب اعلیٰ پائے کے افسانہ نگار اور انتہائی منفرد انداز کے شاعر کے طور پر پہچانے جانے لگے۔ یہ فیض بھی قاسمی صاحب کا ہے کہ اُنھوں نے ہماری ہی مٹی کے خمیر کے سوندھے پن کو ہم سے اس طرح ملایا کہ وہ (گلزار) ہماری ذات کا حصہ ہوگئے۔ اب پاکستان میں جتنے شاعر، ادیب گلزار صاحب کے زیر اثر ہیں اور اُن سے محبت کرتے ہیں، وہ دراصل قاسمی صاحب کی انسان دوستی، محبت اور شفقت کی بدولت ہے۔

قاسمی صاحب ایک عظیم انسان ہیں، اُن کی ذاتی زندگی کی ڈکشنری میں مفادات اور غرض مندی جیسے الفاظ کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ وہ کھلے دل کے صاف گو انسان ہیں۔ میں تو کہوں گا کہ وہ ''کپاس کا پھول'' ہیں جو اپنے ''بابا نور'' کی طرح ہر تخلیقی شاعر ادیب پر ''احسان'' کرتے رہے ہیں، جو کبھی کسی کی ٹوہ میں نہیں رہے، نہ اپنا کوئی ''مخبر'' رکھا۔ اُن کے دل میں اُن کے ''پرمیشر سنگھ'' کے دل جیسی دھڑکنیں دھڑکتی

ہیں۔ پتھر جیسے ''سناٹے'' کو توڑنے کے لیے جنھوں نے ہمیشہ منجمد ''تالاب'' کی سطح اپنی تختی کی ضرب سے چٹخائی ہے۔ وہ زندگی میں صرف اپنی ذات کی ''درودیوار'' ہی میں نہیں رہے بلکہ ''محیط'' رہے ہیں، ہر عہد پر اپنی شاعری اور اپنی کہانیوں کے بل بوتے پر۔ ایک سچے اور کھرے صحافی کا چہرہ دیکھنا ہو تو کوئی احمد ندیم قاسمی کا چہرہ دیکھے، جو سورج کی طرح تپاں بھی ہے اور چاند کی طرح اپنی روشنی میں گداز بھی رکھتا ہے۔

میں 1981ء میں لاہور سیٹل ہوا تھا۔ تب سے میں اپنے اس معنوی باپ کا خوب صورت، زندگی سے بھرپور، دل و دماغ کو موہ لینے والا بلکہ ہر اہلِ دل کو اپنا عاشق بنا لینے والا جاذبِ نظر بڑھاپا دیکھ رہا ہوں جو اتنا ہنس مکھ ہے کہ ہمارے سامنے لطیفہ گوئی سے بھی باز نہیں آتا۔ ہم چھوٹے چھوٹے لوگوں میں بڑے بڑے لوگوں کے قصے بانٹ کر وہ ہمارے عمومی رویوں کی تہذیب کرتے رہے ہیں۔

وقت گزرتے پتا ہی نہیں چلتا۔ میں اپنی ملازمت کی وجہ سے زیادہ مصروف رہنے لگا۔ یہ اُسی زمانے کی بات ہے جب مجھے خیال آیا کہ ٹیلی ویژن ڈراما یکسانی کا شکار ہو چکا ہے۔ ڈرامے میں کہانی کے علاوہ سبھی کچھ دیکھا اور دکھایا جانے لگا ہے۔ تب میں نے اُن سے اُن کی کہانیوں پر مبنی ڈراموں کو ایک سیریز ''قاسمی کہانی'' کے نام سے پروڈیوس کرنے کی اجازت مانگی۔ میرے لیے یہ انتہائی فخر کی بات تھی کہ اتنا بڑا افسانہ نگار اپنی کہانیوں پر مبنی اس سیریز کا ہر ڈراما دیکھ کر خوشی کا اظہار کرتا تھا۔ ان کی کہانیوں نے میرے فن کو اعتبار بخشا۔ اُن کے فنون نے میری شاعری کو اعتبار بخشا۔

ابھی دو سال پہلے میں پی ٹی وی چھوڑ کر ''جیو'' میں آ گیا۔ ملاقاتیں کم ہو گئیں۔ وہ زیادہ بیمار رہنے لگے۔ جب کبھی مجلسِ ترقی ادب کے دفتر کا دروازہ کھول کر اندر جاتا تو لگتا جیسے وقت آہستہ آہستہ اُن کی گرفت سے یوں نکل رہا ہے جیسے گوشت اپنی ہڈیوں سے دھیرے دھیرے الگ ہوتا ہے اور مجھے وہ پُروقار وجیہہ اور خوب صورت بزرگ یاد آتا جس کی سالگرہ مناتے وقت ہم دیکھتے تھے کہ پاکستان بھر کے چوٹی کے ادیب شاعر انھیں پھولوں اور محبتوں سے لاد دیا کرتے تھے۔ ایسی ہی ایک سال گرہ پر میں نے اُن کی محبت میں اُن کے لیے ایک نظم لکھی تھی:

خدائے بحر و بر!
اس شرگزیدہ عہد کے نامہرباں اور منحرف لوگوں کے
انبوہِ گراں میں کتنے ایسے لوگ ہیں جن کے قلم سے
روشنائی کے بجائے اُن کے اپنے ہی جگر کا خوں ٹپکتا ہے
رگِ جاں سے نکل کر
کس کا حرفِ معتبر کاغذ کی سطحِ صاف پر ایقان
کی صورت اُترتا ہے، گلِ صد رنگ کی مانند کھلتا
اور مہکتا ہے
سبھی تو ایک گہری چُپ کی بُکل مار کر بیٹھے ہوئے ہیں
مردہ لفظوں کی جگالی کر رہے ہیں، اپنے اپنے
نام کی تختی کو سینوں پر سجائے اونگھتے ہیں
ان کی آنکھیں خواب سے خالی، دلوں کی دھڑکنیں
خوشبو سے عاری اور ہاتھوں کی سبک پوریں
عداوت اور منافق زاد سچائی سے بوجھل ہیں
مگر اِک شخص اُن کے درمیاں ایسا بھی ہے جس نے
ہمیشہ سچ لکھا
سچائی جیسا سچ لکھا
سچائی اور انسانیت کے

پرچم خوش رنگ پر نورِ ہنر سے زندگی اور زندگی
کے مسئلے کاڑھے
کسی دورِ شہنشاہی میں اپنے سر کو
سینے پر جھکایا
اور نہ انبوہِ غلاماں میں کھڑے ہو کر
خود اپنی خاک پھانکی اور نہ اپنے ساتھیوں کی
خاک اُڑائی ہے
وہ خوشبو کی طرح پاکیزہ ہے
وہ خوش ہُنر ہے، خوش نظر ہے اور وہ اہلِ ہنر،
اہلِ نظر کی اس طرح تکریم کرتا ہے کہ جیسے
صبح، بادِ صبح کی تکریم کرتی ہے
خدائے بحر و بر مجھ کو
اِسی اک خوش ہنر اور خوش نظر سچائی کے پیکر کے
قدموں میں جگہ دے دے
میں اس کے پاؤں کی مٹی کو چھونا چاہتا ہوں
اور اس کے ہاتھ کی پوروں میں اُتری سچ کی
بوندوں سے میں اپنی آنکھ کے برتن کو بھرنا
چاہتا ہوں، اس کے لہجے میں دکھوں
کی جو نمی ہے وہ سفالِ دل میں رکھنا چاہتا ہوں
اے خدائے بحر و بر! اس شخص کے خوابوں،
خیالوں اور آدرشوں کی خاطر
اور مستقبل کی ساری آرزوؤں کے لیے میں اپنی
کشتِ جان تک کو وقف کر کے، ایک احساسِ ترفع
سے دہکنا چاہتا ہوں، اے خدائے بحر و بر!
مجھ کو ذرا اس خوش ہنر اور خوش نظر سچائی کے
پیکر کے قدموں میں جگہ دے دے۔

یہ نظم اور ان کے انتقال کا درد مجھے دوپہر کو لاہور ایئرپورٹ سے غالب کالونی کی قتیل شفائی سٹریٹ میں کھنچے ہوئے ایک اُداس شامیانے تک لے گئے۔ خالد، نجیب، امیر حسین، منظر حسین، ناصر نقوی، اعجاز رضوی، امجد اسلام امجد اور غفار (اُن کا ڈرائیور) چلتی پھرتی لاشوں کی طرح مجھ سے ٹکرائے۔ افضل ساحر کی سانس بھی رُکی ہوئی تھی، پتھرائی ہوئی عکس انور جس کے نانا اسلم ملک ہمارے ''بابا'' کے انتہائی قریبی دوستوں میں سے تھے، اپنی خشک آنکھوں سے کبھی اِس کو دیکھتی کبھی اُس کو دیکھتی، مجھے دیکھا تو اور پتھر ہو گئی اور اپنے آپ سے بے خبر لڑھکتی ہوئی اندر چلی گئی جہاں خواتین کے حلقے میں اس عہد کی سب سے بڑی ادبی شخصیت چار پائی پر دراز تھی۔ باہر گلی ایسے صحرا میں ریت ریت لوگ جمع ہو رہے تھے، مختلف چینلوں کے کیمرے آنے والی مٹی کی ہر ڈھیری کو اپنے سامنے کھڑا کرتے، اُن مٹی کی ڈھیریوں میں جو درد و غم کی رسیوں میں کسی ہوئی روحیں تھیں، اُن کی چیخیں ریکارڈ کرتے جاتے۔ اسی ہجوم بے جان و بے امان میں بھائی افتخار عارف اور فتح محمد ملک بھی نظر آئے جن کی زبانوں سے آنسوؤں کی طرح ٹپکتے ہوئے لفظ کیمروں نے اپنے اپنے لینس میں جذب کیے۔

جنازہ اُٹھا تو لگا جی جہان سے اُٹھ گیا ہو۔

''کپاس کا پھول'' لحد میں اُتارا جا رہا تھا اور ہمارے دوست اور ہر دل عزیز ادیب مستنصر حسین تارڑ ایک ٹی وی چینل کے کیمرے سے کہہ رہے تھے ''احمد ندیم قاسمی صاحب کے بارے میں یہ کہنا کہ اُن کے جانے سے ادب کی دُنیا میں ایک خلا پیدا ہو گیا ہے، بے معنی اور Absurd بات ہے۔''

کیونکہ ندیم تو موجود ہے۔ بقول ندیم:

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہوں، سمندر میں اُتر جاؤں گا

قاسمی صاحب

ڈاکٹر خورشید رضوی

3 جولائی 2006ء کی اُس ملاقات کا تصور آج بھی میرے ذہن میں جوں کا توں ہے۔ وہ کمرہ آج بھی ویسا ہی ہے اور قاسمی صاحب اپنی نشست پر اُسی طرح بیٹھے ہیں۔ ضعفِ پیری کے باجود شگفتہ حاضر دماغ۔ اُس روز بھی وہ ہمیشہ کی طرح، مجھے دیکھ کر مسکرائے اور اُٹھ کر مصافحہ کیا۔ بہت دن کے بعد ملاقات ہوئی تھی، ایک دوسرے کا حال احوال پوچھا گیا۔ میں نے بتایا کہ میں آٹھ تاریخ کو کراچی جارہا ہوں، گیارہ کی صبح کو وہاں سے جدّہ روانگی ہے اور پھر وہاں سے انگلستان کا قصد ہے۔ واپس آتے آتے کوئی ڈھائی مہینے لگ جائیں گے، اس لیے سلام کو حاضر ہوا ہوں۔ اُنھوں نے بتایا کہ صحت کے نشیب و فراز اب بہت غیر یقینی سے ہوگئے ہیں۔ کسی بھی وقت اچانک ہسپتال جانا پڑ جاتا ہے۔ سانس کی آمد و شد بحال ہوجاتی ہے تو واپس آجاتا ہوں۔ خیر آج تو بالکل ٹھیک ہوں...... اس آخری جملے میں وہ پرانے قاسمی صاحب لوٹ آئے جو ہمیشہ یہی کہتے تھے کہ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میرے ایک دوست کا کہنا ہے کہ ''بور'' اس شخص کو کہتے ہیں کہ جب اُس سے حال احوال پوچھا جائے تو سچ مچ حال سنانا شروع کردے۔ قاسمی صاحب کا موٹو بھی غالباً یہی تھا۔ گزشتہ چالیس برس کے عرصے میں بارہا اُن سے ملنے، اُن کی محفل میں بیٹھنے، اُن کی باتیں سننے، خود اُن کا حال دریافت کرنے اور دوسروں کو دریافت کرتے دیکھنے کا موقع ملا۔ اُن کا جچا تُلا، فوری اور دوٹوک جواب یہی ہوتا تھا کہ ''میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' اُس زمانے میں بھی جب وہ دردِ گردہ کے شدید دوروں سے اکثر بے حال رہتے تھے اور پھر اُس مرحلے پر بھی جب وہ گردے کے آپریشن

کے عمل سے گزرے بلکہ اب سے پانچ سات برس پہلے تک بھی جب عورضِ پیری نے انھیں گھر لیا تھا، اُن کے اس فیصلہ کُن جواب میں تردّد کی ہلکی سی لرزش بھی نہیں پائی جاتی تھی۔ آخر آخر میں البتہ اتنا فرق آگیا تھا کہ جب صحت کے بارے میں پوچھا جاتا تو کہتے، ''بس جیسی اس عمر میں ہونی چاہیے۔ الحمدللہ میں ٹھیک ہوں۔'' یعنی دوسرے ہی جملے میں وہ پہلے جملے کا جھول نکال دیتے تھے۔ پھر کچھ اور فرق آیا تو جواب کچھ یوں آنے لگا کہ ''گزارہ ہورہا ہے۔ یہ تنفس کی تکلیف کچھ پریشان کرنے لگی ہے۔'' اسکے باوجود جب تک اس قابل رہے کہ مشاعروں میں آسکیں، وہ شروع سے آخر تک آلتی پالتی مارے، بغیر ٹیک لگائے، سیدھے بیٹھے رہتے تھے۔ اُٹھتے ہوئے کسی کا سہارا لینا بھی پسند نہ تھا۔ پھر جب ضعف نے قوت پکڑی تو اُنھوں نے مشاعروں اور محفلوں میں آمدورفت بہت کم کردی۔ پھر بھی بعض مواقع پر، تمام مشکلات کے باوجود تشریف لاتے رہے۔ زلزلے کے بعد پہلی عید کے موقع پر ایک ٹی وی چینل نے الحمرا میں مشاعرے کا اہتمام کیا تو اس میں شریک ہوئے اور بہ پاس وضع، سب کے ساتھ فرشی نشست اختیار کی۔ مگر آخر میں اُٹھتے ہوئے انھیں میرا سہارا لینا پڑا تو میں نے دیکھا کہ اب اُن کا جسم کسی حد تک اُن کی گرفت سے نکل چکا ہے۔ واپسی پر ہال سے نکلے تو ذرا ہی دُور جا کر پھر دم لینے کے لیے کرسی پر بیٹھنا پڑا۔

یہاں میرا خیال اُڑ کر 1960ء دہائی کے اُن ایام میں جا پہنچتا ہے جب مَیں نے قاسمی صاحب کو ایک خوبصورت دھاری دار کوٹ پہنے، وولنر ہاسٹل میں مظہر محمود شیرانی کے کمرے کی چق اُٹھا کر جاتے اور نکلتے دیکھا تھا۔ کیسا مضبوط چھریرا بدن تھا اور اس وقت اُن کے پاؤں زمین پر کیسی پختہ گرفت رکھتے تھے، یوں جیسے لوہا مقناطیس سے پیوست ہو۔ اُس زمانے کے مشاعروں میں ان کا کلام سننا اور اُن کے اشعار کا حافظے میں جم جانا بھی یاد آیا:

یاد آئے ترے پیکر کے خطوط
اپنی کوتاہیِ فن یاد آئی
جب ترا حکم ملا، ترکِ محبت کر دی
دل مگر اس پہ وہ دھڑکا کہ قیامت کردی
تُو نے جا کر تو جدائی مری قسمت کر دی
نارسائی کی قسم اتنا سمجھ میں آیا
حسن جب ہاتھ نہ آیا تو خدا کہلایا

اب جو یہ شعر یاد آتے ہیں تو خود قاسمی صاحب کے لہجے کی وہ دل آویز تھکن یاد آتی ہے جو اُن کے تحت اللفظ پڑھنے کی دل نشیں انداز میں ہمیشہ موجود رہی۔ ہاں آخری زمانے میں، پیرانہ سالی نے اس کی گمبھیرتا میں کچھ کمی کرکے اُس کی جگہ ایک خفیف سی لرزش کا اضافہ کردیا تھا۔ یادوں کے اس ہجوم میں، مختلف مناظر، ابر پاروں کی طرح تیرتے ہوئے چلے آرہے ہیں۔ لیجیے حلقہ اربابِ ذوق کی طرف سے شائع کیا ہوا 1946ء کی بہترین نظموں کا وہ انتخاب کس وضاحت سے سامنے آگیا ہے جو میں نے غالباً کسی کہنہ فروش سے خریدا تھا۔ قاسمی صاحب کی دو نظمیں ''ترکِ محبت کے بعد'' اور ''دائرہ'' اس میں شامل تھیں۔ یونیورسٹی کی طالب علمی کے زمانے میں یہ دونوں نظمیں مجھے بہت اسپائر کرتی رہیں۔ پہلی نظم کا اختتام جن دو شعروں پر ہوتا تھا وہ اب بھی ذہن میں گونجتے ہیں:

دونوں چہروں پہ شفق، دونوں جبینوں پہ عرق
دونوں سینوں میں دھڑکتے ہوئے ہیجان کی یاد

'کون ہیں آپ؟' 'مری زیست کے تنہا ساتھی'
پہلی ہیجان کی یاد، آخری پیمان کی یاد

اور ''دائرہ'' تو اب تک پوری کی پوری مجھے یاد ہے:

شبنم کے زمردیں ستارے
سبزے کی ردا پہ جم گئے ہیں
براق، سماق رنگ بادل
مبہوت خلا میں تھم گئے ہیں
پربت کی سفید رفعتوں پر
پورب نے شفق نچوڑ ڈالی
زرکا سبک افق کہاں ہے
تیروں نے کمان توڑ ڈالی
پھولوں میں بھی رقص رچ گیا ہے
پتوں میں بھی رم سما گیا ہے
کروٹ ہے، تڑپ ہے، بے کلی ہے
سیلابِ حیات آگیا ہے
مرکز سے لپٹ کے سائے رینگے
پُورب سے شفق کی بھیک لینے
اس درجہ بڑھا جمالِ خورشید
ہر پھول جھکا خراج دینے
پچھم میں پگھل رہا ہے سونا
سونے میں لہو کی دھار دوڑی
وہ ایک حسینہ سیہ پوش
آشفتہ و بے قرار دوڑی
دھرتی گرے گی نیند بن کر
سنبھلے گی تو جگمگا اُٹھیں گے
شبنم کے زمردیں ستارے

اب سرگودھا کی میونسپل غالب لائبریری کا وہ منظر نگاہ میں پھر رہا ہے کہ جب ایک ادبی تقریب میں قاسمی صاحب تشریف لائے تھے اور میں نے ان سے پوچھا تھا کہ کیا اُن کا یہ شعر نعتیہ ہے (جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال تھا):

جہاں پناہ! مجھے بازوؤں میں لے لیجیے
مری تلاش میں ہیں گردشیں زمانے کی

اور اُنھوں نے وضاحت کی تھی کہ نہیں یہ غزل کا شعر ہے۔ فیصل آباد..... اُس وقت کے لائل پور..... کا وہ مشاعرہ یاد آرہا ہے، جس میں صوفی تبسّم، احسان دانش اور بعض اور اکابر بھی شریک تھے جواب خواب و خیال ہو چکے ہیں۔ میرے برابر کی کرسی پر بیٹھے قاسمی صاحب نے اچانک کمال نرمی و شفقت سمیرے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے فرمایا: ''آپ کی کتاب، ''شاخِ تنہا'' پر فنون میں اب تک تبصرہ شائع نہیں ہوسکا، میرے ذہن پر اس کا بوجھ ہے۔'' قاسمی صاحب نے ازراہِ کرم ''شاخِ تنہا'' کا فلیپ بھی لکھا تھا، مگر اس وقت تک میرے اور اُن کے مابین بس ایک واجبی اور رسمی سا تعلق تھا۔ چنانچہ اُن کا یہ التفات میرے لیے ایک خوشگوار حیرت کا باعث ہوا۔ مگر یہ قاسمی صاحب کا مستقل شیوہ تھا۔ کوئی شخص، کتنا ہی گمنام، کہیں بھی بیٹھا ہوا، اگر چہ کچھ لکھ رہا ہے جو اُن کی نظر میں کسی قابل ہے تو پھر اُس شخص کے لیے ان کے ذہن میں ایک گوشہ مخصوص ہوجاتا تھا۔ قاسمی صاحب نے خود اپنے قلم سے ادب کی جتنی خدمت کی اُتنی ہی خدمت نئے قلم تھامنے والوں کی حوصلہ افزائی سے کی۔ وہ جہاں بعض بارسوخ لوگوں کی تحریریں 'فنون' میں شائع کرنے سے صاف معذرت کے لیتے تھے کیونکہ وہ اُن کی نگاہ میں معیاری نہیں ہوتی تھیں، وہیں وہ کسی دُور اُفتادہ، خاک نشین کی تحریر کو اہمیت دیتے ہوئے خود پہل کر کے اُسے 'فنون' کے لیے لکھنے کی دعوت دینے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے تھے۔ 'فنون' کے صفحات میں کود میری شمولیت کا آغاز اسی طرح ہوا۔ سرگودھا کے جناح ہال میں ایک مشاعرہ ہوا جس میں مَیں نے بھی شمولیت کی۔ قاسمی صاحب کا کلام سُنا اور بس دُور دُور سے انھیں دیکھا۔ چند ہی روز بعد اُن کا خط ملا جس کا مضمون یہ تھا کہ آپ کی ایک نظم ''دُعائے نیم سنگ'' کسی کی معرفت مجھ تک پہنچی۔ مَیں اُس وقت سے رابطے کا خواہاں ہوں مگر پتا معلوم نہ تھا۔ اب سرگودھا کے مشاعرے میں آپ کا نام پکارا گیا تو مَیں نے پتا معلوم کیا اور یہ خط لکھ رہا ہوں۔ اگر یہ نظم

آپ ہی کی ہے تو کیا آپ 'فنون' میں شائع کرنے کی اجازت دیتے ہیں؟ ظاہر ہے مجھے بے حد خوشی ہوئی اور اُس کے بعد سے 'فنون' میں لکھنے سلسلہ جاری ہوگیا۔ کچھ عرصہ قبل قاسمی صاحب نے میرے بیٹے عاصم کے نام، اُس کی نظموں پر حوصلہ افزائی کا ایسا ہی خط لکھا اور پھر اُس کی متعدد نظمیں ''فنون'' میں شامل کیں۔ قاسمی صاحب نے اُس کے مجموعے کے لیے فلیپ بھی لکھا۔ اس طرح کی بہت سی مثالیں سامنے رکھ کر اگر حساب لگایا جائے تو معلوم ہوگا کہ اُنھوں نے تین اور چار نسلوں کے نئے لکھنے والوں کو بساطِ ادب پر اعتماد سے قدم رکھنے کا حوصلہ دیا۔

ایک اور تصویر تیرتی ہوئی آتی ہے۔ ڈیرہ غازی خاں کے ایک بڑے مشاعرے میں شرکت کے لیے شاعروں سے بھری ہوئی ایک ویگن دریا کے خشک پاٹ سے گذر رہی ہے۔ مَیں بھی اس میں قاسمی صاحب، منیر نیازی، شہزاد احمد، قتیل شفائی، غلام جیلانی اصغر وغیرہ کے ہمراہ سوار ہوں۔ قاسمی صاحب اس لق و دق ریتلے راستے سے گزرتے ہوئے فرماتے ہیں ''مَیں سوچ رہا ہوں کہ ہم اس ویرانے میں جا تو رہے ہیں، واپس کیسے آئیں گے؟'' اس پر شہزاد احمد برجستہ جواب دیتے ہیں: ''اور یہ ڈیرہ غازی خاں آباد کیسے ہوا ہے؟'' قہقہہ پڑتا ہے اور ویرانے میں ایک بہاریں کیفیت پھیل جاتی ہے۔

اور بھی بہت سی تصویریں اُمڈی چلی آتی ہیں، جنھیں زنجیر کرنا اس ایک تحریر میں ممکن نہیں۔ ہر تصویر گویا ایک متنوع اور دل کش شخصیت کی ایک قاش مہیا کرتی ہے اور ان قاشوں سے جُڑ کر ایک بڑی تصویر بنتی ہے جو ذہانت، تخلیقیت، محنت، دیانت، انسانیت، رواداری، ہمدردی، بذلہ سنجی اور رجائیت کے آمیزے سے عبارت ہے۔

قاسمی صاحب ایک انتھک انسان تھے۔ وہ آخری زمانے تک دن بھر محنت میں لگے رہتے۔ وقت کی تنظیم (Time management) کا اُن میں ایک فطری ملکہ تھا۔ وہ مصروف نظر آئے بغیر مصروف رہ سکتے تھے اور سلیقے سے نافذ کرتی رہتی تھی جس کے تحت پرندہ تھوڑے وقفے سے اپنے پنکھ سنوارتا رہتا ہے۔ میں نے کئی بار دیکھا کہ لطیفوں اور خوش گپیوں کے عین درمیان جہاں اہلِ محفل ذرا دیر کو باہمی مکالمے میں مصروف ہوئے قاسمی صاحب نے اسی طائرانہ جبلت کے ساتھ میز پر بکھری ہوئی چیزوں کو ترتیب دے لیا۔ ڈاک پر ایک نظر ڈال لی۔ اُس کی صف بندی کرلی اور شاید ایک آدھ کا مختصر سا جواب بھی لکھ ڈالا۔

خطوط کا جواب دینے میں قاسمی صاحب پرانی وضعداری کا ایک نمونہ تھے۔ برجستہ مکتوب نگاری اُن کی طبیعت کا جزو بن چکی تھی۔ اُن کے خطوط میں مطلب کو سادہ اور دوٹوک انداز میں بیان کرنے کی مہارت مزاح کی شگفتگی اور جابجا کوندے کی طرح لپک جانے والے تخلیقی جملے ہوتے تھے۔ سلیم بے تاب مرحوم کی حادثاتی موت پر میں نے ایک نوحہ کہا اور 'فنون' کے لیے بھیجا مگر وہ اس شمارے میں درج نہ ہوسکا۔ میں نے قاسمی صاحب کو دوبارہ اس کی نقل بھیجی تو اُنھوں نے لکھا کہ افسوس ہے اتنا موثر نوحہ پہلے کیوں وصول نہ ہوا۔ ایسا نوحہ پڑھ کر تو مرنے کو جی چاہنے لگتا ہے۔ جس زمانے میں مَیں ڈیپوٹیشن پر اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد کے ادارہ تحقیقاتِ اسلامی میں کام کررہا تھا۔ قاسمی صاحب کا خط آیا کہ بہت دن سے آپ کی کوئی غزل 'فنون' کے لیے وصول نہیں ہوئی۔ میرے ایک رفیقِ کار علی رضا نقوی، ادارۂ تحقیقات کو از رہِ تفنن 'فقہ کا صحرائے اعظم' کہا کرتے تھے۔ میں نے قاسمی صاحب کو ایک غزل بھیجی اور خط میں لکھا کہ میں تو ایک مدت سے فقہ کے صحرائے اعظم میں ہوں، غزلیں کہاں سے لاؤں۔

اس مطلب کے اظہار کے لیے ایک شعر بھی موزوں ہوگیا:

وہی خورشید جو دشتِ سخن کا ایک آہو تھا
وہی اک اونٹ ہے اب فقہ کے صحرائے اعظم کا

رسید کے طور پر قاسمی صاحب نے جو جواب لکھا، اُس کا ایک جملہ کچھ یوں تھا کہ آپ کے احوال معلوم ہوئے۔ آپ کے شعر سے بھی لطف اندوز ہوا مگر فقہ کے صحرائے اعظم کا اونٹ بھی بہرحالی ہم سادہ دل مسلمانوں کے لیے واجب الاحترام ہے۔''

قاسمی صاحب کا شعر:

یوں تو سمیٹ شوق سے توشۂ آخرت مگر
وہ جو ہیں زندہ اُن پہ کچھ قرض ہیں زندگی کے بھی

اُن کے شخصی رویّے کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ وہ بڑے زبردست رجائی تھے اور انھیں رحمت الٰہی پر بڑا زبردست اعتماد تھا۔ چنانچہ توشۂ آخرت کی انھیں زیادہ فکر نہ تھی۔ مگر زندگی کے قرض نپٹانے کی اُن میں بڑی تڑپ تھی۔ وہ روئے زمین پر خصوصاً وطنِ عزیز میں جس زندگی کو دیکھنے کے تمنائی تھے اُس کا اظہار اُن کی مشہور نظم میں بھرپور طریقے سے ہوا ہے:

خدا کرے کہ مری ارضِ پاک پر اُترے
وہ فصلِ گل جسے اندیشۂ زوال نہ ہو
یہاں جو پھول کھلے، وہ کھلا رہے صدیوں
یہاں خزاں کو گزرنے کی بھی مجال نہ ہو
یہاں جو سبزہ اُگے، وہ ہمیشہ سبز رہے
اور ایسا سبز کہ جس کی کوئی مثال نہ ہو
گھنی گھٹائیں یہاں ایسی بارشیں برسائیں
کہ پتھروں سے بھی روئیدگی محال نہ ہو
خدا کرے کہ نہ خم ہو سرِ وقارِ وطن
اور اس کے حسن کو تشویش ماہ و سال نہ ہو
ہر ایک فرد ہو تہذیب و فن کا اوجِ کمال
کوئی ملول نہ ہو، کوئی خستہ حال نہ ہو
خدا کرے کہ مرے اِک بھی ہم وطن کے لیے
حیات جرم نہ ہو، زندگی وبال نہ ہو

قاسمی صاحب نے جس زمانے میں ترقی پسند تحریک میں فعال کردار ادا کیا، ترقی پسندی اور مذہب بیزاری لازم و ملزوم سمجھی جاتی تھی۔ مگر قاسمی صاحب نہ تو اپنی مذہبی اور مشرقی اقدار سے دست بردار ہوئے اور نہ ترقی پسند دانش ور کہلانے کی دُھن میں ساغر و مینا کا سہارا لیا۔ قاسمی صاحب کی نعت گوئی اُنکی عمیق مذہبیت کا سراغ دیتی ہے۔ اُن کی وہ مشہور نعت تو معاصر نعت گوئی میں ایک منارۂ نور کی حیثیت رکھتی ہے:

تجھ ﷺ سے پہلے کا جو ماضی تھا، ہزاروں کا سہی
اب جو تا حشر کا فردا ہے وہ تنہا تیرا

برصغیر کی بے شمار ادبی شخصیات کے بے شمار دلچسپ واقعات، دورانِ گفتگو میں، آمدِ شعر کی طرح قاسمی صاحب کے ذہن میں آتے رہتے تھے اور وہ انھیں اپنے مخصوص برجستہ انداز میں سناتے تھے جس کی نقل کرنا ممکن نہیں۔ میرے ایک دوست کا کہنا ہے کہ قاسمی صاحب سے نا ہوا لطیفہ، جس پر بے اختیار ہنسا ہوتا ہوں، جب خود کسی کو سناتا ہوں تو اپنے آپ سے بڑی مایوسی ہوتی ہے۔ حافظ محمود شیرانی، اختر شیرانی، منٹو، فیض، فراق، جوش ملیح آبادی، یوسف ظفر، احسان دانش، عبدالمجید سالک، حکیم نیر واسطی جیسی کتنی شخصیتوں کی شاداب باتیں قاسمی صاحب کے نہایت قوی حافظے میں محفوظ تھیں۔ میں نے کئی بار اُن سے عرض کیا کہ وہ اپنی خودنشست ضرور تحریر کریں کہ یہ برصغیر میں گزشتہ پون صدی کے ادبی منظرنامے کا آئینہ ہوگی لیکن افسوس کہ چند شخصیات پر چھوٹے بڑے مضامین کے علاوہ وہ اس طرف توجہ نہ دے سکے۔ یاد پڑتا ہے کہ ایک بار میں نے اُن سے پوچھا کہ وہ زندگی میں کس شخصیت سے زیادہ متاثر ہوئے تو اُنھوں نے عبدالمجید سالک کا نام لیا۔ انہی کی معیت میں قاسمی صاحب نے علامہ اقبال سے واحد ملاقات کی تھی جس کا حال وہ بڑی دلچسپی سے سنایا کرتے تھے۔

جوش صاحب کے متعدد لطائف قاسمی صاحب سے سنے مثلاً یہ کہ جوش صاحب کے آخری زمانے میں ہم چند دوست اُن سے ملنے گئے۔ تا دیر نشست رہی۔ رخصت ہونے لگے تو جوش صاحب دروازے تک ساتھ آئے اور فرمایا: ''اچھا بھائی! زندگی رہی تو پھر ملاقات ہوگی۔'' مَیں نے ازرہِ شوخی کہا: ''جوش صاحب! کیا اب آپ کو بھی موت کا خیال آنے لگا؟'' جوش صاحب نے برجستہ جواب دیا، ''ہاں بھائی! جب تک خدا زندہ ہے ہم سب کو مرنا ہے۔'' اسی طرح ایک روز یہ واقعہ سنایا کہ جس زمانے میں جوش صاحب ''آج کل'' کے مدیر تھے، الطاف مشہدی صاحب نے..... جو اختر شیرانی کے بعد، ایک رومانی شاعر کے طور پر، نہایت مقبول تھے..... رسالے میں اشاعت کیلیے ایک خط بھیجا۔ وہ اُن دنوں علیل تھے اور اُن کے خط کا اختتام ان الفاظ پر ہوتا تھا۔ ''مرنے والا، الطاف مشہدی۔'' جوش صاحب نے خط شائع کردیا۔ آئندہ شمارے کے لیے پھر ان کا خط آیا جو نہی الفاظ پر ختم ہوتا تھا۔ جوش صاحب نے یہ بھی چھاپ دیا۔ تیسری بار جب خط کا اختتام ''مرنے والا، الطاف مشہدی'' پر ہوا تو جوش صاحب کا پیمانہ صبر لبریز ہوگیا۔ اُنھوں نے خط کو شاملِ اشاعت تو کرلیا مگر آخر میں حاشیے کا نشان لگا کر پاورق میں یہ الفاظ لکھوادیے۔ ''اب مرجھی چکو۔''

تلازماتِ ذہنی کے اس تاروپود میں مجھے راولپنڈی نیشنل سنٹر کی وہ تقریب بھی یاد آرہی ہے جو قاسمی صاحب کے اعزاز میں ہوئی تھی۔ جوش صاحب، پیرانہ سالی کے باوصف، سیڑھیاں چڑھ کر اُوپر آئے تھے اور دو ایک قطعات تقریب کی مناسبت سے موزوں کرکے لائے تھے۔ ایک مصرع مجھے یاد رہ گیا ہے:

اے میاں قاسمی! مبارکباد

رئیس التغزلین، مولانا حسرت موہانی کے بارے میں قاسمی صاحب سنایا کرتے تھے کہ ایک موقع پر لاہور کے وائی۔ایم۔سی۔اے ہال میں گفتگو فرماتے ہوئے مولانا نے غزل کو عارفانہ، عاشقانہ، جیسی اقسام میں تقسیم کیا۔ قاسمی صاحب کہتے تھے کہ میں نے ہال میں سے پکار کر پوچھا ''مولانا! آپ کی غزل کون سی قسم کے ذیل میں آتی ہے؟'' مولانا نے اپنی باریک آواز میں جس کی قاسمی صاحب دلچسپ نقل اُتارتے تھے..... خوب زور دے کر فرمایا، ''فاسقانہ۔''

تین جولائی کی اُس ملاقات میں قاسمی صاحب کے تعلق کی گرمی، محبت کی نرمی اور باتوں کی شگفتگی ہمیشہ کی طرح دل آویز تھی، یگانہ نے کہا تھا:

اتنا تو زندگی کا کوئی حق ادا کرے
دیوانہ وار حال پہ اپنے ہنسا کرے

قاسمی صاحب، یہ حق خوب ادا کرتے تھے۔ خود پر ہنس سکنے کی سکت اُن میں بہت تھی۔ اس روز اُنھوں نے اپنے ثقلِ سماعت کے حوالے سے خوب خوب بذلہ سنجی فرمائی۔ محفل زعفران زار بنی رہی اور بالآخر جب مَیں اذنِ رخصت لینے کے لیے اُٹھا تو مجھے احساس نہ تھا کہ میرے لیے اس مہکار کی یہ آخری لپٹ تھی۔ میں ابھی کراچی ہی میں تھا کہ میرے کزن ارشد نے موبائل پر کسی سے بات کی ''کیا کہا؟ انتقال ہوگیا؟ انا اللہ و انا الیہ راجعون''..... میں اس مکالمے سے لاتعلق، کسی اور خیال میں تھا کہ ارشد نے موبائل بند کرکے کہا ''قاسمی صاحب رخصت ہوگئے۔'' کچھ دیر کو اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا اور پھر جب بحال ہوا تو اس روز کی زعفران کی مہک ہنوز تازہ تھی۔ اچھا ہی ہوا کہ میں اگلی صبح دوڈھائی ماہ کے لیے ملک سے باہر چلا گیا۔ اب آیا ہوں تو وطن عزیز سے وہ ماتمی فضا ختم ہوچکی ہے جس نے سب کو قاسمی صاحب کے چلے جانے کا یقین دلا دیا تھا۔ یہ سانحہ مجھ پر نہیں گزرا۔ میرے تصور میں وہ کمرہ آج بھی ویسا ہی ہے اور قاسمی صاحب اپنی نشست پر اسی طرح بیٹھے ہیں۔

کون گیا کون آیا

نہ جانے سیڑھیوں سے کون اُترا جارہا ہے!
اس کی ہر ہر چاپ میں میلوں کی دُوری ہے!
مجھے محسوس ہوتا ہے
کہ جیسے عالمِ سکرات میں جو سانس آئی تھی
وہ واپس جارہی ہے!

(جنوری 1976ء)

دوام

بکھر تو جاؤں گا لیکن اجڑ نہ جاؤں گا میں
حیات کھوکے، بھری کائنات پاؤں گا میں
جو گھر کھنڈر ہی کھنڈر ہیں، انھیں بساؤں گا میں
جہاں دیے نہیں جلتے، دیے جلاؤں گا میں
بگڑ چکی ہیں بہت عادتیں عناصر کی!
لگائیں بن کے سرِ ریگزار چھاؤں گا میں
تو میرے دیل میں اُترنے کا حوصلہ تو رکھا
یہاں سے عرش کا منظر تجھے دکھاؤں گا میں
گزر ہُوا جو کبھی جلوہ زارِ سینا سے
تو طُور پر کس انسان کو بلاؤں گا میں
چلن خدا کا، مجھ انساں سے نبھ نہ پائے گا
اسے مٹاؤں گا کیسے، جسے بناؤں گا میں

(نومبر 1976ء)

دوام

جو لوگ دشمنِ جاں تھے، وہی سہارے تھے
منافع تھے محبت میں، نے خسارے تھے
یہ عشق تھا، کہ فقط عشق جس کا مسئلہ تھا
اس امتحان میں سجدے، نہ استخارے تھے
جو لوگ ترکِ طلب پر بضد تھے، ان کے لیے
جہاں رُکے تھے سفینے، وہیں کنارے تھے
خود اپنا آپ گنوا کر جنھیں خدا نہ مِلا،
وہ تیرگی کے نہیں، روشنی کے مارے تھے
حضورِ شاہ بس اتنا ہی عرض کرنا ہے
جو اختیار تمھارے تھے، حق ہمارے تھے
یہ ادویات، بہاریں گریز پا نکلیں
گلوں کے ہم نے تو صدقے بہت اُتارے تھے
خدا کرے کہ تری عمر میں گنے جائیں
وہ دن جو ہم نے ترے ہجر میں گزارے تھے
اب اذن ہو تو تری زلف میں پرو دیں پھول
کہ آسمان کے ستارے تو استعارے تھے
قریب آئے تو ہر گل تھا خانہ زنبور
ندیم دور کے منظر تو پیارے پیارے تھے

(دسمبر 1976ء)

آنے والا زمانہ

میں جو کچھ کہوں گا
وہی آنے والا زمانہ کہے گا
کہ یہ آنے والا زمانہ
مرے ماضی وحال کی نسل ہے۔
فرق اتنا سا ہے
آنے والے زمانے میں
جو کچھ بھی ہوگا
مرے حکم سے
میری تائید سے
اور میری حمایت سے ہوگا

(اپریل 1977ء)

دائرے

زخم بھر جاتے ہیں
ذہنوں سے اُتر جاتے ہیں
دن گزرتا ہے تو پھر شب بھی گزر جاتی ہے
پھول جس شاخ سے جھڑ جاتے ہیں
مرجاتے
چند ہی روز میں
اُس شاخ پہ آئندہ کے پھولوں کے نگینے سے اُبھر آتے ہیں
تیرے جانے سے مری ذات کے اندر جو خلا گونجتا ہے
اک نہ اک دن اسے بھر جانا ہے
اک نہ اک روز تجھے
میری پھیلی ہُوئی، ترسی ہُوئی باہوں مے پلٹ آنا ہے!

(جولائی 1978ء)

خاموش رہنے سے کلمہ شریف
کا ذکر۔ درود شریف
اور استغفار پڑھنا بہتر ہے
ہم نیک بنیں نیکی پھیلائیں
ہم انسانیت پسند اچھے مسلمان بنیں

کتاب: ہمارا اسلام قبول کرنا
نومسلم مردوں اور خواتین کے انٹرویوز
مولانا کلیم صدیقی صاحب
منشورات منصورہ۔ لاہور
042-35434909

طالبِ دعا: شیخ محمد عاطف پوری۔ اوکاڑہ

"بکھری بالوں کی وجہ سے جتنے بزرگ نظر آتے تھے، اتنے تھے نہیں"

قاسمی صاحب کی رنگین مزاجی

35 سال پہلے لکھی گئی ایک یادگار تحریر

محبت بھرا ایسا خراج تحسین عطا الحق قاسمی ہی پیش کر سکتے ہیں

عطاالحق قاسمی

ایک خرگوش نے پہلی بار ہاتھی کو دیکھا تو اس پہاڑ ایسی مخلوق کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اس نے حیرت سے آنکھیں ملیں اور پھر پوچھا ''تم کون ہو؟'' ہاتھی نے جواب دیا۔ ''میں ہاتھی ہوں۔'' خرگوش نے ایک پھر اس کے قد وقامت پر نظر ڈالی اور حیران ہوکر پوچھا ''تمھاری عمر کتنی ہے؟'' ہاتھی نے کہا: ''چھ ماہ!'' خرگوش خاموش ہو گیا۔ ہاتھی نے اسے یوں چپ ہوتے دیکھا تو پوچھا ''تمھاری عمر کتنی ہے؟'' اس بار خرگوش نے اپنے جسم کو ٹٹولا اور پھر جھینپتے ہوئے کہا ''عمر تو میری بھی چھ ماہ ہی ہے مگر پچھلے دنوں ذرا بیمار شمار رہا ہوں۔''

سو معاملہ یہ ہے کہ احمد ندیم بھی قاسمی ہیں اور میں بھی قاسمی ہوں اور یہ جو ہم دونوں کے ادبی قد وقامت میں کچھ تھوڑا فرق نظر آتا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ پچھلے دنوں میں بھی ذرا بیمار شمار رہا ہوں۔ دراصل اس نوع کی وضاحت کی ضرورت یوں محسوس ہوئی ہے کہ آج کل دوسروں کی بڑائی کا کھلے بندوں اعتراف کرنے کا کچھ زیادہ رواج نہیں رہا۔ چنانچہ یار لوگ کسی بڑی شخصیت کو یا

تو اپنے ہی جیسا کوتاہ قامت ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور یا پھر خود اونچی ایڑی کے جوتے پہننے لگتے ہیں خواہ ایسا کرنے سے پاؤں میں موچ ہی کیوں نہ آجائے۔ میں بھی انہی ''یارلوگوں'' میں سے ہوں اور یوں میرے لیے بھی اس انسان کی بڑائی کے اعتراف میں خاصی دشواری پیش آرہی ہے جو اپنے حریفوں تک کی عظمت کے اعتراف سے باز نہیں آتا۔ بلکہ پیروں کے خانوادے کا فرد ہونے کی حیثیت سے توانھیں کئی بار نیم جاں لوگوں پر بھی دم درود کرتے پایا گیا ہے۔ جب کہ سائیں منیر نیازی کا کہنا ہے کہ مردوں کو زندہ نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام جن مردوں کو زندہ کرتے تھے، بعد میں وہی ان کے بیری ہوجاتے تھے۔

قاسمی صاحب اپنے کھچڑی بالوں کے باعث جتنے بزرگ نظر آتے ہیں، اتنے ہیں نہیں

آپ انھیں قریب سے دیکھیں تو پتا چلے گا کہ ان میں نہ صرف جوانوں ایسا حسن پایا جاتا ہے بلکہ ان میں بچپن کی معصومیت بھی ابھی تک تروتازہ ہے، بس اتنا ہے کہ جہاں بزرگ بننا ہوتا ہے، بزرگ بن جاتے ہیں۔ جہاں جوان بننا ہوتا ہے جوانوں میں شامل ہوجاتے ہیں اور جب جی چاہتا ہے۔ اپنا بچپن واپس لے آتے ہیں۔ مثلاً کسی دور دراز شہر میں مشاعرہ ہے ہم پانچ چھ مبینہ نوجوان بھی وہاں مدعو ہیں لیکن اسٹیشن پر پہنچ کر جب ٹکٹیں لینے کا موقع آتا ہے تو اس وقت قاسمی صاحب فوراً بزرگ بن بیٹھتے ہیں اور روکنے کے باوجود ٹکٹیں خریدنے کے لیے کھڑکی تک پہنچ جاتے ہیں۔ ٹرین میں سفر کے دوران لطیفوں کا دور شروع ہوتا ہے تو ایسے ''مقوی'' لطیفے سناتے ہیں کہ ''مایوس نوجوان'' بھی اپنے اندر زندگی کی نئی لہر محسوس کرنے لگتے ہیں اور جب وقت گزاری کے لیے تاش کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے تو قاسمی صاحب وہ ''رونديان'' مارتے ہیں کہ اپنا بچپن نظروں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔ ان کی یہ معصومانہ حرکتیں مقام مشاعرہ پر پہنچ کر بھی جاری رہتی ہیں۔ چنانچہ مشاعرے کے اختتام پر وہاں رہائش کے لیے مختص کمرے میں کپڑے تبدیل کرتے وقت وہ ہمیں دکھائی نہ دینے والے ''ڈولے'' پہلوانوں کے انداز میں دکھاتے ہیں اور بچوں کی طرح معصوم ہنسی ہنستے ہیں۔

شاید یہی وجہ ہے کہ اگر انھیں کبھی ہم بھولے سے کہہ دیں کہ آپ ہمارے بزرگ ہیں تو وہ ہاتھ نچا کر کہتے ہیں بزرگ ہوگے تم، بزرگ ہوں گے تمھارے بزرگ، اور وہ ٹھیک ہی کہتے ہیں ان کی بزرگی ہم جوانوں کے لیے قابل رشک ہے۔ وہ روزانہ صبح آٹھ بجے پکی ٹھٹھی میں واقع اپنے مکان سے پتلون کے دونوں پائنچے اوپر اٹھائے نکلتے ہیں، یہ اس لیے کہ پکی ٹھٹھی کی تمام سڑکیں کچی ہیں اور اگر کمزور مثانے والا ایک گھوڑا بھی ادھر سے گزر جائے تو وہاں ہفتوں پانی جمع رہتا ہے۔ قاسمی صاحب چوک میں پہنچ کر تانگے کا انتظار کرتے ہیں اور پھر اس تانگے میں چوبرجی پہنچ کر مجلس ترقی ادب کے دفتر پہنچنے کے لیے رکشے کا انتظار شروع کردیتے ہیں۔ پھر نو بجے سے دو بجے تک وہاں کام کرتے ہیں۔ ڈھائی تین بجے ''فنون'' کے دفتر پہنچتے ہیں اور وہاں ڈیڑھ دو گھنٹے بیٹھتے ہیں وہاں سے اٹھ کر نیلے گنبد کے چوک میں ایک معقول عرصہ رکشے کا انتظار کرنے کے بعد جب شام کو گھر پہنچتے ہیں تو ایک بار پھر لکھنے پڑھنے کے کام میں مشغول ہوجاتے ہیں۔ جس میں نظمیں، غزلیں، افسانے، ڈرامے اور تنقید نگاری کے علاوہ اخبار کا ڈیلی کالم بھی شامل ہے اور یہ سلسلہ رات گئے تک جاری رہتا ہے۔ ان سب کاموں کے ساتھ ساتھ وہ ایسے مشاعروں کی صدارت بھی کرتے ہیں جو بسا اوقات

رات کے نو بجے شروع ہو کر صبح چار بجے محض اس لیے اختتام پذیر ہوجاتے ہیں کہ کوئی ادب دشمن قریبی تھانے میں امن عامہ میں خلل کی رپٹ درج کرا دیتا ہے۔ گھریلو ذمہ داریاں نبھانا اور احباب سے میل ملاقات اس کے علاوہ ہے۔ موضع انگہ تحصیل خوشاب میں اپنے قریبی یا دور کے عزیزوں کے غم اور خوشی میں شرکت کرنے کے لیے پگ اور لاچا پہنے آٹھ دس گھنٹے لاری کے ''پاسے توڑ'' ہچکولے کھانا بھی ان کا روز کا معمول بن چکا ہے یہ سلسلہ غالباً اس لیے چل رہا ہے کہ وہ خود پر کبھی وہ بزرگی طاری نہیں ہونے دیتے جو نوجوانوں کو بھی بُسے ہوئے کریلے جیسا بنا کر رکھ دیتی ہے۔

احمد ندیم قاسمی کے عشق میں مبتلا ہونے کی وجہ ان کی دلکش اور دلربا شخصیت ہی نہیں کچھ اور بھی ہے وہ ایک نظریاتی فنکار ہیں جن کی تخلیقات میں نظریہ اور فن ایک ہوکر سامنے آتے ہیں۔ انھیں پڑھتے ہوئے ذہن کو آسودگی بھی ملتی ہے اور سوچ کے دروازے بھی وا ہوتے ہیں۔ وہ مالشیے شاعر یا افسانہ نگار نہیں ہیں کہ اپنے قاری کو محض چند لمحوں کی آسودگی بخشیں اور پھر تیل کی شیشی جیب میں ڈال کر گھر کو ہولیں۔ وہ اقبال کے سلسلے کی ایک انتہائی اہم کڑی ہیں اور مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ اقبال کے بعد وہ برصغیر پاک و ہند کے سب سے بڑے نظریاتی شاعر ہیں۔ ان کی کومٹ منٹ (Commitment) پہلے دن سے عوام کے ساتھ ہے اور اس ضمن میں انھوں نے بڑی بڑی قربانیاں دی ہیں۔ [illegible] احمد کا کہنا ہے کہ ترقی پسند مقصد دوستی، عوام دوستی اور وطن دوستی کی تثلیث سے وجود میں آتی ہے۔ اس کی یہ بات یقیناً درست ہے مگر میں اس میں ایک شق انسان دوستی کا اضافہ بھی کرنا چاہتا ہوں کیونکہ میرے نزدیک ترقی پسندی کی مکمل اور عملی صورت احمد ندیم قاسمی کی صورت میں ابھرتی ہے اور ندیم صاحب جہاں وطن دوست ہیں، عوام دوست ہیں اور مقصد دوست ہیں وہاں ان کی نظم اور نثر میں دنیا کے سبھی خطوں کے انسانوں کے لیے ایک غیر مشروط محبت بھی جھلکتی ہے کیونکہ وہ انسانوں کو بنیادی طور پر ایک قابل محبت مخلوق تصور کرتے ہیں۔

اور ہاں اس ذکر سے یاد آیا کہ میری عمر اس وقت چونتیس برس ہے چنانچہ محبت کے ضمن میں میرا تیس سالہ تجربہ یہ ہے کہ محبت کرنا آسان ہے۔ محبت کی اداکاری مشکل ہے میں نے احمد ندیم قاسمی کو افسانوں اور شعروں کے علاوہ عام زندگی میں بھی لوگوں سے محبت کرتے دیکھا تو یہ ٹوہ لگانے کی کوشش کی کہ وہ کہیں محبت کی بجائے محبت کی اداکاری تو نہیں کرتے؟ جیسا کہ میں نے ابھی کہا محبت کرنا آسان اور محبت کی اداکاری مشکل ہے۔ کیونکہ محبت میں انسان پہاڑوں کا سینہ چیر دیتا ہے اور اسے یہ کام قلمی آم کاٹنے کے برابر محسوس ہوتا ہے۔ اور میں نے دیکھا کہ ندیم صاحب محبت کرتے ہیں اور یہ ان کی مجبوری ہے۔ کیونکہ ان کی مصروفیات اتنی زیادہ ہیں کہ وہ اداکاری نہیں کرسکتے۔ میں اس فیصلے پر ایک دن میں نہیں پہنچا، بلکہ پے در پے مشاہدات نے میری انگلی پکڑ کر مجھے اس نتیجے پر پہنچا دیا۔ باقی باتیں چھوڑیں میں نے ندیم صاحب کی محبت کا ایک رخ اور بھی دیکھا ہے۔ اس کی اس محبت کا ہدف وہ نئے لکھنے والے بنتے ہیں جن کے تخلیقی جوہر کے ضمن میں ندیم صاحب کو کوئی شبہ نہیں۔ میں نے یہاں ہدف کا لفظ اس لیے استعمال کیا ہے کہ ندیم صاحب لٹھ لے کر ان کے ''دوالے'' ہوجاتے ہیں۔ اور ان سے ہر ماہ ''بنوک شمشیر'' کچھ نہ کچھ لکھوا لیتے ہیں۔ اس واقعہ کی سنگینی کا مزید اندازہ آپ کو اس صورت میں ہوسکتا ہے اگر آپ

کو کسی رسالے کے ایڈیٹر بلکہ ایک بڑے رسالے کے بڑے ایڈیٹر کی انا کا اندازہ ہو اور اس واقعہ کی لذت سے آپ اس صورت میں ہمکنار ہو سکتے ہیں جب یہ ایڈیٹر نہ صرف یہ کہ بقلم خود آپ سے اپنے پرچے کے لیے کوئی چیز مانگے بلکہ دس آدمیوں کی موجودگی میں کچھ اس انداز سے طلب کرے کہ آپ کی اپنی انا پھول کر غبارہ بن جائے۔ تو معاملہ یہ ہے کہ ندیم صاحب نوجوانوں کے ساتھ کچھ ایسا ہی سلوک کرتے ہیں بلکہ کئی بار تو ایسا ہوا ہے کہ ''فنون'' کی کاپیاں پریس جانے کے لیے تیار پڑی ہیں مگر پریس اس لیے نہیں بھجوائی جا رہیں کہ ایک نوجوان کی تازہ تخلیق کا انتظار ہے۔ وہ اپنی مصروفیات کی بنا پر بصد ادب معذرت کرتا ہے تو ندیم صاحب کہتے ہیں ''آپ کو جب فرصت ہو لکھ بھیجیے فنون بہر حال اتنی دیر تک شائع نہ ہوگا۔'' ظاہر ہے اس جواب پر اسے شرموں شرمی ہڈ حرامی چھوڑنا ہی پڑتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہر سال نوجوان تخلیق کاروں کی ایک کھیپ تیار ہوتی ہے جو آگے چل کر اردو ادب کی آبرو ثابت ہوتی ہے۔

یہ محبت خاصی گنجلک اور پیچیدہ چیز ہے کبھی تو سمٹ کر ایک نقطے پر مرتکز ہو جاتی ہے اور کبھی پھیل کر کائنات کی وسعتوں پر حاوی ہوتی دکھائی ہے۔ ندیم صاحب کی محبت خاصی توسیع پسندانہ ہے اور وہ محبت کرتے کرتے اس ملک کے کروڑوں بھوکے ننگے عوام سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ جب انھیں اس کے باوجود سیری نہیں ہوتی تو دنیا بھر کے پسے ہوئے طبقوں پر اپنی محبت کا سایہ کر دیتے ہیں۔ ندیم وہ بلند و بالا مینار ہے جہاں سے محبت کی اذان بلند ہوتی ہے اور دکھی دلوں میں اترتی چلی جاتی ہے۔

لیکن میں نے ندیم صاحب کو کئی مواقع پر محبت چھوڑ مروت سے بھی دستبردار ہوتے دیکھا ہے اور خاصا حیران ہوا ہوں۔ مثالیں تو اور بھی بہت سی ہیں، لیکن مجھے ایک حالیہ واقعہ یاد آ گیا ہے، پہلے وہ بیان کر لوں۔ گزشتہ دنوں ادیبوں کا ایک وفد ''روس یاترا'' کے لیے ترتیب دیا گیا جس کے لیڈر سندھ کے ایک شاعر تھے جو قومی حلقوں میں خاصے متنازع ہیں۔ ندیم صاحب کو بھی اس وفد میں شمولیت کی دعوت دی گئی۔ مگر ندیم صاحب نے انکار کر دیا۔ وجہ اس کی انھوں نے یہ بیان کی کہ ایک پاکستانی کی حیثیت سے مجھے ان کے نظریات سے اختلافات ہیں۔ چنانچہ وفد کے سربراہ کی حیثیت سے وہ روس میں جو کچھ کہیں گے اگر میں وہاں اس کی تردید کرتا ہوں تو یہ ضوابط کی خلاف ورزی ہوگی اور اگر میں خاموش رہوں تو اپنے نظریات کے ساتھ غداری کروں گا۔ ندیم صاحب کی اس حرکت پر میں خاصا حیران ہوا تھا کیونکہ ایک تو وہ یہاں اپنی محبت کے رویے سے دستکش ہو گئے تھے اور دوسرے انھوں نے بیٹھے بٹھائے روس کی مفت سیر کا زریں موقع گنوا دیا۔ حالانکہ ہمارے ہاں اگر کسی کو غیر ملکی دورے کی پیش کش کی جائے اور اس کے ساتھ یہ شرط عاید کی جائے کہ اس کو ایک گھنٹے تک بکری بن کر کان تو پکڑنا ہوں گے تو وہ ہنسی خوشی یہ شرط قبول کر لے گا بلکہ ہم نے تو یہ بھی دیکھا ہے کہ وہ دانشور اگرچہ مقررہ مدت کے بعد کان چھوڑ دیتا ہے مگر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بکری ہو جاتا ہے۔

لیکن ندیم صاحب ایسی ترغیبات سے ایک دفعہ نہیں بے شمار دفعہ گزرے ہیں اور ایسے مواقع پر انھوں نے محبت سے اعلان لاتعلقی کر کے آنکھیں ماتھے پر رکھ لی ہیں۔ ایسا ہی ایک موقع اس وقت بھی آیا تھا جب ایک بھارتی ادیب جن کی تمام عمر پاکستان دشمنی میں بسر ہوئی تھی اور جن کے ندیم صاحب کے ساتھ دیرینہ تعلقات تھے، فوت ہوئے۔ مجھے یاد ہے ''فنون'' میں ان کے بارے میں جو کچھ چھپا وہ پڑھ کر میں ایک بار پھر حیران ہوا تھا لیکن اس کے بعد میں نے حیران ہونا چھوڑ دیا۔ میں نے یہ جان لیا کہ ندیم کا عہد وفا مظلوموں سے ہے ظالموں سے نہیں۔

ندیم صاحب کو میں نے ورزاء اور حکام کے ساتھ بھی بڑا عجیب طرز عمل اختیار کرتے دیکھا ہے۔ کئی تقریبات میں ایسے ہوا ہے کہ ایک سے ایک بڑا دانشور محفل میں موجود وزیر صاحب کے ہاتھ چومنے کے لیے بے تاب نظر آ رہا ہے۔ لیکن ندیم صاحب اس کی طرف کنڈ کیے بیٹھے ہیں حتیٰ کہ میں نے دیکھا کہ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر خود ان کے پاس آیا ہے اور بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا ہے اور پھر ان کے برابر میں بیٹھ گیا ہے۔ ندیم صاحب کے چہرے پر ان کی دل موہ لینے والی مسکراہٹ نمودار ہوتی ہے۔ وہ پوچھتے ہیں ''کیا حال ہے؟'' اور اس ایک جملے کے بعد اس کی طرف سے یکسر غافل ہو کر قریب بیٹھے ہوئے کسی تھن ٹٹ ادیب سے مصروف گفتگو ہو جاتے ہیں۔ یہ منظر میں نے ایک دفعہ نہیں کئی دفعہ دیکھا ہے اور ہر بار دل میں کہا ہے کہ ''ہدایت اللہ! تیس ترقی نہیں کر سکدا''۔ سو میری عمر اس وقت چونتیس برس ہے اور محبت کے ضمن میں میرا تیس سالہ تجربہ یہ ہے کہ محبت کرنا آسان ہے۔ محبت کی اداکاری مشکل ہے۔ ''زیروں کی طرف کنڈ کر کے بیٹھنے والے ندیم صاحب بہت معروف آدمی ہیں۔ ان کے پاس واقعی اداکاری کے لیے وقت نہیں ہے۔

جہاں تک اداکاری کا تعلق ہے۔ میں نے جاگیردار حکمرانوں کو شاعر انقلاب کہلاتے، بیوروکریٹ شاعروں کو عوام کی باتیں کرتے اور مزدوروں کسانوں کی حالت زار پر آنسو بہاتے دیکھا ہے۔ اور کچھ نہیں دیکھا تو وہ خلوص ہے جو ان کے عمل میں نظر آنا چاہیے تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ

دل گردے کا آدمی

احمد ندیم قاسمی ایک پورے عہد کا استعارا تھے۔ مجلسِ ترقی اردو ادب کے دفتر میں محفلیں جمتیں اور خوب جمتیں۔ ان کے سامنے ان کی منہ بولی بیٹی منصورہ احمد براجمان ہوتیں۔ اس نے احمد ندیم قاسمی کی خدمت کا حق تو ادا کیا سو کیا' وہ حضرت قاسمی کی رحلت کے بعد جی نہ پائیں اللہ دونوں کی مغفرت کرے۔ آمین۔ احمد ندیم قاسمی جو ایک ہی وقت میں شاعر' کالم نگار' افسانہ نگار' مدیر اور نقاد تھے۔ کمال کے ہنس مکھ اور بزلہ سنج بھی تھے۔ وہ مسکراتے ہوئے یوں گویا ہوتے جیسے شب برات میں انار کے رنگ بکھرتے ہیں۔ ایک محفل مجھے یاد ہے کہ ان کے پاس کرنل دل نواز دل بیٹھے تھے اور یہ پہلے شاعر ہیں جن کے دونوں اطراف میں دل ہے' نام رکھنے کا یہ انداز پہلے بھی موجود ہے جیسے امجد اسلام امجد اور لاہور سٹیشن لاہور' خیر قاسمی صاحب گفتگو فرما رہے تھے کہ ایک شخص ان کے پاس آیا اور کہنے لگا ''قاسمی صاحب! آپ نے سگریٹ کب چھوڑے اور کیسے چھوڑے'' قاسمی صاحب نے کہا ''بہت آسان طریقہ ہے''۔ وہ شخص حیرت زدہ ہو کر بولا ''جناب وہ کیسے؟'' قاسمی صاحب نے کہا ''بس ایک گردہ نکلوانا پڑتا ہے''۔ قاسمی صاحب نے مزید کہا ''جب ایک گردہ باقی رہ جاتا ہے تو محاورہ صادر آتا ہے کہ یہ دل گردے کا آدمی ہے۔

سعد اللہ شاہ

میں نے ندیم صاحب کو صرف پڑھا ہی نہیں، قریب سے دیکھا بھی ہے۔ ورنہ میں انھیں بھی اس گروہ میں شامل سمجھتا جو رات کو غرقِ مئے ناب ہوتے ہیں اور دن کو مزدوروں کے غم میں غلطاں نظر آتے ہیں۔ میں نے اگر کچھ دیکھا تو یہ کہ ندیم صاحب کے پاس ایک مفلوک الحال ادیب آتا ہے اور انھیں مفلوک الحال کر کے چلا جاتا ہے۔ پھر اگلے روز وہ ٹی ہاؤس میں بیٹھا انھیں گالیاں دے رہا ہوتا ہے۔ جیسا کہ میں نے ابھی کہا کہ ندیم صاحب کے احباب اور نیاز مندوں میں بڑے بڑے وزیر سفیر بھی شامل ہیں، مگر ندیم صاحب انھیں کبھی اس گرمجوشی سے نہیں ملے جس گرمجوشی سے وہ لکھاری دوستوں کو ملتے ہیں، جن سے انھیں ''فنون'' کے لیے نظموں، غزلوں اور افسانوں کے انبار کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوسکتا۔ صرف یہی نہیں بلکہ ہم لوگوں نے برصغیر کی اس عظیم ادبی شخصیت کے ساتھ اسٹیشن کے ٹی سٹال پر کھڑے ہو کر بیس پیسے کپ والی چائے پی ہے۔ ایک تنگ و تاریک گلی کے ایک غلیظ ہوٹل میں تنگ دامانی کے شکار بنچ کے کونے پر بیٹھ کر انھوں نے ہمارے ساتھ سموسے بھی کھائے ہیں۔ لوگوں نے انھیں مزدوروں کے جلوس میں ''فلق شگاف'' نعرے لگاتے بھی دیکھا ہے۔ اور تحریک پاکستان میں عوام کے ہجوم کے مابین انھیں نظمیں سناتے بلکہ گاتے بھی پایا ہے۔ عوام کے ساتھ ان کا اتنا گہرا رابطہ دیکھ کر ہی مجھے یہ بات سمجھ میں آئی کہ وہ خود کو ''سکہ بند'' انقلابی کہلانے پر ضد کیوں نہیں کرتے شاید۔ اس لیے کہ ان میں سے بیشتر کا منہ ''سکوں'' سے بالآخر ''بند'' ہو جاتا ہے اور پھر عوام کے ساتھ ان کا وہی تعلق باقی رہ جاتا ہے جسے عرف عام میں ناجائز تعلق کہا جاتا ہے۔

میں باتوں باتوں میں آپ کو یہ بتانا تو بھول ہی گیا کہ احمد ندیم قاسمی اور مجھ میں نسبی لحاظ سے صرف ''قاسمی'' ہونا ہی مشترک نہیں بلکہ اس کے علاوہ یہ کہ وہ بھی پیرزادے ہیں اور میں بھی پیرزادہ ہوں، وہ بھی علماء کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور میں بھی علماء کے خاندان کا آخری چشم و چراغ ہوں۔ میر تقی میر نے کہا تھا:

؎ اس باغ کے ہر گل سے چپک جاتی ہیں آنکھیں
مشکل ہے پڑی آن کے صاحب نظروں کو

اور اس میں کیا شبہ ہے کہ ''قاسمیوں'' میں ایک قدر مشترک صاحب نظر ہونا بھی ہے خواہ وہ احمد ندیم قاسمی ہوں یا عطاء الحق قاسمی۔ چنانچہ اس باغ کے ہر ''گل'' سے ان قاسمی حضرات کی آنکھیں چپک کر رہ جاتی ہیں۔ تاہم احمد ندیم قاسمی کا کمال یہ ہے کہ ایسے مواقع پر انھوں نے کبھی خود کو مشکل میں محسوس نہیں کیا یا پھر یہ کہ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اس ضمن میں تو ایک واقعہ کا عینی شاہد بھی ہوں۔ قاسمی صاحب ایک روز کشہ نہ ملنے کی صورت میں میرے ساتھ سکوٹر پر بیٹھے تھے اور میں اس روز حفاظتی اقدامات کے تحت اس باغ کے ہر ''گل'' سے نظریں بچاتا ہوا سیدھا تک دیکھ رہا تھا کہ اچانک قاسمی صاحب گفتگو کرتے کرتے خاموش ہو گئے اور پھر تھوڑی دیر بعد انھوں نے دھیمی دھیمی سی آواز میں ''سبحان اللہ'' کہا۔ میں نے اس پر حیران ہو کر دائیں بائیں نظر دوڑائی تو اردگرد سوائے انتہائی خوبصورت چہرے کے اور کوئی چیز ''سبحان اللہ آور'' نہیں تھی۔ بس قاسمی صاحب کی ساری رنگین مزاجی خوبصورت چہروں کو دیکھ کر اس ایک ''سبحان اللہ'' تک ہی محدود ہے۔ چنانچہ بڑے قاسمی اور چھوٹے قاسمی میں اگر کوئی فرق ہے تو وہ یہ ہے کہ ایسے مواقع پر وہ محض ''سبحان اللہ'' کہہ کر خاموش ہو جاتے ہیں جب کہ میں ''انشاء اللہ'' بھی کہتا ہوں۔

گھنٹی

ایک بے بس گھنٹی کا عبرت اثر ماجرا
وہ بولنا چاہتی تھی مگر دوسری بار بھی
بول نہ پائی تھی

نیلوفر اقبال

”بیڈ پین

یہ ساتھ ٹیبل پر رکھا ہے۔ آپ کے لیے جھکنا مشکل ہو گا۔ استعمال کر کے پھر ٹیبل پر ہی رکھ دیا کریں۔ جمعدار سے بات ہوگئی ہے، وہ دن میں تین مرتبہ کر آکر صاف کر دیا کرے گا۔ بس تھوڑے دنوں کی بات ہے، پھر تو آپ خود جانے لگیں گے باتھ روم۔“

رشید نے جاتے جاتے رک کر کمرے کا ایک بار پھر جائزہ لیا۔ پہلے یہ کمرا اس کے بیٹے عامر کے قبضے میں تھا۔ اب اسے نیچے شفٹ کر دیا گیا تھا۔ یہ درمیانے سائز کا کمرا تھا۔ اس میں پینٹ ہوئے کم از کم 3 سال ہو چکے تھے۔ کئی جگہ سے پلستر کے بڑے بڑے ٹکڑے اکھڑ کر گر چکے تھے اور پہلے والے پینٹ کا ہلکا سبز رنگ جھلک رہا تھا۔ کمرے کی ایک دیوار میں بڑی سی کھڑکی تھی۔ یہ کھڑکی باہر کی طرف کھلتی تھی۔ اس کی وجہ سے کمرے میں ذرا رونق تھی ورنہ دیواروں کی خراب حالت طبیعت پر افسردگی طاری کر دیتی۔ اس کھڑکی میں سے آسمان کا ایک ٹکڑا اور بوگن ویلا کی بیل کی کچھ شاخیں نظر آتی تھیں۔ یہ کمرا نیچے والے کمرے کی نسبت بظاہر زیادہ ہوادار اور روشن تھا۔ رشید نے اسے اپنی نگرانی میں سیٹ کرایا تھا۔ ہر چیز بے داغ اور اپنی جگہ پر تھی۔ بیڈ کے دونوں طرف سائیڈ ٹیبل تھے۔ دائیں ہاتھ والی سائیڈ ٹیبل پر پندرہ سولہ کے قریب دواؤں کی شیشیاں اور مختلف رنگ کے کیپسولز کے پتے تھے۔ پانی کا گلاس طشتری سے ڈھکا رکھا تھا۔ طشتری کے اوپر روئی کا بڑا سا پھاہا تھا۔ انجکشن لگانے کی سرنج دراز کے اندر تھی۔ کمپاؤنڈر سے بات ہو چکی تھی کہ دونوں وقت آ کر انجکشن لگا دیا کرے گا۔ ٹانک کی شیشی میں سے ایک باریک سی دھار شیشی کے ساتھ ہوتی ہوئی میز پر ایک چپچپا سا نشان بنا رہی تھی۔ رشید پلٹا اور تھوڑی سی روئی لے کر اس نشان کو پونچھنے لگا۔ لیکن بجائے صاف ہونے کے روئی کے ذرات اور اس سے چپکنے لگے۔ اس نے روئی نیچے رکھی ہوئی بالٹی میں پھینک دی۔

”کچھ اور تو نہیں چاہیے ابا جان؟..... کوئی بھی ضرورت ہو تو آواز دے دیجیے گا۔ محمودہ اور بچے آجایا کریں گے..... یہ دوسرے ٹیبل پر سیب رکھے ہیں، کھاتے رہیے گا۔ آپ کے دل کے لیے اچھے ہیں..... اور یہ رسالہ بھی میں آپ کے لیے لے آیا تھا..... آپ کا پسندیدہ ڈائجسٹ۔“ وہ خوش دلی سے بولا۔

”اب کہاں پڑھا جاتا ہے بیٹا..... تھک جاتا ہوں..... بہو اور بچوں سے کہنا آس پاس ہی رہیں۔ میں اونچی آواز میں نہیں پکار سکتا۔“ باپ نے بہت نحیف آواز میں نیم سرگوشی کے سے انداز میں کہا۔

”آپ بالکل بے فکر رہیں ابا جان! سب کو آپ کا خیال ہے۔ تھوڑے دنوں کی تو بات ہے۔ نگہت اور سیما کو آج کل چھٹیاں ہیں، وہ بھی آپ کو پوچھتی رہیں گی..... سیمیں!..... نگہت!“ اس نے زور سے آواز دی۔

گیارہ اور پندرہ برس کی عمر کی دو لڑکیاں دھپ دھپ سیڑھیاں چڑھتی دوڑتی ہوئی آئیں۔

”اپنے دادا ابا کو تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد پوچھتی رہنا..... اچھا ابا جان میں چلتا ہوں۔“ رشید خدا حافظ کہتا ہوا دفتر جانے کے لیے نکل گیا۔

دادا نے ہاتھ اٹھا کر چھوٹی لڑکی کو پاس آنے کا اشارہ کیا۔ ”بیٹے یہیں آ جاؤ نا..... میرے کمرے میں۔“

”میں پڑھ رہی ہوں۔ امتحان ہونے والا ہے۔“

”یہیں بیٹھ کر پڑھ لو..... میرے پاس۔“

”اونچی بولیں نا..... آپ کی بات ہی سمجھ میں نہیں آ رہی۔“

”نہیں بول سکتا ہوں نا.....“ دادا کی آنکھوں میں کرب لہرا گیا۔

”کوئی کام تو نہیں دادا ابا۔“ بڑی لڑکی نگہت بولی۔ اس کے ہاتھ میں کتاب تھی اور وہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے کتاب کے صفحات پر نظر دوڑا رہی تھی۔

”..... یہ پردہ ہٹا دو..... کھڑکی کھول دو ذرا سی..... گھٹن ہو رہی ہے۔“

لڑکی کتاب ہاتھ میں لیے لیے پردہ ہٹانے کی کوشش کرنے لگی لیکن ریلنگ بری طرح پھنس رہی تھی۔ اس نے جھنجھلا کر زور سے جھٹکا دیا۔ ”شررررر“ کی آواز کے ساتھ پردہ چلا اور آدھا ریلنگ سے باہر نکل کر لٹک گیا۔ ٹن ٹن ن ن کے ساتھ کئی رنرز نکل کر فرش پر گر گئے۔

”لعنت.....“ لڑکی نے منہ ہی منہ میں کہا اور کتاب پلنگ پر رکھ کر کھڑکی کے ساتھ زور آزمائی کرنے لگی۔ کھڑکی کے شیشوں والے تختے کافی عرصے سے نہ کھولے جانے کی وجہ سے جم کر رہ گئے تھے۔

”تم ذرا آ کر زور لگاؤ نا سیما“ لیکن سیما کب کی کمرے سے جا چکی تھی۔

”رہنے دو بیٹا..... ہلکا سا پنکھا چلا دو۔“

نگہت نے پنکھے کا سوئچ آن کیا اور کتاب پر نظریں جمائے جمائے کمرے سے نکل گئی۔ دادا سیڑھیوں پر اس کی چپلوں کی آواز مدھم ہوتے سنتا رہا۔

5 منٹ تک وہ بالکل ساکت لیٹا کمرے میں ادھر ادھر نظریں گھماتا رہا۔ وہ اسی روز صبح ہسپتال سے گھر آیا تھا۔ یہ اس کے بیٹے کا فیصلہ تھا کہ نیچے والے پرانے کمرے کے بجائے اس اوپر والے بیڈ روم میں شفٹ کر دیا جائے۔ یہ کمرا اس کے لیے نیا تھا۔ اس کے بیٹے کا کہنا تھا کہ اسے اس حالت میں رات رات بھر کے لیے نچلی منزل پر اکیلا نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ رشید کا کمرا برابر میں ہی تھا۔ اس لیے یہاں بہتر طور پر خیال رکھا جا سکتا تھا۔ پہلے وہ نیچے ٹی وی لاؤنج کے ساتھ والے کمرے میں تھا۔ اس کمرے میں بڑی رونق تھی۔ سرِشام ہی ٹی وی لاؤنج آباد ہو جاتا تھا۔ بچوں کے غل غپاڑے کی آوازیں بھی آتی رہتی تھیں۔ کوئی ملنے والا بھی آتا تو ٹی وی والے کمرے میں بیٹھتا۔ وہ اپنی شام کی چائے وہیں پیتا تھا اور اکثر سب کے ساتھ بیٹھ کر پروگرام دیکھتا تھا۔ اس کا اپنا پلنگ بھی اس رخ سے رکھا تھا کہ اگر بیچ کا دروازہ کھلا ہو تو ٹی وی سامنے نظر آتا تھا۔ اگر وہ کبھی تھکا ہوتا یا ٹی وی لاؤنج میں کوئی مہمان بیٹھا ہوتا تو وہ اپنے پلنگ پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے آرام سے اپنی پسند کے پروگرام دیکھ لیتا تھا۔ وہ 10 سال سے اس کمرے میں تھا۔ اس کمرے کے سلیٹی پینٹ کیے ہوئے دروازے کی ایک ایک درز اور دیواروں کی ایک ایک دراڑ اور بعض جگہوں سے جھڑے ہوئے پلستر سے بنے ہوئے طرح طرح کے نقش و نگار۔ نیلے رنگ کے پردے جن پر سرخ گلابی پھول تھے جو اب برسوں کے گرد و غبار سے سلیٹی ہو چکے تھے، ان کے درمیانی حصے میں بنے ہوئے گہرے سلیٹی اور مٹیالے داغ جہاں وہ اکثر باتھ روم سے آتے جاتے بہو کی آنکھ بچا کر ہاتھ پونچھ لیتا تھا..... سب اس کے جانے پہچانے تھے۔ اس کا گاؤ تکیہ کہاں تھا؟ وہ لوگ اوپر لانا کیوں بھول گئے اور اس کا لیمپ جو کسی کالے

سلنڈر کی شکل کا تھا اور اس کے اوپر کا شیڈ جو اب میلا ہو چکا تھا، لیمپ کہاں تھا؟ اس نے کمرے میں نگاہیں دوڑائیں..... لیکن وہ کہتے ہیں کہ تھوڑے دنوں کی بات ہے۔ اتنے تھوڑے دنوں کے لیے ہر چیز اوپر شفٹ کر دینا کون سی عقلمندی ہے۔ پھر اس سے پڑھا بھی کہاں جا رہا تھا..... لیکن یہ بستر..... یہ بستر اسے تکلیف دے رہا تھا۔ اس کا اپنا پرانا پلنگ تو اس کے مزاج کے مطابق کب کا ڈھل چکا تھا۔ سپرنگوں کے گڑھے اس کے جسم کے حساب سے آرام دہ ہو چکے تھے..... اب یہ نیا بستر اسے سخت لگ رہا تھا۔ تکیہ بھی کوئی دوسرا تھا۔ اس کی گردن اکڑنے لگی تھی..... اور یہ کمرا اجنبی اجنبی اور سرد سا تھا..... شاید پنکھا تیز چل رہا تھا۔ اسے سردی لگنے لگی۔

''نگہت!..... سیما!..... بیٹے'' اس کی پھٹی پھٹی سرگوشی بمشکل دروازے تک پہنچ سکی۔

اس نے اپنی ٹانگیں سکیڑنے کی کوشش کی لیکن وہ انھیں ہلا نہیں سکا۔ ٹانگوں کے جوڑ سخت ہو چکے تھے۔ اکٹھا کرنے کی کوشش میں اس قدر درد ہوا کہ اس نے ٹانگوں کو جوں کا توں رہنے دیا۔ پھر ہاتھوں سے پلنگ کے کناروں سے نیچے لٹکتی ہوئی چادر کو پکڑ کر ٹانگوں کو ڈھانپنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن چادر ناکافی تھی۔ اسے سردی سے تکلیف محسوس ہونے لگی۔ صرف تین روز پہلے اس کے پھیپھڑوں کی ''بایوپسی'' ہوئی تھی۔ اس نے اسے نڈھال کر ڈالا تھا..... اسے سیڑھیوں پر کسی کے چڑھنے کی آواز آئی۔ اس نے چادر چھوڑ دی۔ یہ اس کی بہو تھی۔

''کچھ چاہیے تو نہیں ابا جان ..... میں ذرا باورچی خانے میں لگی ہوئی تھی۔''

''ذرا پنکھا بند کر دینا بیٹا..... کوئی چادر ڈال دو میرے پیروں پر''

''افوہ! کس نے چلا دیا پنکھا۔ بخار تھا آپ کو'' بہو بڑبڑاتی ہوئی پنکھے کی طرف بڑھی۔ سوئچ آف کر کے وہ وہیں سے بولی ''میں پوچھنے آئی تھی..... کیا بنا دوں آپ کے لیے؟''

''کچھ بھی دے دو۔ دل گھٹ رہا تھا۔''

''بس تھوڑی دیر لگے گی..... جا کر کھچڑی چڑھاؤں گی۔ آپ جب تک سیب کھالیں۔'' بہو واپس سیڑھیاں اتر گئی۔

کمزوری اور بھوک سے اس کا دل گھٹ رہا تھا۔ اس نے بمشکل گردن گھما کر بائیں طرف کی ٹیبل پر رکھی سیب کی پلیٹ کی طرف دیکھا۔ بہت بڑے بڑے اور خوبصورت سیب تھے۔ ان کی سنہری رنگت میں کہیں کہیں سرخی کی لہریں تھیں۔ اس کا بیٹا بڑی چاہت سے اس کے لیے بڑے مہنگے اور اعلیٰ نسل کے سیب لایا تھا۔ اس نے بازو لمبا کر کے سیب کی پلیٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ الٹے ہاتھ سے پلیٹ اٹھانے کی کوشش کی تو ٹیڑھی ہو گئی۔ ایک بڑا سا سیب لڑھک کر پلنگ کے نیچے چلا گیا۔ ساتھ ہی ٹن کی آواز کے ساتھ کوئی چیز نیچے گر گئی۔ چھری! اس نے ایک سیب ہاتھ میں تھام لیا۔ اس کی جادو بھری مہک نے اس کا دماغ حلق تک معطر کر دیا۔ اس نے کھانے کے لیے منہ کھولا..... لیکن دانت!..... دانت کہاں تھے۔ چھری بھی گر پڑی تھی۔ چھوٹی چھوٹی قاشیں تو وہ بغیر سامنے کے دانتوں کے چبا سکتا تھا لیکن یہ تنی ہوئی جلد والا صحت مند سیب اس کے مسوڑھوں کے بس کی بات نہیں تھا..... اور دانت..... دانت کہاں تھے۔ شاید دراز میں رکھے گئے ہوں۔ اس

نے دائیں ہاتھ والے دراز کو کھینچنے کی کوشش کی لیکن ہاتھ ٹیڑھے ہو رہے تھے..... دراز پھنسی ہوئی تھی۔ اس نے پورے زور سے ایک جھٹکا دیا تو دوا کی تین چار شیشیاں جو میز پر رکھی تھیں، وہیں گر گئیں۔ ایک تو لڑھکتی ہوئی کنارے تک آ گئی۔ اس نے بمشکل روکا۔ اس تگ و دو میں وہ تھک کر ہانپنے لگا۔ اس نے اپنا سر تکیے پر گرا دیا اور سیب کے ٹھنڈے ٹھنڈے لمس کو اپنے ہاتھوں اور چہرے پر محسوس کرتے ہوئے دروازے پر نظریں جما دیں۔

☆☆☆

''تم پریشان تو نہیں؟'' رشید نے پہلو میں لیٹی ہوئی بیوی کے رخسار کو انگلی سے چھوتے ہوئے کہا۔

''کس بات سے؟''

''یہی ابا جان کی بیماری..... بیمار کو سنبھالنا آسان کام تو نہیں ہوتا۔''

کیسی باتیں کر رہے ہیں!''

''تھک جاتی ہو گی تم..... بس یہی بے چارے تو رہ گئے ہیں اب..... پچھلے 5 برسوں میں کتنے بزرگ گئے..... تمھارے اماں ابا، میری اماں! بس یہی رہ گئے اب.....''

''خدا انھیں سلامت رکھے۔ میرے لیے تو اپنے ابا کے برابر ہیں یہ..... تھک اس لیے جاتی ہوں کہ لڑکیاں تو امتحانوں کی تیاری کر رہی ہیں اور عامر کا تو آپ کو پتا ہی ہے۔ مجھے بھی سارا دن گھر کے کام رہتے ہیں۔ پھر بھی تھوڑی تھوڑی دیر میں پوچھتی رہتی ہوں..... کیا کروں میں اکیلی.....''

''لڑکیوں سے کہو نا تھوڑی دیر کے لیے پاس بیٹھ جایا کریں۔ گھبرا جاتے ہوں گے اکیلے..... نیچے پھر بھی رونق تھی۔ ٹی وی تھا۔ کوئی ملنے والے آ جاتے تھے۔ لیکن کیا کیا جائے۔ رات بھر کے لیے اکیلے نیچے بھی تو نہیں چھوڑا جا سکتا..... خیر چھوڑو..... ادھر آؤ تم.....''

''نہیں..... بہت تھک گئی ہوں۔ پچاس مرتبہ تو سیڑھیاں چڑھی ہوں گی.....''

''آؤ نا، تھکن اتر جائے گی۔''

''نہیں بس معاف ہی رکھیں..... سنیں..... شاید بلا رہے ہیں.....''

ابا کے کمرے سے دھیمی دھیمی آواز آ رہی تھی جو اب کھانسی میں ڈھل گئی تھی۔

رشید لپک کر اٹھا۔ الٹی سیدھی چپل پہن کر تیزی سے باپ کے کمرے کی طرف بڑھا۔ اس کے کمرے اور باپ کے کمرے کے درمیان میں ایک چھوٹا سا کوریڈور تھا۔ دروازہ کھلا تھا۔ ''کیا بات ہے ابا جان، بلایا آپ نے؟''

''کب سے بلا رہا ہوں'' ان کی آواز میں چڑچڑاہٹ تھی۔

کیا بات ہے؟'' رشید نے بجلی کا بٹن دباتے ہوئے کہا۔

''بیڈ پین نہیں مل رہا اندھیرے میں۔''

''یہ گدھا نیامت ادھر پیروں کی طرف رکھ گیا..... بیوقوف کہیں کا۔'' رشید نے چھوٹی میز باپ کے برابر میں کھسکا دی اور بیڈ پین باپ کے ہاتھ میں دے دیا۔

''اور تو کچھ نہیں چاہیے؟ کل ادھر زیرو کا بلب لگا دوں گا۔ ابھی غسل خانے کی بتی جلا دیتا ہوں۔''

''کیا بجا ہے؟''

''ساڑھے گیارہ۔''

''ذرا پانی دے دو۔''

"نیند کی دوا کھائی آپ نے؟"

"کتنی کھاؤں نیند کی دوا..... پانی دو۔"

رشید پانی کا گلاس ڈھونڈنے کے لیے کمرے میں ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگا۔ گلاس کہیں بھی نظر نہیں آیا "کیا کرتے ہیں یہ لوگ، پانی کا گلاس تک کمرے میں نہیں ہے۔" وہ جھنجھلا کر بولا۔

وہ اندھیرے میں بتیاں جلاتا نیچے باورچی خانے تک پہنچا۔ اسے گھر والوں کی لاپروائی پر غصہ آرہا تھا۔ پانی کا گلاس بھر کر وہ اوپر آیا۔ باپ کو سہارا دے کر اٹھایا۔ پانی پلا کر بتی بجھاتا ہوا وہ اپنے کمرے میں واپس آیا۔ اس کی بیوی کی متوازن سانسیں بتا رہی تھیں کہ وہ کب کی سو چکی ہے۔

اگلے دن صبح ناشتے پر رشید بیوی سے کہنے لگا کہ اباجان کو آواز دینے میں دشواری ہوتی ہے۔ اس مسئلے کا کوئی حل ہونا چاہیے۔ ان کی آواز کمزور ہو چکی ہے۔ دوسرے کمروں میں سنائی نہیں دیتی..... کیوں نہ انھیں ایک گھنٹی لا کر دے دی جائے۔ جب بھی بلانا ہو گھنٹی بجا دیا کریں۔

اسی شام دفتر سے آتے ہوئے رشید ایک گھنٹی لے آیا۔ یہ ہاتھ سے ہلا کر بجائی جانے والی پیتل کی گھنٹی تھی۔ دوکان پر دبا کر بجانے والی گھنٹیوں سے بہت سہل اور کارگر تھی۔ اس کی آواز بھی دوسری گھنٹیوں کی نسبت میٹھی تھی۔ رشید گھنٹی لے کر اپنے باپ کے کمرے میں گیا۔ اس نے گھنٹی کو برابر والی میز پر رکھتے ہوئے کہا "اب کسی کو بلانا ہو تو گھنٹی بجا دیا کیجیے۔" باپ کے چہرے پر عجیب سی کیفیات آگئیں جنھیں رشید بھانپ نہیں سکا، کیونکہ اس کی نظریں کھڑکی پر پھیلی ہوئی بوگن ویلا کی شاخوں پر تھیں۔

"بہت پھیل گئی ہے یہ..... کٹوا دینا چاہیے ورنہ پوری کھڑکی کو بند کر دے گی۔"

"نہیں نہیں، ایسے ہی رہنے دو۔ اچھی لگتی ہے ہریالی..... کبھی چڑیاں بھی اس پر آجاتی ہیں..... رونق رہتی ہے۔"

"گھنٹی سے بہت سہولت ہو جائے گی آپ کو۔"

"بچوں سے کہو نا، ذرا آجایا کریں۔"

"دراصل وہ سب امتحانوں میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کی ماں!..... آپ کو پتا ہی ہے، گھر کے کام ہی ختم نہیں ہوتے۔"

باپ کی آنکھوں میں اداسی لہرا گئی۔ رشید آدھے لٹکے ہوئے پردے کو دیکھ رہا تھا۔

"کوئی کام اس گھر میں سیدھا نہیں ہوتا۔ پردہ گرا ہے تو بس گرا ہی ہے۔" وہ بڑبڑاتا ہوا کمرے سے نکلنے لگا۔ پھر پلٹا "آپ رسالہ پڑھ لیا کیجیے نا! وقت اچھا کٹ جاتا ہے۔"

"نہیں پڑھ سکتا ہوں..... پانی آجاتا ہے آنکھوں میں"

"اوفوہ!..... اچھا میں آپ کے ڈراپس لیتا آؤں گا۔ اب آپ آرام کریں۔"

"آرام ہی تو کر رہا ہوں..... اور کیا کر رہا ہوں" باپ نے پھنسی پھنسی سرگوشی میں کہا۔

رشید کمرے سے باہر نکل آیا۔ باپ کے کمرے میں جا کر عجیب پژمردگی سی طبیعت پر چھا جاتی تھی۔ انجکشن کی سپرٹ اور ہیڈ پین سے اٹھنے والی مخصوص بو نے کمرے کی فضا کو مکدر کر دیا تھا..... باہر زندگی تھی، تازہ ہوا تھی۔ رشید نے کمرے سے نکل کر کھل کر لمبا سانس لیا اور تیزی سے سیڑھیاں اترنے لگا۔ سب گھر

والے ٹی وی لاؤنج میں تھے۔ رات کا کھانا وہیں کھایا جاتا تھا۔ ان کی پسندیدہ سیریل کا وقت ہو رہا تھا۔ ابھی وہ سیڑھیوں کے نیچے ہی پہنچا تھا کہ گھنٹی کی آواز آئی۔ وہ الٹے قدموں واپس سیڑھیاں چڑھ گیا۔

"بیٹا ذرا سامنے والی بتی بند کر دو۔ آنکھوں میں چبھتی ہے۔ سرہانے والی جلا دو۔"

رشید نے بتی بند کی اور دوسری جلا دی۔ پھر کمرے سے نکلنے لگا۔

"وہ کھڑکی بند کر دو..... ٹھنڈک آرہی ہے۔"

رشید نے کھڑکی بند کر دی۔ "اور کوئی کام اباجان.....!"

"ذرا کروٹ دِلا دو مجھے ..... تھک گیا ہوں سیدھے لیٹے لیٹے۔"

کروٹ دِلا کر رشید آہستہ آہستہ سیڑھیاں اُترنے لگا کہ شاید باپ پھر بلا لے۔

آج محمودہ نے بڑے مزے کی ماش کی دال بنائی تھی۔ اس کے اوپر بھی سرخ ثابت مرچیں اور سبز دھنیا اسے خوب اشتہا انگیز بنا رہا تھا۔ ساتھ میں گرم گرم چپاتیاں تھیں۔ ٹی وی ڈراما شروع ہو چکا تھا۔ یہ ایک مزاحیہ سیریل تھی اور سب گھر والے اسے شوق سے دیکھتے تھے۔ وہ سب کھانا کھا رہے اور ہنس بھی رہے تھے۔ رشید نے ابھی تین چوتھائی چپاتی کھائی تھی کہ گھنٹی بجنے کی آواز آئی۔

"جاؤ سیما..... دادا ابا بلا رہے ہیں۔"

"میں کھانا کھا رہی ہوں۔"

"کوئی بات نہیں۔ جاؤ دیکھو کیا بات ہے؟" وہ درشتی سے بولا۔

سیما نے جھٹکے سے روٹی پلیٹ میں ڈالی اور منہ بسورتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بدتمیز ہوتی جا رہی ہے۔" رشید بولا۔

تھوڑی دیر بعد سیما واپس آئی، اس کا منہ بنا ہوا تھا۔ "بیڈ پین بھر گیا ہے۔ آج نیامت کا بچہ شام کو آیا ہی نہیں..... میں کیا کروں؟"

"کمینہ ہے کم بخت..... تم ڈانٹتی کیوں نہیں..... کس بات کے پیسے لیتا ہے حرامی" وہ بیوی سے بولا۔

"آج اتوار ہے۔ وہ چھٹی کرتا ہے۔" وہ چپاتی پر نظریں گاڑے آہستہ سے بولی۔

"کیا؟..... تو سارا دن بیڈ پین؟"

"میں پھینک آتی ہوں۔" وہ روٹی پلیٹ میں رکھ کر اٹھتے ہوئے بولی۔

"نہیں..... بیٹھو تم..... میں جاتا ہوں۔" وہ جلدی جلدی بڑے بڑے لقمے بنا کر اپنی روٹی کو ختم کرنے لگا۔ ماش کی لذیذ دال اور گرم روٹی کا مزا اس کے منہ میں زائل ہو چکا تھا۔ کھانا ختم کر کے وہ تیزی سے اٹھا۔

جب وہ کمرے میں پہنچا تو باپ کی نگاہیں دروازے پر جمی تھیں۔ پیشاب کا برتن اوپر تک بھر چکا تھا۔ اس نے مشکل سے سنبھال کر اٹھایا۔ غسل خانے میں کموڈ میں انڈیل رہا تھا کہ بو کا ایک تیز بھبھوکا ناک سے ہوتا ہوا حلق میں گھس گیا۔ اس نے ناک کے گرد بازو کو لپیٹا اور برتن کو کھنگال کر واپس لے آیا۔

"بیٹا..... بستر خراب ہو گیا ہے۔"

"اوہو..... اچھا؟"

"کپڑے بھی ناپاک ہو گئے۔" باپ کی آواز میں شرمساری تھی۔

رشید چند لمحے سوچتا رہا۔ "میں محمودہ کو بلاتا ہوں۔"

بستر بدلا گیا۔ محمودہ نے الماری سے کپڑوں کا دھلا ہوا جوڑا نکال کر دیا۔ دونوں نے مل کر قمیص بدلی۔ شلوار پہناتے وقت محمودہ کمرے سے نکل گئی۔ رشید نے دیکھا اس کے باپ کی پنڈلیاں بالکل سوکھ گئی تھیں۔

"آپ ذرا چلا پھرا کریں نا..... دیکھیں ٹانگیں سوکھنا شروع ہوگئیں ہیں۔ اس طرح تو بالکل ختم ہو جائیں گی۔"

"کیسے چلوں بیٹا۔ میں تو ہل بھی نہیں سکتا ہوں۔ بہت درد ہوتا ہے ہر وقت۔"

"کوئی اور کام تو نہیں ابا جان؟"

"نہیں..... جاؤ تم" باپ نے رشید کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں کرب اور محرومی کی لہریں تھیں لیکن رشید کمرے سے نکل کر آدھی سیڑھیاں طے کر چکا تھا۔

ٹی وی لاؤنج میں کھانا اختتام پر تھا۔ خبرنامہ شروع ہو رہا تھا۔ محمودہ ٹرے میں کھانے کے برتن سمیٹ رہی تھی اور بڑی بیٹی نگہت پلاسٹک کا دسترخوان تہہ کر رہی تھی۔ رشید آ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے اعصاب پر تھکاوٹ طاری ہو رہی تھی۔ باپ کی حالت نے اس کے دل کو افسردہ کر دیا تھا۔ باپ کی سوکھی سوکھی پنڈلیاں اس کی نظروں میں بار بار گھوم رہی تھیں۔ کیا وہ پھر چل سکیں گے؟ ٹانگوں کی حالت سے تو ایسا نہیں لگ رہا تھا..... کیا ہوگا ان کا؟ پھر خبروں کی سرخیوں نے اس کی توجہ کھینچ لی۔

"گھنٹی بج رہی ہے۔" نگہت کی آواز آئی۔

"جاؤ عامر دیکھ کر آؤ۔"

"کچھ زیادہ ہی گھنٹی بجانے لگے ہیں دادا ابا۔"

"بکو مت۔ دھیلے کا کام تم نہیں کرتے۔ جاؤ فوراً دیکھ کر آؤ۔"

عامر چند لمحوں بعد ہی اوپر سے آ گیا "ان کو کھانا نہیں دیا کسی نے۔"

"کھانا نہیں دیا ان کو؟" رشید باورچی خانے میں بیوی کے پیچھے پہنچا۔ "سب سے پہلے دینا چاہیے تھا ان کو۔"

"میں کیا کروں..... 7 بجے لے کر گئی تھی کھچڑی..... واپس کر دی۔ بولے کھچڑی نہیں کھائیں گے..... اب ساگودانہ بنانے لگی ہوں۔"

"بہرحال جو بھی ہے ان کو جلدی دے دیا کرو..... دوائیاں بھی تو انھوں نے کھانی ہوتی ہیں..... نیند کی دوا جلدی کھائیں تو سوئیں بھی۔"

"لگی تو رہتی ہوں ہر وقت۔" محمودہ کی آواز میں ناگواری تھی۔ جھنجھلاہٹ اس کے چہرے سے عیاں تھی۔

رشید آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھتا اوپر چل دیا۔ ابا جان چھت پر نظریں گاڑے لیٹے تھے۔

"ابھی لا رہی ہے ابا جان..... کچھ بنا رہی ہے آپ کے لیے۔"

"ذرا جلدی دے دیا کرے۔ پھر دوائی کھانی ہوتی ہے..... دیر ہو جائے تو پھر سو نہیں پاتا ہوں ساری رات....."

"وہ بھی کیا کرے بیچاری..... صبح سے لگی رہتی ہے سارا دن۔"

"پریشان کر دیا میں نے سب کو....."

"ایسا نہ کہیں ابا جان!..... ایسا نہ کہیں۔ کوئی پریشانی نہیں کسی کو۔ آپ نے بھی تو ساری زندگی احسان کیے ہیں ہم پر..... اب آپ کا وقت آیا ہے تو....."

محمودہ کے سیڑھیاں چڑھنے کی آواز آئی۔ اس کے ہاتھ میں پلیٹ کے اوپر بڑا پیالہ تھا۔ اس کے بال پریشان تھے اور آنکھیں تھکی تھکی لگ رہی تھیں۔ رشید نے دروازے میں سے اس کے ہاتھ سے برتن لے لیے "میں کھلا دوں گا..... تم اپنا کام ختم کرو۔"

باپ کے سرہانے کے پاس ایک چھوٹا سا تولیہ رکھا تھا۔ رشید نے اس کو ان کی ٹھوڑی کے نیچے لگا دیا اور چمچ کے ساتھ ساگودانہ کھلانے لگا۔ "ابا جان! یاد ہے جب میں چھوٹا سا تھا ضد کر کے صرف آپ کے ہاتھ سے کھاتا تھا۔"

"تم ساری ساری رات ماں کو جگاتے تھے۔" باپ نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔ "وہ بیچاری رات میں کتنی مرتبہ تمھارا پیشاب والا کپڑا بدلتی تھی۔ تم رو رو کر طوفان اٹھا لیتے تھے۔ میں تمھیں گود میں لیے ٹہلاتا رہتا تھا۔ جب تک نہ ٹہلاتے تم چپ نہیں کرتے تھے" اور وہ مسکرا رہے تھے۔

"اور میں زبردستی آپ کے گھٹنے پر چڑھ کر بیٹھ جایا کرتا تھا۔ آپ کے ہاتھ سے کھانے میں مزا آتا تھا۔ پتا نہیں کیوں۔"

"بیٹے جو تھے میرے....."

"اور آج آپ کہہ رہے تھے کہ آپ نے پریشان کر دیا۔" رشید نے شاکی لہجے میں کہا۔

"وہ بات اور ہوتی ہے بیٹا۔"

"اور بات کیوں ہوتی ہے؟"

"ہاں بیٹا دوسری بات ہوتی ہے..... مجبور ہو گیا ہوں..... اچھا نہیں لگتا یہ سب۔" ان کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔

"ایسا نہ سوچیں ابا جان! ٹھیک ہو جائیں گے آپ..... تھوڑے دنوں کی تو بات ہے۔"

"کتنا خیال کرتے ہو..... اللہ تمھیں ہمیشہ خوش رکھے۔"

"بس آپ کی دعا ہونی چاہیے۔"

وہ آہستہ آہستہ چمچ بھر کر باپ کو کھلا رہا تھا۔ کبھی ساگودانہ منہ پر ادھر ادھر گر جاتا تو وہ چمچ سے سمیٹ کر واپس منہ میں ڈال دیتا۔ جیسے وہ اپنے بیٹے عامر کو کھلایا کرتا تھا، جب وہ 2 سال کا تھا اور جیسے ابا جان اس کو کھلاتے تھے جب وہ چھوٹا سا تھا۔

☆☆☆

محمودہ کے اسکول کے زمانے کی سہیلی رُخسانہ اُسے ملنے آئی ہوئی تھی۔ محمودہ اسے دیکھ کر کھل اٹھی۔ جلدی جلدی کام نبٹا کر اس نے بڑے اہتمام سے کباب تلے، چائے بنائی اور وہ دونوں ٹی وی لاؤنج میں آ بیٹھیں۔

"زبردست کپڑا پہنا ہوا ہے رخسانہ تم نے۔ کہاں سے لیا؟"

"میرے گھر کے ساتھ جو مارکیٹ ہے، تم آؤنا کسی دن، بڑے اچھے اچھے رنگ ہیں اس میں۔ مجھے چپلی کباب بھی سکھا جانا۔"

"میں کہاں نکل سکتی ہوں....." اس کی آواز میں آزردگی تھی۔ "کیوں ایسی کیا مصیبت پڑ گئی..... اچھی خاصی تو تم گھوما پھرا کرتی تھی۔"

"پھرا کرتی تھی..... اب وہ دن گئے۔"

"ہوا کیا آخر؟"

"میرے سسر..... بستر پر پڑے ہیں بیمار..... میں ہی سنبھالتی ہوں۔"

محمودہ کی سہیلی خاموشی سے کچھ دیر اس کی شکل کو دیکھتی رہی۔ محمودہ کے چہرے پر پژمردگی اور تھکاوٹ

اس نے آتے ہی بھانپ لی تھی۔ اس نے تنک کر کہا ''اپنی بیٹیاں کہاں ہیں ان کی؟ دوسرے بیٹے بھی تو تھے۔ تم اکیلی کیوں پھنسی ہوئی ہو؟ تمھاری کیا ذمہ داری ہے؟''

''بیٹی ایک ہی ہے..... وہ سعودیہ جا کر بس گئی ہے۔ بیٹا امریکا جا کر بیٹھ گیا..... بس ہم ہی ہیں..... خیر میں برا نہیں مانتی۔ بیٹا نہیں رکھے گا تو کون رکھے گا۔ بس تھک جاتی ہوں۔ 5 منٹ بھی بیٹھنا نہیں ملتا اوپر نیچے، اوپر نیچے۔ میری بیٹیوں نے تو صاف جواب دے دیا۔ بڑی لڑکی نے تو پرسوں رونا شروع کر دیا کہ دادا کی وجہ سے پڑھائی نہیں ہوتی۔''

''یہ تو اچھی مصیبت پڑ گئی تم کو.....''

''کیا کیا جا سکتا ہے پھر۔ تھک جاتی ہوں۔ خیر چھوڑو چائے تو شروع کرو۔''

محمودہ نے اپنی سہیلی کی پلیٹ میں 2 کباب اور ساتھ میں چٹنی ڈالی۔ پھر اپنی پیالی اُٹھائی، ابھی گھونٹ بھی نہیں بھرا تھا کہ گھنٹی کی تیز آواز آئی۔

''یہ کیا.....؟''

''وہی'' محمودہ پیالی رکھ کر کھڑی ہوئی۔ ''تم بیٹھو میں ابھی دیکھ کر آتی ہوں۔''

اس کے سسر کچھ کھانے کو مانگ رہے تھے۔ ان کی یخنی گرم کرتے، توس سینکتے، ان کو دوا کھلاتے، ان کے ہاتھ دھلاتے محمودہ کو آدھ گھنٹہ لگ گیا۔ وہ واپس آئی تو اس کی سہیلی جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔

''تم تو زیادہ ہی مصروف ہو..... اب کسی دن وقت نکال کر آنا تم خود'' رخسانہ چلی گئی۔

شروع شروع میں سب کا خیال تھا کہ چند دنوں میں ابا جان پیروں پر کھڑے ہو جائیں گے، مگر اب کھڑا ہونا تو درکنار..... ان کا بیٹھنا بھی محال ہوا جا رہا تھا۔ محمودہ پیچھے گاؤ تکیہ لگا کر ٹیک لگوا دیتی۔ بمشکل اپنے ہاتھ سے کھا سکتے تھے..... اور یہ سلسلہ طویل ہوا جا رہا تھا..... طویل تر۔

شام کو رشید کے آنے پر محمودہ شکر کا سانس لیتی۔ لیکن وہ بھی سارے دن کی تھکن کے بعد کچھ دیر آرام کرنا چاہتا تھا۔ وہ آنے کے ساتھ پانچ دس منٹ کے لیے اپنے باپ کے پاس جاتا اور لگے بندھے سوال پوچھتا۔ ''دوائی کھائی؟ ٹیکہ لگوایا تھا؟'' درد کو کچھ آرام ہوا؟'' چند باتیں کر کے وہ نکل بھاگتا۔ اب باپ نے بھی باتیں بہت کم کر دی تھیں۔ اکثر کمرے میں آنے والے کو اب بوڑھے باپ کی نگاہیں خشمگیں سی لگتی تھیں اور مختصر سے جواب بھی طنز لیے ہوتے تھے۔

رشید پوچھتا ''دوا کھائی تھی ابا جان؟''

''ہاں'' وہ سرد مہری سے کہتے اور آنکھیں بند کر لیتے۔ ''نیامت آیا تھا؟''

''کچھ آرام ہے؟''

''کہاں آرام ہے..... بہت درد رہا..... نیامت نے مالش کی تو ذرا آرام ملا۔ میں نے 10 روپے دے دیے اس کو..... اور اب کون ہے میرا؟''

رشید کے دل کو بہت چوٹ لگتی..... رات بھر میں کم از کم دو تین بار وہ گھنٹی کی آواز پر اٹھ کر آتا تھا اور اس کی بیوی بیچاری سارا دن لگی رہتی تھی۔ پھر بھی ابا جان..... بیماری نے انھیں چڑچڑا بنا دیا تھا اور اب ان کی سمجھ بوجھ پر بھی اثر پڑتا جا رہا تھا۔ وہ دوسروں کی مشکل سمجھ ہی نہیں رہے تھے.....

ڈاکٹر سے پوچھا گیا۔ اس نے بہت اطمینان سے کندھے اچکا کر کہا ''اولڈ ایج۔'' پھر تھوڑی دیر کے بعد

کہا ''ویسے کیس آپریشن کا ہے۔ لیکن ان کی عمر کے پیش نظر میں آپریشن کا مشورہ نہیں دوں گا۔''

''پھر؟''

''بس دوائیاں دیتے رہیں۔ انجکشن کا کورس پورا کرلیں..... خوراک کا خیال رکھیں۔''

گھنٹی.....!!!

گھنٹی کی آواز مصیبت کی علامت بن گئی۔ اب جونہی گھنٹی کی آواز آتی ہر ایک کا پہلا ردعمل ناگواری کا ہوتا۔ ہر کوئی دوسرے کی طرف دیکھنے لگتا۔ ہر کوئی خود کو مصروف ظاہر کرتا تاکہ وہ نہ جائے، دوسرا جائے۔ بچے بالکل لاتعلقی ظاہر کرتے، ماں ان پر برس پڑتی..... رشید پہلے خوشی خوشی گھر آتا تھا، اب اس پر پژمردگی طاری ہوتی۔ آنے کے ساتھ ہی وہ پہلے باپ کے کمرے میں جاتا تھا۔ لیکن اب باپ کے اندر عجیب سی تبدیلی آتی جا رہی تھی۔ اب ان کا رویہ ایسا ہو گیا تھا کہ رشید جتنی دیر وہاں گزارتا اس پر احساس جرم سا طاری رہتا..... جیسے بوڑھے باپ کی تمام تکلیفوں کے ذمہ دار خود یا اس کے گھر والے ہوں..... جیسے ان سب سے کوئی جرم سرزد ہو گیا ہو۔ جیسے یہ سب ان کی وجہ سے ہو..... درد و کرب کی شدت نے بوڑھے کی آنکھوں میں عجیب سی چمک بھر دی تھی۔ بعض دفعہ ادھ کھلی آنکھوں میں سوائے اس چمک کے کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ رشید کو باپ کی آنکھوں کی طرف دیکھنے سے گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔

رشید کے باپ نے محسوس کر لیا تھا کہ جب تک وہ گھنٹی نہ بجائے کوئی اس کے کمرے میں آنا گوارا نہیں کرتا۔ اسے ان لوگوں کی بے حسی پر غصہ آنے لگا تھا۔ وہ محبت جو اس کے دل میں قدرتی طور پر ان سب کے لیے تھی، آہستہ آہستہ شکوے کا روپ اختیار کرتی جا رہی تھی۔

اس کی زندگی کتاب کی صورت اس کے سامنے دھری تھی اور کتاب کا آخری باب اس کی نظروں کے سامنے کھلا تھا۔ وہ خود تھا، اس کی بیماری تھی اور ایک خالی کمرا تھا جس کی فضا میں آیوڈین اور پیشاب کی بو تھی جس سے مانوس ہوتے ہوئے اس کے نتھنے بے حس ہو چکے تھے۔ اس کے کمرے میں کوئی آنا پسند نہیں کرتا تھا۔ اس کمرے میں وہ اکیلا تھا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد کئی سال کتابوں نے اس کا ساتھ دیا تھا۔ وہ سارا وقت کچھ نہ کچھ پڑھتا رہتا تھا۔ وہ اعلیٰ ادبی ذوق رکھتا تھا لیکن پچھلے دو ایک برسوں سے وہ بہت ہی ہلکا پھلکا مواد پڑھنے لگا تھا جس سے ذہن پر بوجھ نہیں پڑتا تھا۔ بس دل بہل جاتا اور وقت کے گزرنے کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ وہ عموماً سٹال سے مختلف قسم کے ڈائجسٹ لے آتا اور رات گئے تک پڑھتا تھا۔ پھر شام کا وقت زیادہ تر ٹیلی ویژن کے سامنے گزر جاتا تھا۔ اب وہ پڑھ نہیں سکتا تھا۔ اس کے اعصاب اس قابل نہیں تھے۔ پھر ٹی وی نچلی منزل پر تھا..... اور پہلے رضی بھی تو تھا..... رضی تو کہاں چلا گیا؟

رضی جسے اس کی بیوی طنزیہ لہجے میں ''عزیز دوست'' کہتی تھی..... ''آپ کے عزیز دوست صاحب آئے ہیں'' وہ تیکھے لہجے میں کہتی۔ وہ اور رضی کالج میں اُردو ڈیپارٹمنٹ سے منسلک تھے اور یہ اتفاق ہی تھا کہ ان کے گھر بھی ایک علاقے میں تھے۔ روزانہ شام اکٹھے گزرتی اور صبح کی سیر بھی اکٹھے ہو جاتی تھی۔ رضی بلاناغہ شام کو آتا تھا ''رضی صاحب آئے ہیں'' اس شام بھی ملازم نے کہا تھا چائے پی کر وہ دونوں ٹہلنے نکل

گئے تھے۔ آج کل ان دونوں کا محبوب موضوع ٹیوشن سنٹر تھا۔ ان کا ٹیوشن سنٹر کھولنے کا ارادہ تھا۔ آج بھی وہ یہی باتیں کر رہے تھے کہ اس کے لیے کس کا گھر زیادہ مناسب رہے گا۔ رضی کا گھر کچھ چھوٹا تھا۔ باتیں کرتے کرتے وہ اپنے پسندیدہ بک سٹال تک پہنچ گئے تھے۔ وہاں سے اسی مہینے کا ڈائجسٹ خریدا گیا۔ رضی ادبی کتابوں کا شوق رکھتا تھا لیکن ڈائجسٹ بھی کبھی کبھی پڑھنے کے لیے مانگ کر لے جاتا تھا۔ پھر گلی کا وہ موڑ آ گیا جہاں سے ان کے رستے الگ ہوتے تھے۔ رضی اپنے گھر چلا گیا تھا۔

پھر رضی کبھی نہیں آیا.....

رضی ہوتا تو بیماری کٹنے کا پتا بھی نہ چلتا۔ اس کو کام ہی کیا تھا۔ سارا دن ادھر ہی بیٹھا رہتا۔ کم از کم ایک آدمی تو تھا جسے بلانے کے لیے گھنٹی نہیں بجانی پڑتی۔ اب تو بغیر گھنٹی کے یا تو کمرے کی کھڑکی میں کوئی چڑیا آتی تھی یا کوئی بھنو۔

ایک ایک کر کے اس کی نظروں کے سامنے اپنے ان بچوں کے چہرے گھومنے لگے جو پاس نہیں تھے۔ اسے اب ان کی ضرورت تھی، لیکن وہ دور تھے اور اپنے اپنے طور پر اس کی طرف سے مطمئن تھے کہ ان کا باپ تنہا نہیں تھا۔ اس کی بیٹی کئی برسوں سے سعودی عرب میں خوش و خرم تھی۔ اس کا خاوند خوب کما رہا تھا۔ اس نے کسی آنے والے کے ہاتھ ''مساجز'' بھیجا تھا۔ ''مساج'' کرنے سے آپ کی ٹانگوں کو آرام ملے گا'' اس نے لکھا تھا۔ ''امید ہے آپ ''جوسر'' استعمال کر رہے ہوں گے اور خوب جوس پی رہے ہوں گے۔'' اس کا اس سال پاکستان آنے کا ارادہ نہیں تھا۔ ''ہر سال پاکستان آنے سے بہت خرچ ہو جاتا ہے۔ سیونگ نہیں ہو پاتی'' اس نے لکھا تھا۔ اپنی اس اکلوتی بیٹی کی شادی اچھی طرح کرنے کے لیے اس نے اپنا ایک قیمتی پلاٹ بیچ دیا تھا۔ آدھی رقم سے شادی ''ڈیسنٹ'' طریقے سے ہو گئی تھی اور باقی بچنے والی رقم سے اس نے اپنے دوسرے بیٹے کو امریکا بھیج دیا تھا۔ ایم بی اے کے بعد اسے وہاں اچھی نوکری مل گئی تھی۔ ''پاکستان میں میرے لیے کیا پراسپکٹس ہیں ابا جان!'' اس نے لکھا تھا۔ اس نے بخوشی بیٹے کو امریکا میں نوکری کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ بیٹے کے بہتر مستقبل کے لیے یہی مناسب تھا۔ بیٹی کو بھی اس نے خود ہر سال پاکستان آنے سے منع کیا تھا۔ اگر پیسا ہی نہ جمع کیا تو سعودیہ میں کمانے کا فائدہ؟ اس کا یہ بڑا بیٹا جس کے ساتھ وہ اب رہ رہا تھا، اس کے لیے کیا کچھ نہیں کیا تھا اس نے۔ یہ مکان جس میں یہ سب رہتے تھے اس نے بنا کر دیا تھا اور اپنی پنشن کی تمام رقم گھر کے خرچ کے لیے دیتا تھا۔ اپنے پاس معمولی سی رقم رکھتا تھا تا کہ پڑھنے کے لیے کوئی کتاب وغیرہ خرید سکے یا کسی موقع یا تہوار پر پوتے پوتیوں کو کچھ دے سکے..... اسے احساس تھا کہ دولت کی دوڑ میں اس کا یہ سرکاری ملازم بیٹا اپنے بہن بھائیوں سے پیچھے رہ گیا تھا..... اور اب وہ ٹیوشن سنٹر کھولنے جا رہا تھا اس سے جو آمدنی ہوتی اس سے وہ انہی کی مالی اعانت کرتا..... لیکن اب وہ بیمار تھا اور اکیلا تھا۔ دنیا کی نظر میں وہ بھرے گھر میں تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ گھر میں اتنا ہی اکیلا تھا جتنا کسی جنگل یا بیابان میں ہوتا۔ کہنے کو وہ پوتے پوتیوں کے ساتھ تھا لیکن اس کا کوئی پوتا پوتی اس کے کمرے میں آنا گوارا نہیں کرتے تھے۔ باہر کی دنیا سے رابطہ صرف گھنٹی کا تھا۔ جب تک گھنٹی نہ بجاتا کوئی اس کے کمرے میں قدم نہیں رکھتا تھا

اور اس کا مطلوبہ کام کر کے وہ سب ایسے بھاگتے جیسے ان کے پیچھے سیکڑوں کتے لگے ہوں۔ بے حس کہیں کے! اب تو بہو کے چہرے سے بھی بیزاری ٹپکنے لگی تھی۔ وہ جب آتی کسی کام کا ذکر کرتی ہوئی آتی جسے وہ بیچ میں چھوڑ کر آئی ہوتی۔

وہ بے وقوف نہیں تھا۔ اس کی سمجھ باقی تھی۔ وہ سب سمجھتے تھے کہ بیماری سے اس کا ذہن بھی جواب دینے لگا تھا۔ وہ سب غلطی پر تھے۔ اس کا جسم ضرور گھل گیا تھا لیکن بیماری نے اس کی روح کا اور اس کی عقل کا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ اس کے ذہن میں اس کی عمر کے سارے دور باقی تھے۔ اس کا بچپن، اس کی جوانی لیکن وہ سب اسے صرف بوڑھا سمجھتے تھے۔ صرف بوڑھا، سنکی بوڑھا..... لیکن وہ سب سمجھتا تھا۔ وہ اچھی طرح سمجھتا تھا کہ یہ گھنٹی کیا ہے۔ یہ گھنٹی نہیں تھی، یہ تو اس کی توہین تھی..... اس کی اس محبت کی توہین جو اس نے ساری زندگی ان لوگوں سے کی تھی..... اور اب یہ توہین اس سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ اسے اٹھا کر پھینک دینا چاہتا تھا..... ''رضی تو کیوں چلا گیا'' وہ پکار اٹھا۔ ''دیکھو جب تک گھنٹی نہیں بجاتا ہوں کوئی میرے کمرے میں قدم نہیں رکھتا..... اب نہیں بجاؤں گا یہ گھنٹی..... رہنے دو مجھے..... نہیں بجاتا اب میں یہ گھنٹی..... جہنم میں جائیں یہ لوگ..... جاؤ نہیں بجاؤں گا اب گھنٹی.....!

اس نے گھنٹی دور پھینکنے کے لیے اٹھائی لیکن پھر اس کی نگاہیں کھڑکی پر جم کر رہ گئیں۔ ایک بہت موٹی سیاہ اور پیلی بھڑ کھڑکی کے ذرا سے کھلے تختے پر سے اندر کی طرف کھسک رہی تھی۔ ایک ناخوشگوار بھنبھناہٹ کی آواز کمرے میں پھیل گئی۔ پھر وہ زن سے اڑی اور کمرے میں چکر لگانے لگی۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئیں اور خوفزدہ نظریں بھڑ پر جم گئیں۔ وہ سامنے الماری کے نیم واتختے کے اوپر والے کنارے پر بیٹھ گئی تھی۔ کبھی تختے کے اندر کی طرف کو سرک جاتی کبھی باہر کی طرف رینگ آتی۔ بھنبھناہٹ کی مکروہ آواز کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ یکلخت وہ تیزی سے اڑی اور اس کے بستر کے اوپر غوطہ مار کر کمرے میں تیزی سے چکر لگانے لگی۔ وہ دم سادھے اس پر نگاہیں جمائے تھا۔ پھر اس سے ضبط نہ ہو سکا اور ہاتھ میں تھامی ہوئی گھنٹی کو زور زور سے بجانے لگا۔

ایک رات 11 اور 1 بجے کے دوران رشید کو چار بار گھنٹی کی آواز پر اٹھ کر جانا پڑا۔ اس کے باپ کو نیند کی دوا کھانے کے باوجود نیند نہیں آ رہی تھی..... رشید کو نیند کا ذرا سا جھونکا آتا تو گھنٹی کی تیز چبھتی ہوئی آواز اسے چونکا دیتی۔ وہ بھاگا بھاگا باپ کے کمرے میں پہنچتا اور کوئی خاص بات نہ ہوتی۔ کبھی کہتے چادر اوڑھا دو، کبھی کہتے پیروں کے نیچے تکیہ رکھ دو، کبھی کہتے کروٹ دلا دو۔ ایک دفعہ پانی پلانے کو کہا جب کہ پانی کا گلاس پاس ہی رکھا تھا۔ ذرا سی کوشش سے خود بھی پی سکتے تھے۔

رشید زچ ہو گیا۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔ وہ بیوی کے پہلو میں کافی دیر خاموش ساکت پڑا رہا۔ اس کی بیوی کی آنکھ کھل گئی تھی۔

''اس طرح تو میں بیمار ہو جاؤں گا'' وہ بولا۔

''ابا جان کو گھنٹی دینے سے بہتر تھا کہ ہم تھوڑی تھوڑی دیر میں جا کر پوچھ لیا کرتے..... ان کا دماغ کمزور ہو گیا ہے..... خواہ مخواہ بلاتے ہیں بار بار..... اس طرح تو میرا صبح دفتر جانا مشکل ہو جائے گا۔''

"آپ تو شام کو آتے ہیں..... میرا کیا حال ہوتا ہو گا سیڑھیاں چڑھ چڑھ کر..... پاؤں دکھ رہے ہیں پھوڑے کی طرح....." "میرا خیال ہے تم گھنٹی ہٹا دو....."

"میں ہٹا دوں!..... واہ! میں کیسے ہٹا دوں؟"

"کسی بچے سے کہہ کر ہٹوا دو..... نہیں تو نیامت سے کہہ دو۔"

"کیا ہو گیا آپ کو..... پورے محلے میں نشر کروانا ہے؟"

"تو کیا کروں پھر؟..... اس طرح تو میں بھی بیمار ہو جاؤں گا۔ ترس بھی آتا ہے ان پر..... لیکن میں کیا کروں۔ اس طرح ساری ساری رات جاگ کر میں صبح دفتر میں کام تو نہیں کر سکتا۔"

"جو بھی ہے..... نہ تو بچوں سے ایسی بات کہہ سکتے ہیں، نہ کسی اور سے۔ ہٹانا ہے تو آپ کو ہی ہٹانا پڑے گی۔"

"پتا نہیں کیا سمجھیں گے ابا جان؟"

"کمرے سے ہٹانے کی کیا ضرورت ہے۔ بس یک طرف کر دو جہاں ہاتھ نہ پہنچے۔"

"کیا کروں..... کیا ابھی ہٹا دوں؟"

"مرضی۔" بیوی دوسری طرف کروٹ لے کر سونے کی تیاری کرنے لگی۔

وہ یونہی اندھیرے میں آنکھیں کھولے لیٹا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا، پریشان تھا۔ اسے یہ سب کرنا، یعنی باپ کے پاس سے گھنٹی ہٹانا اچھا نہیں لگ رہا تھا..... مشکل ہے، میں ایسا نہیں کر پاؤں گا۔ بہت مشکل ہے، اس نے غسل خانے سے آتی ہوئی مدھم روشنی میں کلاک پر وقت دیکھا۔ رات کے ڈیڑھ بج چکے تھے۔ اس پر آہستہ آہستہ غنودگی طاری ہونے لگی۔ اس نے چادر گردن تک کھینچ لی اور نیند کا نشہ آہستہ آہستہ اس پر حاوی ہونے لگا.....

گھنٹی.....!!!

کیا ہو گیا آج ابا جان کو۔ وہ جھلا کر اٹھا۔ پاگل کر دیں گے مجھے آج..... پاگل کر دیں گے۔

"کیا بات ہے ابا جان؟" اس نے کھلے دروازے میں کھڑے کھڑے پوچھا۔

"دل گھبرا سا رہا ہے بیٹا!..... شاید گیس ہے..... سانس رک رہا ہے، دیکھنا تو گیس کی دوا ہے، نیلا سا پتا ہے۔"

رشید نے بتی جلائی اور دوائیوں کے انبار میں مطلوبہ دوا کا پتا ڈھونڈنے لگا۔ بڑی مشکل سے ایک گولی مل گئی۔ دوا کھلانے کے لیے پانی کا گلاس اٹھایا تو خالی تھا۔ اس نے کمرے میں ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ پانی کا جگ نظر نہیں آیا۔

"لاتا ہوں باتھ روم سے۔"

"میرا پانی ابلا ہوا ہے..... نیچے ہو گا کچن میں..... پلاسٹک کا جگ ہے سبز رنگ کا۔"

"ابھی تو یہی پانی لے لیں ناں ابا جان۔"

"ڈاکٹر نے منع کیا ہے کچا پانی پینے سے....." باپ نے بمشکل نقاہت میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔

رشید کو رات کے ڈیڑھ بجے نیچے باورچی خانے میں پانی لینے جانا سوہانِ روح لگ رہا تھا۔ وہ اندھیرے میں ٹٹول ٹٹول کر بتیاں جلاتا کچن تک پہنچ گیا۔ کچن کی بتی کے سوئچ تک جاتے ہوئے کسی سخت نوکیلی چیز کے کونے سے اس کے پاؤں کا انگوٹھا ٹکرایا۔

"لعنت ہے۔" اس کے منہ سے زور سے نکلا۔

اس نے بتی جلا کر دیکھا تو سل کا کونا تھا..... کوئی چیز تیز سے اس گھر میں نہیں رکھی جاتی۔ یہ نہیں کہ رات کو بیمار کے کمرے میں پانی ہی رکھ دیں..... پاگل کر دیں گے یہ سب لوگ مل کر مجھے..... 2 بج رہے ہیں رات کے۔

بتیاں بجھاتا وہ واپس اوپر چڑھا۔ باپ کو دوا کھلائی۔

"بتی بند کر دوں؟" اس نے پوچھا۔

"رہنے دو۔"

کمرے میں آ کر پلنگ پر لیٹا تو نیند آنکھوں سے بھاگ چکی تھی..... بیمار ہو جاؤں گا اس طرح تو میں۔ صبح دفتر کے لیے بھی اٹھنا ہے، گھنٹی ہٹانی ہی پڑے گی۔ دل یہ کام کرنے کو نہیں مان رہا ہے لیکن مجبور کر کے رکھ دیا ابا جان نے..... سارا گھر بیمار ہو جائے گا اس طرح تو۔ بات بات پر گھنٹی بجانے لگے ہیں۔ دوسروں کا سوچتے ہی نہیں۔ ہٹانی ہی پڑے گی گھنٹی۔

وہ بہت دیر تک اندھیرے میں گھورتا رہا۔ پھر جی کڑا کر کے اٹھا اور بغیر چپل کے دبے پاؤں باپ کے کمرے کی طرف بڑھا۔ آہستہ آہستہ چلتا وہ باپ کے دروازے پر پہنچ گیا۔ کمرے میں بتی روشن تھی۔ اس کا باپ بظاہر سویا ہوا تھا لیکن کتنی کچی نیند تھی ان کی، رشید کو اچھی طرح معلوم تھا۔ اگر جاگ گئے تو؟ انھوں نے دیکھ لیا تو؟ وہ اس طرح چوروں کی طرح دبے پاؤں چلتا سائیڈ ٹیبل کے تھوڑا سا پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا اور غور سے باپ کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا.....

پپوٹوں کے نیچے ذرا سی چمک بتا رہی تھی کہ آنکھیں تھوڑی تھوڑی کھلی ہیں..... لیکن پپوٹے بالکل ساکت تھے۔ آنکھیں نیند میں ذرا سی کھلی تھیں۔ گھنٹی ٹیبل پر نہیں تھی۔ رشید نے بستر پر نظر دوڑائی۔ اس نے دیکھا کہ وہ اس کے باپ کے پہلو کے ساتھ دھری تھی۔ اس کے ساتھ ہی باپ کا ساکت بے جان سا ہاتھ پڑا تھا۔ رشید نے بہت آہستگی کے ساتھ گھنٹی کو چادر کی سلوٹوں پر سے اٹھایا۔ ایک مدھم سے ٹن کی آواز آئی..... اس نے جلدی سے اس کو کہنی کے خم میں دبا لیا۔ باپ غنودگی میں کسمسایا اور اس کے منہ سے ایک مدھم لمبی سی "ہوں" کی آواز نکلی جو کراہ تھی یا شاید نیند میں خلل پیدا ہونے کا مضطرب سا احتجاج تھا..... رشید گھبرا گیا اور سرہانے کی طرف ہو گیا لیکن باپ نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ رشید نے آہستہ سے بغیر آواز پیدا کیے گھنٹی کو سائیڈ ٹیبل پر بالکل پیچھے ہٹا کر رکھ دیا جہاں کوشش کرنے سے بھی باپ کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا تھا۔

وہ دبے پاؤں واپس اپنے کمرے میں آیا اور چادروں کے بیچ میں سکون بھری نیند کی امید میں گھس گیا۔

رات کے 3 بج چکے تھے۔ رشید کی آنکھیں پوری طرح کھلی تھیں۔ جس نیند کی خاطر اس نے یہ سب کیا تھا وہ اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی..... وہ جاگ رہا اور مضطرب تھا..... بے حد مضطرب۔ اس کا دل بے چین سا تھا اور کسی طرح اسے سونے نہیں دے رہا تھا جیسے وہ کوئی بہت بڑا جرم کر کے آیا ہو۔ قتل جتنا بڑا جرم اور وہ گھنٹی..... وہ گھنٹی گویا آلۂ قتل ہو۔

اندھیرے میں اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ وہ جان چکا تھا کہ اب وہ سو نہیں سکے گا۔ اس نے سونے کا خیال چھوڑ دیا اور سوچنے لگا۔ دلیلیں دیتا رہا لیکن باپ کا چہرہ بار بار اس کے سامنے آجاتا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جیسے اس سے سوال کرتا۔ اسے احساس ہو گیا کہ اس نے جو کچھ بھی کیا ہے وہ گھناؤنا ہے۔ اتنا گھناؤنا شاید کوئی اور فعل اس سے زیادہ گھناؤنا ہو ہی نہ

سکتا ہو..... اندھیرے میں چھت پر نظریں جمائے، سوچتے سوچتے وہ اچانک چونک پڑا۔ کھڑکی سے اچانک کھٹکے کی آواز آئی۔ اس کا دل یکبارگی زور سے اچھلا۔ وہ آنکھیں پھاڑ کر کھڑکی کی طرف دیکھنے لگا۔ اسے یوں لگا جیسے پردہ ہل رہا ہے..... اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ پھر اس نے مخالف سمت کی کھڑکی کو دیکھا۔ اس طرف کا پردہ بھی ہل رہا تھا..... باہر تیز ہوا چل رہی تھی۔ اس نے کلاک کی طرف دیکھا تو ساڑھے تین بج رہے تھے..... پتا نہیں ابا جان کے کمرے کی کھڑکی ٹھیک سے بند ہے یا نہیں..... بخار بھی تو تھا انھیں۔ وہ تڑپ کر بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔

کھلے دروازے میں سے اس نے اندر دیکھا۔ باپ کا چہرہ دروازے کی طرف تھا اور کھلی آنکھوں کی مٹیالی سی چمک دور سے دکھائی دے رہی تھی۔ جاگ رہے ہیں شاید لیکن چہرہ اور آنکھیں بالکل ساکت تھیں۔ شاید آنکھیں نیند میں کھلی تھیں۔ وہ دبے پاؤں اندر داخل ہو گیا۔ آہستگی سے سائیڈ ٹیبل پر سے گھنٹی اٹھائی اور بغیر آواز پیدا کیے، ہولے سے واپس باپ کے پہلو میں رکھ دی۔

باپ بدستور سوتا رہا۔ رشید نے کھڑکیاں اچھی طرح بند کیں اور باپ پر چادر ٹھیک سے اوڑھا دی۔ کمرے سے نکلتے ہوئے اس نے باپ پر ایک اطمینان کی نگاہ ڈالی۔ اب کہیں جا کر گہری نیند سوئے ہیں ابا جان!

صبح گھنٹی کی آواز سنائی نہیں دی۔ 8 بجے کے قریب رشید کمرے میں گیا تو باپ اسی طرح بے حس و حرکت پڑا تھا۔ پڑوس والے ڈاکٹر صاحب کو اسی وقت بلایا۔ ڈاکٹر نے آلات کے ساتھ چیک کرنے کے بعد بتایا کہ رات میں کسی وقت ہارٹ فیل ہو چکا ہے۔

رشید کی بیوی دوپٹے میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ اس کے تینوں بچے بستر کے پاس حیران اور پریشان کھڑے تھے۔ پھر بڑی بیٹی نگہت ماں کے گلے سے لگ گئی اور اس کی سسکیاں بھی کمرے میں گونجنے لگیں لیکن رشید خاموش تھا۔ وہ چپ چاپ باپ کو دیکھ رہا تھا جو زرد موم کے بت کی طرح پڑا تھا اور آنکھیں اسی طرح کھلی تھیں جیسے رشید نے رات کو دیکھی تھیں۔ کرب ان میں ہمیشہ کے لیے منجمد ہو کر رہ گیا تھا۔ چہرے کا رخ اسی طرح دروازے کی طرف تھا۔ اس کی نگاہیں باپ کی مرجھائی ہوئی گردن سے ہوتی ہوئی پہلو میں دھرے بے جان ہاتھوں پر پڑیں۔ کہنی کے قریب قمیص کی سلوٹوں میں اسے گھنٹی کی جھلک دکھائی دی۔ گھنٹی کسی معصوم بچے کی طرح اس کے باپ کے پہلو سے چمٹی ہوئی خاموش پڑی تھی۔ اس نے گھنٹی کو اٹھا لیا اور دونوں ہاتھ سے اسے سہلانے لگا..... اس کا دل بھر آیا۔

''ابا جان'' اس کے منہ سے نکلا اور پھر وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رو دیا..... پھر اس کی نظروں نے ڈرتے ڈرتے گھنٹی سے پوچھا ''ابا جان کب؟..... کہیں تب تو نہیں؟''

گھنٹی نے کوئی جواب نہیں دیا کیونکہ بے جان چیز بول نہیں سکتی.....

■■■

نیلوفر اقبال افسانہ یوں لکھتی ہیں کہ پڑھنے والے کو ہلا کر رکھ دیتی ہیں۔ ''فنون'' سے اپنا ادبی سفر شروع کرنے والی یہ افسانہ نگار 2 افسانوی مجموعوں کی خالق ہیں اور اسلام آباد میں قیام پذیر۔ ان کا افسانہ پڑھنے کے بعد بھی ہی دیر آپ کچھ اور پڑھنے کے قابل نہیں رہتے۔

زیور کا ڈبا

اُس کی قیمت اور چمک نے دو آنکھیں روشن کر دی تھیں تو دو بجھا دی تھیں

پریم چند

زیور کے ایک ڈبے کی کہانی

بی اے پاس کرنے کے بعد چندر پرکاش کو ایک ٹیوشن کرنے کے سوا کچھ نہ سوجھا۔ اس کی ماں پہلے ہی مر چکی تھی۔ اسی سال والد بھی چل بسے، اور پرکاش زندگی کے جو شیریں خواب دیکھا کرتا تھا، وہ مٹی میں مل گئے۔ اس کے والد اعلیٰ عہدے پر تھے۔ ان کی وساطت سے چندر پرکاش کو کوئی اچھی جگہ ملنے کی پوری

امید تھی مگر وہ سب منصوبے دھرے ہی رہ گئے اور اب گزر اوقات کے لیے صرف 30 روپے ماہوار کی ٹیوشن ہی رہ گئی ہے۔ والد نے کوئی جائیداد نہ چھوڑی الٹا بھوک کا بوجھ اور سر پر لاد دیا اور بیوی بھی ملی تو تعلیم یافتہ، شوقین، زبان کی طرّار جسے موٹا کھانے اور موٹا پہننے کی نسبت مرجانا قبول تھا۔ چندر پرکاش کو 30 روپیہ کی نوکری کرتے شرم آتی تھی لیکن ٹھاکر صاحب نے رہنے کے لیے مکان دے کر ان کے آنسو پونچھ دیے۔ یہ مکان ٹھاکر صاحب کے مکان سے ملا ہوا تھا، ہوادار صاف ستھرا اور ضروری سامان سے آراستہ۔ ایسا مکان 20 روپے ماہوار سے کم نہ مل سکتا تھا۔ کام صرف 2 گھنٹے کا تھا۔ لڑکا تو لگ بھگ انھیں کی عمر کا تھا مگر بڑا کند ذہن، کام چور، ابھی نویں درجہ میں پڑھتا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ٹھاکر اور ٹھاکرائن دونوں پرکاش کی بڑی عزت کرتے بلکہ اسے اپنا بیٹا سمجھتے تھے۔ گویا ملازم نہیں بلکہ ان کے گھر کا آدمی تھا اور گھر کے ہر ایک معاملہ میں اس سے مشورہ لیا جاتا تھا۔

شام کا وقت تھا، پرکاش نے اپنے شاگرد ویرندر کو پڑھا کر چلنے کے لیے چھڑی اٹھائی تو ٹھاکرائن نے کہا۔ ''ابھی نہ جاؤ بیٹا، ذرا میرے ساتھ آؤ، تم سے کچھ کہنا ہے۔''

پرکاش نے دل میں سوچا، وہ کیا بات ہے جو ویرندر کے سامنے نہیں کہی جاسکتی۔ پرکاش کو علیحدہ لے جاکر امادیوی نے کہا، ''تمھاری کیا صلاح ہے؟ ویرو کا بیاہ کردوں ایک بہت اچھے گھر کا پیغام آیا ہے۔''

پرکاش نے مسکرا کر کہا ''یہ تو ویرو بابو ہی سے پوچھیے۔''

''نہیں میں تم سے پوچھتی ہوں۔''

پرکاش نے ذرا تذبذب سے کہا۔ ''میں اس معاملہ میں کیا صلاح دے سکتا ہوں؟

''ان کا بیسواں سال تو ہے۔ لیکن یہ سمجھ لیجیے کہ بیاہ کے بعد پڑھنا ہو چکا۔''

''تو ابھی نہ کروں، تمھاری یہی صلاح ہے۔''

''جیسا آپ مناسب خیال فرمائیں، میں نے تو دونوں باتیں عرض کر دیں۔''

''تو کر ڈالوں؟ مجھے ڈر لگتا ہے کہ لڑکا کہیں بہک نہ جائے پھر پچھتانا پڑے گا۔''

''میرے ہوتے ہوئے تو آپ اس کی فکر نہ کریں۔ ہاں مرضی ہو تو کر ڈالیے کوئی حرج بھی نہیں ہے۔''

''سب تیاریاں تمھیں کرنا پڑیں گی یہ سمجھ لو۔''

''تو میں کب انکار کرتا ہوں ماں جی!''

روٹی کی خیر منانے والے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں ایک کمزوری ہوتی ہے۔ جو انھیں تلخ سچائی کے اظہار سے روکتی ہے۔ پرکاش میں بھی یہی کمزوری تھی۔

بات پکی ہوگئی اور شادی کا سامان ہونے لگا۔ ٹھاکر صاحب ان اصحاب میں سے تھے جنھیں اپنے اوپر بھروسا نہیں ہوتا۔ ان کی نگاہ میں پرکاش کی ڈگری اپنے 60 سالہ تجربے سے زیادہ قیمتی تھی۔ شادی کا سارا انتظام پرکاش کے ہاتھوں میں تھا۔ دس بارہ ہزار روپیہ خرچ کرنے کا اختیار کچھ تھوڑی عزت کی بات نہیں تھی، دیکھتے دیکھتے ایک خستہ حال نوجوان ذمہ دار منیجر بن بیٹھا۔ کہیں بزاز اسے سلام کرنے آیا ہے۔ کہیں محلے کا بنیا گھیرے ہوئے ہے۔ کہیں گیس اور شامیانے والا خوشامد کر رہا ہے۔ وہ چاہتا تو دو چار سو روپے آسانی سے اڑا سکتا تھا، لیکن پرکاش کمینہ نہ تھا۔ پھر اس کے

ساتھ کیا دغا کرتا جس نے سب کچھ اسی پر چھوڑ دیا ہو۔ مگر جس دن اس نے 5 ہزار کے زیورات خریدے اس کے کلیجے پر سانپ لوٹنے لگا۔

گھر آکر چمپا سے بولا ''ہم تو یہاں روٹیوں کے محتاج ہیں اور دنیا میں ایسے ایسے آدمی پڑے ہیں جو ہزاروں لاکھوں روپے کے زیورات بنوا ڈالتے ہیں۔ ٹھاکر صاحب نے آج بہو کے چڑھاوے کے لیے ایسے قیمتی زیورات خریدے ہیں کہ سچ کہتا ہوں، بعض چیزوں پر تو آنکھ نہیں ٹھہرتی تھی۔

چمپا حاسدانہ لہجے میں بولی ''اونہہ ہمیں کیا کرنا ہے، جنھیں ایشور نے دیا ہے وہ پہنیں..... یہاں تو رورو کر مرنے کو پیدا ہوئے ہیں۔''

چندر پرکاش بولا ''یہی لوگ مزے اڑاتے ہیں، نہ کمانا نہ دھمانا۔ باپ دادا چھوڑ گئے ہیں۔ مزے سے کھاتے اور چین کرتے ہیں۔ اسی لیے کہتا ہوں، ایشور بڑا غیر منصف ہے۔''

چمپا نے کہا ''اپنا اپنا مقدر ہے۔ ایشور کا کیا قصور ہے۔ تمھارے باپ دادا چھوڑ گئے ہوتے تو تم بھی مزے اُڑاتے۔ یہاں تو روزمرہ کا خرچ چلانا مشکل ہے، گہنے اور کپڑے کو کون روئے؟ کوئی ڈھنگ کی ساڑھی بھی نہیں کہ کسی بھلے آدمی کے گھر جانا ہوتو پہن لوں۔ میں تو اسی سوچ میں ہوں کہ ٹھاکرائن کے یہاں شادی میں کیسے جاؤں گی۔ سوچتی ہوں بیمار پڑ جاتی تو جان بچتی۔''

یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ پرکاش نے تسلی دی، ساڑھی تمھارے لیے ضرور لاؤں گا، یہ مصیبت کے دن ہمیشہ نہ رہیں گے۔ زندہ رہا تو ایک دن تم سر سے پاؤں تک زیور سے لدی ہوگی۔''

چمپا مسکرا کر بولی، چلو ایسی من کی مٹھائی میں نہیں کھاتی، گزر ہوتی جائے۔ یہی بہت ہے۔''

پرکاش نے چمپا کی بات سن کر شرم اور حیا سے سر جھکا لیا۔ اس نے سوچا، چمپا اسے اتنا کاہل الوجود سمجھتی ہے۔

رات کو دونوں کھانا کھا کر سوئے تو پرکاش نے پھر زیورات کا ذکر چھیڑا۔ زیور اس کی آنکھوں میں بسے ہوئے تھے، ''اس شہر میں ایسے بڑھیا زیور بنتے ہیں، مجھے خبر نہ تھی۔''

چمپا نے کہا، ''کوئی اور بات کرو، زیوروں کی بات سن کر دل جلتا ہے۔''

''ایسی چیزیں تم پہنو تو رانی لگو۔''

''زیوروں سے کیا خوبصورتی معلوم ہوتی ہے، میں نے تو ایسی بہت سی عورتیں دیکھی ہیں، جو زیور پہن کر بھی بھدی معلوم ہوتی ہیں۔''

ٹھاکر صاحب..... مطلب کے یار معلوم ہوتے ہیں، یہ نہ ہوا کہ کہتے۔

''تم اس میں سے کوئی چمپا کے لیے لیتے جاؤ۔''

''تم کیسی بچوں کی سی باتیں کرتے ہو۔''

''اس میں بچپن کی کیا بات ہے کوئی فراخ دل آدمی کبھی اتنی کنجوسی نہ کرتا۔''

''میں نے اتنا سخی کوئی نہیں دیکھا، جو اپنی بہو کے زیور کسی غیر کو بخش دے۔''

''میں غیر نہیں ہوں، ہم دونوں ایک ہی مکان میں رہتے ہیں، میں ان کے لڑکے کو پڑھاتا ہوں اور شادی کا سارا انتظام کر رہا ہوں، اگر سو دو سو کی چیز دے دیتے تو کون سی بڑی بات تھی مگر اہل ثروت کا دل دولت کے بوجھ سے دب کر سکڑ جاتا ہے۔ اس میں سخاوت اور

فراخ حوصلگی کے لیے جگہ ہی نہیں رہتی۔''

یکایک پرکاش چارپائی سے اٹھ کر کھڑا ہوا۔ آہ چمپا کے نازک جسم پر ایک گہنا بھی نہیں پھر بھی وہ کتنی شاکر ہے۔ اسے چمپا پر رحم آگیا۔ یہی تو کھانے پینے کی عمر ہے اور اس عمر میں اس بیچاری کو ہر ایک چیز کے لیے ترسنا پڑتا ہے۔ وہ دبے پاؤں گھر سے باہر چھت پر آیا۔ ٹھاکر صاحب کی چھت سے ملی ہوئی تھی۔ بیچ میں ایک 5 فٹ اونچی دیوار تھی۔ وہ دیوار پر چڑھ گیا اور ٹھاکر صاحب کی چھت پر آہستہ سے اتر گیا، گھر میں بالکل سناٹا تھا۔

اس نے سوچا پہلے زینہ سے اتر کر کمرے میں چلوں، اگر وہ جاگ گئے تو زور سے ہنس دوں گا اور کہوں گا، کیا چکا دیا۔ کہہ دوں گا۔ میرے گھر کی چھت سے کوئی آدمی ادھر آتا دکھائی دیا اس لیے میں بھی اس کے پیچھے پیچھے آیا کہ دیکھوں یہ کیا کر رہا ہے؟ کسی کا مجھ پر شک ہی نہیں ہوگا۔ اگر صندوق کی کنجی مل گئی تو پو بارہ ہیں۔ سب نوکروں پر شبہ کریں گے۔ میں بھی کہوں گا صاحب نوکروں کی حرکت ہے ان کے سوا اور کون لے جا سکتا ہے، میں نلوہ نکل جاؤں گا۔ شادی کے بعد کوئی دوسرا گھر لے لوں گا۔ پھر آہستہ آہستہ ایک ایک زیور چمپا کو دوں گا جس سے کوئی شک نہ گزرے۔

پھر بھی وہ جب زینہ سے اترنے لگا تو اس کا دل دھڑک رہا تھا۔

دھوپ نکل آئی تھی پرکاش ابھی سو رہا تھا کہ چمپا نے اسے جگا کر کہا ''بڑا غضب ہوگیا رات کو ٹھاکر صاحب کے گھر میں چوری ہوگئی۔ چور زیوروں کا ڈبا اُٹھا کر لے گئے۔''

پرکاش نے پڑے پڑے پوچھا کسی نے پکڑا نہیں چور کو۔''

''کسی کو خبر بھی نہیں، وہی ڈبے لے گئے جس میں شادی کے زیور رکھے تھے نہ جانے کیسے چابی اڑالی۔ اور انھیں کیسے معلوم ہوا کہ اس صندوق میں ڈبا رکھا ہے۔''

''نوکروں کی کارستانی ہوگی، باہر کے آدمی کا یہ کام نہیں ہے۔''

''نوکر تو ان کے تینوں پرانے ہیں۔''

نیت بدلتے کیا دیر لگتی ہے، آج موقع دیکھا اُڑا لے گئے۔''

''تم جا کر ان کو تسلی دو ٹھاکرائن بے چاری رو رہی تھی۔ تمھارا نام لے کر کہتی تھیں کہ بیچارا مہینوں ان زیوروں کے لیے دوڑا۔ ایک ایک چیز اپنے سامنے بنوائی اور چور مُونڈی کاٹے نے اس کی ساری محنت پر پانی پھیر دیا۔''

پرکاش جھٹ پٹ اٹھ بیٹھا اور گھبرایا ہوا سا جا کر ٹھاکرائن سے بولا، ''یہ تو بڑا غضب ہوگیا ماتا جی، مجھے تو ابھی ابھی چمپا نے بتایا۔''

ٹھاکر صاحب سر پر ہاتھ رکھے ہوئے بیٹھے تھے، بولے کہیں سیندھ نہیں کوئی تالا نہیں ٹوٹا، کسی دروازے کی چول نہیں اتری، سمجھ نہیں آیا کہ چور کدھر سے آیا؟''

ٹھاکرائن نے رو کر کہا۔ ''میں تو لٹ گئی بھیا بیاہ سر پر ہے، کیا ہوگا، بھگوان تم نے کتنی دوڑ دھوپ کی تھی، تب کہیں جا کر چیزیں تیار ہو کر آئی تھیں نہ جانے کس منحوس ساعت میں بنوائی تھیں۔''

پرکاش نے ٹھاکر صاحب کے کان میں کہا، ''مجھے تو نوکروں کی شرارت معلوم ہوتی ہے۔''

ٹھاکرائن نے مخالفت کی، ''ارے نہیں بھیا۔

نوکروں میں کوئی نہیں۔ 10 ہزار روپے یونہی اوپر رکھے رہتے ہیں۔ کبھی ایک پائی کا نقصان نہیں ہوا۔"

ٹھاکر صاحب نے ناک سکوڑ کر کہا۔ "تم کیا جانو آدمی کا دل کتنی جلدی بدل جاتا ہے۔ جس نے ابھی تک چوری نہیں کی وہ چوری نہیں کرے گا۔ یہ کوئی نہیں کہہ سکتا۔ میں پولیس میں رپورٹ کروں گا اور ایک ایک نوکر کی تلاشی کراؤں گا۔ کہیں مال اڑا دیا ہوگا۔ جب پولیس کے جوتے پڑیں گے تو آپ اقبال کریں گے۔"

پرکاش نے پولیس کا گھر میں آنا خطرناک سمجھا۔ کہیں ان کے گھر کی تلاشی لیں تو ستم ہی ہو جائے گا۔ بولے "پولیس میں رپورٹ کرنا اور تحقیقات کرنا بالکل بے فائدہ ہے۔"

ٹھاکر صاحب نے منہ بنا کر کہا، تم بھی کیا بچوں کی سی بات کر رہے ہو پرکاش بابو۔ بھلا چوری کرنے والا خود بخود اقبال کرے گا۔ تم زدوکوب بھی نہیں کر سکتے، ہاں پولیس میں رپورٹ کرنا مجھے بھی فضول معلوم ہوتا ہے، مال چلا گیا، اب کیا ملے گا۔"

پرکاش "لیکن کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔"

ٹھاکر۔ "کوئی فائدہ نہیں، ہاں اگر کوئی خفیہ پولیس کا آدمی ہو چپکے چپکے پتا لگا دے تو البتہ مال نکل آئے۔ لیکن یہاں ایسے آدمی کہاں نصیبوں کو رو کر بیٹھ رہو اور کیا۔"

پرکاش، "نوکروں پر مجھے پورا یقین ہے۔ کسی کا نام بھی نکل آئے تو مجھے یہی خیال رہے گا کہ یہ کسی باہر کے آدمی کا کام ہے۔ چاہے جدھر سے آیا ہو پر چور آیا باہر سے تمھارے کوٹھے سے بھی تو آسکتا ہے۔"

ٹھاکر۔ "ہاں ذرا اپنے کوٹھے پر دیکھو شاید کچھ نشان ملے۔ کل دروازہ تو کھلا ہوا نہیں رہ گیا؟"

پرکاش کا دل دھڑکنے لگا، بولا میں تو 10 بجے دروازہ بند کر لیتا ہوں۔ ہاں کوئی پہلے سے موقع پا کر کوٹھے پر چلا گیا ہو۔ وہاں چھپا بیٹھا رہا ہو تو دوسری بات ہے۔"

تینوں چھت پر گئے، تو بیچ کی منڈیر پر کسی کے پاؤں کے نشان دکھائی دیے۔ جہاں پرکاش کا پاؤں پڑا تھا، وہاں کا چونہ لگ جانے سے چھت پر پاؤں کا نشان پڑ گیا تھا۔ پرکاش کی چھت پر جا کر منڈیر کی دوسری طرف دیکھا تو ویسے ہی نشان وہاں بھی دکھائی دیے۔ ٹھاکر صاحب سر جھکائے کھڑے تھے۔ لحاظ کے مارے کچھ نہ کہہ سکے تھے۔ پرکاش نے ان کے دل کی بات کھول دی، "اب تو کوئی شک ہی نہیں رہا۔"

ٹھاکر صاحب نے کہا "ہاں میں بھی یہی سمجھتا ہوں لیکن اتنا پتا لگ جانے سے کیا مال تو جانا تھا، وہ گیا، اب چلو آرام سے بیٹھو، آج روپیہ کی کوئی تدبیر کرنی ہوگی۔"

پرکاش، "میں آج ہی یہ گھر چھوڑ دوں گا۔"

ٹھاکر، "کیوں ہمیں تمھارا....."

پرکاش، "آپ نہ کہیں لیکن میں سمجھتا ہوں، میرے سر پر بہت بڑی جواب دہی آگئی، میرا دروازہ نو دس بجے تک کھلا ہی رہتا ہے۔ چور نے راستہ دیکھ لیا ہے۔ ممکن ہے دو چار دن میں پھر آ گھسے۔ گھر میں اکیلی ایک عورت ہے سارے گھر کی نگرانی نہیں کر سکتی۔ ادھر وہ تو باورچی خانہ میں بیٹھی ہے ادھر کوئی چپکے سے اوپر چڑھ گیا تو ذرا بھی آہٹ نہیں سنائی دیتی۔ میں گھوم گھوم کر کبھی 9 بجے آیا کبھی 10 بجے اور شادی کے دنوں میں دیر ہوتی رہے گی۔ ادھر کا راستہ بند ہی ہو جانا چاہیے۔ میں تو سمجھتا ہوں چوری سارے میرے سر ہے۔"

ٹھاکر ائن ڈریں، "تم چلے جاؤ گے بھیا تب تو گھر اور پھاڑ کھائے گا۔"

پرکاش، "کچھ بھی ہو ماتا جی۔ مجھے بہت جلد گھر چھوڑ دینا پڑے گا۔ میری غفلت سے چوری ہوگئی۔ اس کا مجھے خمیازہ اٹھانا پڑے گا۔"

پرکاش چلا گیا تو ٹھاکر کی عورت نے کہا۔ "بڑا لائق آدمی ہے چور ادھر سے آیا یہی بات اسے کھا گئی۔ کہیں یہ چور کو پکڑ پائے تو کچا ہی کھائے۔"

"مار ہی ڈالے"

"دیکھ لینا کبھی نہ کبھی مال برآمد کرے گا۔"

"اب اس گھر میں ہرگز نہ رہے گا۔ کتنا ہی سمجھاؤ۔"

"کرائے کے 20 روپے دینے پڑیں گے۔"

"ہم کیوں کرایہ دیں، وہ آپ ہی گھر چھوڑ رہے ہیں، ہم تو کچھ کہتے نہیں۔"

"کرایہ تو دینا ہی پڑے گا، ایسے آدمی کے لیے کچھ غم بھی کھانا پڑے تو برا نہیں لگتا۔"

"میں تو سمجھتی ہوں کرایہ لیں گے بھی نہیں۔"

"30 روپے میں گزر بھی تو نہ ہوگی۔"

پرکاش نے اسی دن وہ گھر چھوڑ دیا۔ اس گھر میں رہنے میں خدشہ تھا، لیکن جب تک شادی کی دھوم دھام رہی، اکثر تمام دن یہیں رہتے تھے۔ پیش بندی کے لیے چمپا سے کہا ایک سیٹھ جی کے ہاں 50 روپیہ ماہوار کا کام مل گیا ہے، مگر وہ روپیہ انھیں کے پاس جمع کرتا جاؤں گا، وہ آمدنی صرف زیوروں میں خرچ ہوگی اس میں سے ایک روپیہ گھر کے خرچ میں نہ آنے دوں گا۔"

خاوند کی محبت کا یہ انداز دیکھ کر اسے اپنی قسمت پر ناز ہوا۔ دیوتاؤں پر اس کا اعتقاد اور بھی پختہ ہوگیا۔

اب تک پرکاش اور چمپا میں کوئی راز نہ تھا۔ پرکاش کے پاس جو کچھ تھا وہ چمپا کا تھا۔ چمپا ہی کے پاس اس کے ٹرنک، صندوق اور الماری کی چابیاں رہتی تھیں مگر جب پرکاش کا ایک صندوق ہمیشہ بند رہتا تھا اس کی چابی کہاں ہے؟ اس کا چمپا کو پتا نہیں تھا۔ وہ پوچھتی اس صندوق میں کیا ہے تو وہ کہہ دیتے ہیں۔ "کچھ نہیں پرانی کتابیں ہیں ماری ماری پھرتی تھیں اٹھا کر صندوق میں بند کر دی ہیں۔" چمپا کو شک کی گنجائش نہ تھی۔

ایک دن چمپا انھیں پان دینے گئی، تو دیکھا وہ اس صندوق کو کھولے کچھ دیکھ رہے ہیں۔ اسے دیکھتے ہی ان کا چہرہ فق ہوگیا۔ شبہے کا اکھوا سا نکلا مگر پانی بہہ کر سوکھ گیا۔ چمپا کسی ایسے راز کا خیال ہی نہ کر سکی جس سے شبہہ کو غذا ملتی۔

لیکن 5 ہزار کی پونجی کو اس طرح چھوڑ دینا کہ اس کا دھیان ہی نہ آئے، پرکاش کے لیے ناممکن تھا۔ وہ کہیں باہر جاتا تو ایک بار صندوق کو ضرور کھولتا۔

ایک دن پڑوس میں چوری ہوگئی۔ اس دن سے پرکاش کمرے ہی میں سونے لگا۔ جون کا مہینا تھا۔ گرمی کے مارے دم گھٹتا تھا۔ چمپا نے باہر سونے کے لیے کہا مگر پرکاش نہ مانا، اکیلا گھر کیسے چھوڑ دے۔

چمپا نے کہا۔ "چوری ایسوں کے گھر نہیں ہوتی۔

کچھ بچا بھی

داروغہ (کسان سے) کیا تمھارے گاؤں میں آگ لگ گئی تھی؟

کسان: جی حضور! سارا گاؤں جل کر راکھ ہوگیا۔

داروغہ: کچھ بچا بھی؟

کسان: صرف آگ بجھانے والی موٹر بچی۔ وہ دیر سے آئی تھی۔

(عقیل مرزا، لاہور)

چور کچھ دیکھ کر ہی جان خطرہ میں ڈالتے ہیں۔ یہاں کیا رکھا ہے۔''

پرکاش نے غصہ سے کہا'' کچھ نہیں، برتن تو ہیں، غریب کے لیے تو اپنی ہنڈیا ہی بہت ہے۔''

ایک دن چمپا نے کمرے میں جھاڑو لگایا تو صندوق کھسکا کر ایک طرف رکھ دیا۔ پرکاش نے صندوق کی جگہ بدلی ہوئی دیکھی تو بولا،''صندوق تم نے ہٹایا تھا؟''

یہ پوچھنے کی بات نہ تھی، جھاڑو لگاتے وقت اکثر چیزیں ادھر ادھر کھسکا دی جاتی ہیں۔ بولی ''میں کیوں ہٹانے لگی۔''

''پھر کسی نے ہٹایا۔''

''گھر میں تم رہتی ہو یا کوئی اور؟''

''اچھا اگر میں نے ہی ہٹا دیا تو اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے۔''

''کچھ یوں ہی پوچھا تھا۔''

مگر جب تک صندوق کھول کر تمام چیزیں دیکھ نہ لے پرکاش کو چین کہاں۔ چمپا جیسے ہی کھانا پکانے لگی۔ وہ صندوق کھول کر دیکھنے لگا۔ آج چمپا نے پکوڑیاں بنائی تھیں، پکوڑیاں گرم گرم ہی مزہ دیتی ہیں۔ پرکاش کو پکوڑیاں پسند بہت تھیں۔ اس نے تھوڑی سی پکوڑیاں طشتری میں رکھیں اور پرکاش کو دینے گئی۔ پرکاش نے اسے دیکھتے ہی صندوق دھماکے سے بند کر دیا اور تالا لگا کر اسے بہلانے کے لیے بولا''طشتری میں کیا لائیں، آج نہ جانے کیوں مطلق بھوک نہیں لگی۔ پیٹ میں گرانی معلوم ہوتی ہے۔''

آج چمپا کے دل میں شبہ کا وہ اکھواہ جیسے ہرا ہو کر لہلہا اٹھا۔ صندوق میں کیا ہے؟ یہ دیکھنے کے لیے اس کا دل بے قرار ہوگیا۔ پرکاش اس کی چابی چھپا کر رکھتا تھا۔ چمپا کو وہ چابی کسی طرح نہ ملی۔ ایک دن ایک پھیری والا بساطی پرانی چابیاں بیچنے آنکلا۔ چمپا نے اس تالے کی چابی خرید لی اور صندوق کھول ڈالا، ارے یہ تو زیور ہیں۔ اس نے ایک ایک زیور نکال کر دیکھا۔ یہ کہاں سے آئے۔ مجھ سے تو کبھی ان کے متعلق بات چیت نہیں کی۔ معاً اس کے دل میں خیال گزرا یہ زیورات ٹھاکر صاحب کے تو نہیں، چیزیں وہی تھیں جن کا تذکرہ کرتے رہتے تھے۔ اسے اب کوئی شک نہ رہا لیکن شرم وندامت سے اس کا سر جھک گیا۔ اس نے ایک دم صندوق بند کر دیا اور پلنگ پر لیٹ کر سوچنے لگی۔ ان کی اتنی ہمت کیسے پڑی؟ یہ کمینہ خواہش ان کے من میں آئی کیسے؟ میں نے تو کبھی زیوروں کے لیے انھیں تنگ نہیں کیا۔ اگر تنگ بھی کرتی تو کیا اس کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ چوری کر کے لائیں۔ چوری زیوروں کے لیے۔ ان کا ضمیر اتنا کمزور کیوں ہوگیا؟

اس دن سے چمپا کچھ اداس رہنے لگی۔ پرکاش سے وہ محبت نہ رہی، نہ وہ عزت کا جذبہ، بات بات پر تکرار ہوجاتی۔ پہلے دونوں ایک دوسرے سے دل کی باتیں کہتے..... مستقبل کے منصوبے باندھتے..... آپس میں ہمدردی تھی مگر اب دونوں میں کئی کئی دن تک آپس میں ایک بات بھی نہ ہوتی۔

کئی مہینے گزر گئے۔ شہر کے ایک بینک میں اسسٹنٹ منیجر کی جگہ خالی ہوئی۔ پرکاش نے اکاؤنٹنٹ کا امتحان پاس کیا ہوا تھا، لیکن شرط یہ تھی کہ نقد 10 ہزار روپیہ کی ضمانت داخل کی جائے۔ اتنی رقم کہاں سے آئے، پرکاش تڑپ تڑپ کر رہ جاتا۔

ایک دن ٹھاکر صاحب سے اس معاملہ پر بات

چیت چل پڑی۔ ٹھاکر صاحب نے کہا''تم کیوں نہیں درخواست بھیجتے؟''

پرکاش نے سر جھکا کر کہا، 10 ہزار کی نقد ضمانت مانگتے ہیں۔ میرے پاس روپے کہاں رکھے ہیں۔''

آجی درخواست تو دو، اگر اور سب امور طے ہو جائیں تو ضمانت بھی دے دی جائے گی۔ اس کی فکر نہ کرو۔''

پرکاش نے حیران ہو کر کہا، آپ زرضمانت داخل کردیں گے؟''

''ہاں ہاں یہ کون سی بڑی بات ہے۔''

پرکاش گھر کی طرف چلا تو بڑا اداس تھا۔ اس کو یہ نوکری ضرور ملے گی، مگر پھر بھی خوش نہیں تھا۔ ٹھاکر صاحب کی صاف دلی اور ان کے اس پر اتنے زبردست اعتماد سے اسے دلی صدمہ ہو رہا تھا۔ ان کی شرافت اسکے کمینہ پن کو روندے ڈالتی تھی۔

اس نے گھر آکر چمپا کو خوشخبری سنائی۔ چمپا نے سن کر منہ پھیر لیا، پھر ایک منٹ بعد بولی، ٹھاکر صاحب سے تم نے کیوں ضمانت دلوائی؟ جگہ نہ ملتی نہ سہی، روٹیاں تو مل ہی جاتی ہیں۔ روپے پیسے کا معاملہ ہے، کہیں بھول چوک ہوجائے تو تمھارے ساتھ ان کے پیسے بھی جائیں۔''

''یہ تم کیسے سمجھتی ہو کہ بھول چوک ہوگی، کیا میں ایسا اناڑی ہوں؟''

چمپا نے کہا،'' آدمی کی نیت بھی تو ہمیشہ ایک سی نہیں رہتی۔''

پرکاش سناٹے میں آگیا۔ اس نے چمپا کو چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا مگر چمپا نے منہ پھیر لیا تھا۔ وہ اس کے اندرونی خیال کا اندازہ نہ لگا سکا، مگر ایسی خوشخبری سن کر بھی چمپا کا اداس رہنا اُسے کھٹکنے لگا۔ اس کے دل میں سوال پیدا ہوا، اس کے الفاظ میں کہیں طنز تو نہیں چھپا ہوا۔ چمپا نے صندوق کھول کر کہیں دیکھ تو نہیں لیا۔ اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے وہ اس وقت اپنی ایک آنکھ بھی نذر کرسکتا تھا۔

کھانے کے وقت پرکاش نے چمپا سے پوچھا،''تم نے کیا سوچ کر کہا کہ آدمی کی نیت تو ہمیشہ ایک سی نہیں رہتی؟'' جیسے اس کی زندگی اور موت کا سوال ہو۔

چمپا نے آزردہ ہو کر کہا،'' کچھ نہیں میں نے دنیا کی

جنتا ایکسپریس اور جنتا

جنتا ایکسپریس 7 بجے جالندھر اسٹیشن پر کھڑی تھی۔ حفیظ جالندھری اور ضیاء جالندھری کا ''گراں'' آگیا تھا۔ اُردو کتابوں کی تلاش میں پلیٹ فارم پر اُترا۔ یہاں صرف ایک بک سٹال ''سویت بک لینڈ'' نظر آیا۔ میں نے مطلوبہ کتابوں کی تلاش میں نظریں ادھر اُدھر دوڑائیں لیکن یہاں سرے سے اُردو کی کوئی کتاب ہی موجود نہ تھی، چنانچہ میں نے ''پرتاپ'' اور ''ٹریبیون'' کو غنیمت جانا اور انھیں بغل میں دابے، پلٹ فارم پر اپنی نشست کے سامنے کھڑکی سے لگ کر کھڑا ہوگیا۔ میرے سامنے والی نشست پر بیٹھے بزرگ اسی طرح سفید چادر کی بکل مارے ذکر وفکر میں مشغول تھے۔

اسٹیشن پر موجود لوگوں کو علم ہوگیا تھا کہ اس ڈبے میں پاکستانی سفر کر رہے ہیں، چنانچہ ان کی ایک بڑی تعداد مختلف کھڑکیوں کے سامنے جمع ہوگئی تھی اور زائرین سے گپ شپ میں مشغول تھی۔ دیگر زائرین کی طرح میرے سینے پر بھی پاکستان کا ''بیج'' تھا۔ یہ بیج دیکھ کر تین چار ہندو نوجوان جن کی عمریں 17 سے 20 برس کے درمیان تھیں، میرے گرد جمع ہوگئے اور پاکستان کے بارے میں اشتیاق بھری گفتگو کرنے لگے۔ وہ خصوصاً لاہور کے بارے میں بہت کچھ جاننا چاہتے تھے۔ یوں لگتا تھا لاہور ان کا ''کریز'' بنا ہوا ہے۔ وہ لاہور ٹیلی ویژن کے ڈراموں اور ''نیلام گھر'' کی بہت تعریف کر رہے تھے۔ ریڈیو کا تلقین شاہ بھی انھیں بہت اچھا لگتا تھا اور مہدی حسن تو ان کی کمزوری تھے۔

(عطاء الحق قاسمی کی کتاب''دلی دور است'' سے اقتباس)

بات کہی تھی۔''

پرکاش کی تسلی نہ ہوئی، اس نے پوچھا۔

''کیا جتنے آدمی بینک میں ملازم ہیں، ان کی نیت بدلتی رہتی ہے۔''

چمپا نے گلا چھڑانا چاہا، ''تم تو زبان پکڑتے ہو، ٹھاکر صاحب کے ہاں شادی میں ہی تم اپنی نیت ٹھیک نہ رکھ سکے، سو دو سو روپیہ کی چیز گھر میں رکھ ہی لی۔''

پرکاش کے دل سے بوجھ سا اتر گیا۔ مسکرا کر بولا ''اچھا تمھارا اشارہ اس طرف تھا لیکن میں نے کمیشن کے سوائے ان کی ایک پائی بھی نہیں چھوئی اور کمیشن لینا تو کوئی پاپ نہیں۔ بڑے بڑے حکام کھلے خزانے کمیشن لیا کرتے ہیں۔''

چمپا نے نفرت کے لہجے میں کہا ''جو آدمی اپنے اوپر اتنا یقین رکھے، اس کی آنکھ بچا کر ایک پائی بھی لینا گناہ سمجھتی ہوں۔ تمھاری شرافت جب جانتی کہ تم کمیشن کے روپے جا کر ان کے حوالے کر دیتے۔ ان 6 مہینوں میں انھوں نے تمھارے ساتھ کیا کیا سلوک کیے۔ کچھ یاد بھی ہے؟ مکان تم نے خود چھوڑا لیکن وہ 20 روپے ماہوار دیے جاتے ہیں۔ علاقے سے کوئی سوغات آئی ہے، تمھارے ہاں ضرور بھیجتے ہیں۔ تمھارے پاس گھڑی نہ تھی، اپنی گھڑی تمھیں دے دی۔ تمھاری کہارن جب ناغہ کرتی ہے، خبر پاتے ہی اپنا نوکر بھیج دیتے ہیں۔ میری بیماری میں ڈاکٹر کی فیس انھوں نے ادا کی اور دن میں دو دو مرتبہ پوچھنے آیا کرتے تھے۔ یہ ضمانت کی کیا چھوٹی بات ہے؟ اپنے رشتہ داروں تک کی ضمانت کوئی یوں جلدی سے دیتا نہیں۔ تمھاری ضمانت کے لیے نقد 10 ہزار روپے نکال کر دے دیے۔ اسے تم چھوٹی بات سمجھتے ہو۔ آج تم سے کوئی غلطی ہو جائے تو ان کے روپے تو ضبط سمجھو۔ جو آدمی اپنے اوپر اتنی مہربانی کرے اس کے لیے ہمیں جان قربان کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہنا چاہیے۔''

پرکاش کھانا کر لیٹا تو اس کا ضمیر اسے ملامت کر رہا تھا۔ دُکھتے ہوئے پھوڑے میں کتنا مواد بھرا ہے، یہ اس وقت معلوم ہوتا ہے جب نشتر لگایا جاتا ہے۔ چمپا کے ان ملامت آمیز الفاظ نے پرکاش کی انسانیت کو بیدار کر دیا۔ وہ صندوق کی گنا بھاری ہو کر پتھر کی طرح اسے دبانے لگا۔ پھیلی ہوئی حرارتیں ایک نقطہ پر جمع ہو کر شعلہ گیر ہو گئیں۔

کئی روز گزر گئے۔ پرکاش کو بینک میں ملازمت مل گئی۔ اس تقریب میں اس کے ہاں مہمانوں کی دعوت ہے۔ ٹھاکر صاحب، ان کی اہلیہ ویریندر اور اس کی نئی دُلھن بھی آئے ہوئے تھے۔ باہر یار دوست گا بجا رہے تھے۔ کھانا کھانے کے بعد ٹھاکر صاحب چلنے کو تیار ہوئے۔

پرکاش نے کہا۔ ''آج آپ کو یہاں رہنا ہوگا۔ دادا میں اس وقت نہ جانے دوں گا۔''

چمپا کو اس کی یہ ضد بری معلوم ہوئی۔ چارپائیاں نہیں ہیں۔ بچھونے نہیں ہیں اور نہ کافی جگہ ہی ہے۔ رات بھر مہمانوں کو تکلیف دینے اور خود تکلیف اٹھانے کی کوئی ضرورت اس کی سمجھ میں نہ آئی لیکن پرکاش برابر ضد کرتا رہا۔ یہاں تک کہ ٹھاکر صاحب راضی ہو گئے۔

12 بجے تھے، ٹھاکر صاحب اوپر سو رہے تھے اور پرکاش باہر برآمدہ میں سویا۔ تینوں عورتیں اندر کمرے میں تھیں۔ پرکاش جاگ رہا تھا۔ ویرو کے سرہانے چابیوں کا گچھا پڑا ہوا تھا۔ پرکاش نے گچھا اٹھا لیا۔ پھر کمرے کو کھول کر اس میں زیورات کا ڈبا نکالا اور ٹھاکر صاحب کے گھر کی طرف چلا۔ کئی ماہ پیشتر وہ اسی طرح لرزتے ہوئے دل کے ساتھ ٹھاکر صاحب کے مکان میں گھسا تھا۔ اس کے پاؤں تب بھی اسی طرح تھرتھرا رہے تھے لیکن تب کانٹا چبھنے کا درد تھا آج کانٹا نکلنے کا۔ تب بخار کا چڑھاؤ تھا حرارتِ اضطراب اور خلش سے پر، اب بخار کا اُتار تھا۔ سکون، فرحت اور اُمنگ سے بھرا ہوا تب قدم پیچھے ہٹا تھا لیکن آج آگے بڑھ رہا تھا۔

ٹھاکر صاحب کے گھر پہنچ کر اس نے آہستہ سے ویریندر کا کمرا کھولا اور اندر جا کر ٹھاکر صاحب کے پلنگ کے نیچے ڈبا رکھ دیا، پھر فوراً باہر آ کر آہستہ سے دروازہ بند کیا اور گھر لوٹ پڑا، ہنومان جی سنجیونی بوٹی والا پہاڑ کا ٹکڑا اُٹھائے جس روحانی سرور کا لطف اٹھا رہے تھے، ویسی ہی خوشی پرکاش کو بھی ہو رہی تھی۔ زیوروں کو اپنے گھر لے جاتے ہوئے اس کی جان سوکھی ہوئی تھی۔ گویا کہ کسی گہرائی میں گرا جا رہا ہو۔ آج ڈبے کو لوٹا کر اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ جہاز پر بیٹھا ہوا فضا میں اُڑا جا رہا ہے اوپر اوپر اور اوپر.....

وہ گھر پہنچا تو ویرو سو رہا تھا، چابیوں کا گچھا اس کے سرہانے رکھ دیا۔

ٹھاکر صاحب صبح تشریف لے گئے۔

پرکاش شام کو پڑھانے جایا کرتا تھا۔ آج وہ بے صبر ہو کر تیسرے پہر ہی جا پہنچا دیکھنا چاہتا تھا۔ وہاں آج کیا گل کھلتا ہے۔

ویریندر نے اسے دیکھتے ہی خوش ہو کر کہا ''بابو جی کل آپ کے ہاں کی دعوت بڑی مبارک تھی۔ جو زیورات چوری ہو گئے تھے سب مل گئے۔''

ٹھاکر صاحب بھی آ گئے، اور بولے بڑی مبارک دعوت تھی تمھاری۔ پورا کا پورا ڈبا مل گیا۔ ایک چیز بھی نہیں گئی، جیسے امانت رکھنے کے لیے ہی لے گیا ہو۔''

پرکاش کو ان کی باتوں پر یقین کیسے آئے جب تک وہ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لے کہیں ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ چوری کیا ہوا مال 6 ماہ بعد مل جائے اور جوں کا توں۔

ڈبا کھول کر اس نے بڑی سنجیدگی سے دیکھا، تعجب کی بات ہے..... میری عقل تو کام نہیں کرتی۔

''کسی کی عقل کچھ کام نہیں کرتی بھائی! تمھاری ہی کیوں؟ ویرو کی ماں تو کہتی ہے کوئی غیبی معجزہ ہے۔ آج سے مجھے بھی معجزات پر یقین ہو گیا۔'' ٹھاکر نے کہا۔

پرکاش بولا ''اگر آنکھوں دیکھی بات نہ ہوتی تو مجھے یقین نہ آتا۔''

ٹھاکر، ''آج اس خوشی میں ہمارے ہاں دعوت ہوگی۔''

پرکاش، ''آپ نے کوئی منتر وتر تو نہیں پڑھوا لیا کسی سے۔''

''کئی پنڈتوں سے۔'' ٹھاکر نے مسکرا کر کہا۔

پرکاش بولا، ''تو بس یہ اسی کی برکت ہے۔''

گھر لوٹ کر پرکاش نے چمپا کو یہ خوشخبری سنائی۔ وہ دوڑ کر اس کے گلے سے چمٹ گئی اور نہ جانے کیوں رونے لگی، جیسے اس کا بچھڑا ہوا خاوند بہت مدت کے بعد گھر آ گیا ہو۔

پرکاش نے کہا ''آج ان کے ہاں میری دعوت ہے۔''

''میں بھی ایک ہزار بھوکوں کو کھانا کھلاؤں گی۔''

''تم تو سیکڑوں کا خرچ بتلا رہی ہو۔''

''مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ لاکھوں روپیہ خرچ کرنے پر بھی ارمان پورا نہ ہوگا۔''

پرکاش کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

■■■

ماں جی

اس وقت رات کے ساڑھے آٹھ بجے ہیں۔ میں آپ کی ہدایت کے مطابق کھانا کھا کر اور تھوڑی چہل قدمی کر کے واپس اپنے کمرے میں آ گیا ہوں اور اب حسب معمول آپ کو دن بھر کی کارگزاری لکھ رہا ہوں لیکن نہیں آج میں آپ کو اپنی کارگزاری نہیں لکھوں گا کیونکہ آج میں بہت اُداس ہوں۔

میں اُداس اس لیے نہیں ہوں ماں جی کہ میں آپ سے بہت دور اپنے گاؤں اور اپنے دوستوں سے بہت دور اس اجنبی شہر میں پڑا ہوں اور اپنے آپ کو بے یارومددگار محسوس کرتا ہوں۔ میں اس لیے بھی اُداس نہیں ہوں ماں جی کہ میری کسی غلطی پر آج کالج میں مجھے ڈانٹ پڑی ہے یا کوئی جرمانہ ہوا ہے۔ نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ میں پوری تندہی سے تعلیم حاصل کر رہا ہوں۔ میرے روزمرہ کے معمولات میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اسی طرح صبح تڑکے اٹھتا ہوں، کالج جاتا اور کالج سے سیدھا گھر آتا ہوں۔

میں اداس ہوں

ایک منتظر ماں کے انتظار کا دلدوز ماجرا
وہ ایک ایسا خط لیے پھرتی تھی
جو خود بھی بولتا تھا

غلام مصطفیٰ سولنگی

تو پھر میں کیوں اداس ہوں؟ آپ پریشان ہو رہی ہوں گی۔ کہیں مجھے روپے پیسے کی تو ضرورت نہیں، کسی سے میرا جھگڑا تو نہیں ہو گیا، میں جس مکان میں رہتا ہوں، وہاں تو کوئی تکلیف نہیں۔ نہیں ماں جی! مجھے اس طرح کی کوئی تکلیف نہیں ہے۔ جب تک آپ کا سایہ میرے سر پر موجود ہے مجھے اس طرح کی کوئی تکلیف نہیں ہو سکتی........تو پھر میں کیوں اداس ہوں؟

میں خود نہیں جانتا ماں جی...... کہ میں کیوں اداس ہوں۔ اس طرح معمولی معمولی باتوں پر میں اگر اداس اور غمگین رہنے لگا تو آپ کی وہ امیدیں کیسے پوری ہوں گی، جنھیں آپ نے مجھ سے وابستہ کر رکھا ہے۔ میں دن بھر اپنے آپ کو سمجھاتا رہا ہوں، اس واقعہ کو بھولنے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ جو میری اس لایعنی سی اداسی کا سبب بنا ہے۔ لیکن پچھلے دنوں میں نے ایک کتاب میں پڑھا تھا کہ انسان کسی بات کو بھلانے کی جتنی کوشش کرتا ہے وہ اتنی ہی شدت سے نئے اور پریشان کُن پہلوؤں کے ساتھ سامنے آجاتی ہے۔

شاید میری اداسی کچھ کم ہو سکے، اس لیے میں وہ واقعہ من و عن بیان کرتا ہوں جو آج صبح میرے ساتھ پیش آیا اور جس کے متعلق میں دن بھر سوچتا رہا ہوں۔

ہوا یہ کہ آج صبح جب میں کالج جانے کی تیاری کر رہا تھا تو بلا اجازت دروازے پر دستک دیے بغیر ایک عورت میرے کمرے میں چلی آئی اور اس طرح بلا اجازت بغیر کچھ کہے سنے میرے پلنگ پر بیٹھ گئی۔

کسی عورت کے اس طرح میرے کمرے میں گھس آنے کا ذکر پڑھ کر آپ پریشان نہ ہوں کیونکہ اس عورت کی عمر آپ کی عمر سے بھی زیادہ تھی۔ جب میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو اسی طرح جیسے پیار سے آپ مجھے ''بیٹا'' کہہ کر پکارتی ہیں۔ اس نے بھی مجھے ''بیٹا'' کہا۔

اس نے کہا ''بیٹا......! میں تمھیں ایک تکلیف دینے آئی ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک مُڑا تڑا لفافہ میری طرف بڑھا دیا اور بڑے اشتیاق سے بولی ''میرے بیٹے کا خط ہے۔''

میں نے کسی حیل وحُجت کے بغیر فوراً خط پڑھا۔ کوئی خاص بات نہیں لکھی تھی۔ بالکل عام سا خط تھا جیسے میں ہر روز آپ کو لکھتا ہوں۔ یہی کہ میں بہت اچھی طرح سے ہوں، آپ بہت یاد آتی ہیں، آپ سے ملنے کو بہت دل چاہتا ہے لیکن میں نے دیکھا کہ جوں جوں میں خط پڑھ رہا تھا، مارے خوشی کے اس کی حالت عجیب ہو رہی تھی، جیسے وہ مجھ سے خط نہ سن رہی ہو، اپنے پیارے بیٹے کے میٹھے میٹھے بول خود اس کی زبان سے سن رہی ہو۔ جیسے وہ خط نہ آیا ہو، خود اس کا بیٹا آ گیا ہو۔ اس کی حالت دیکھ کر مجھے آپ کی بہت یاد آئی۔ اس ماں کے روپ میں میں نے اپنی ماں کو دیکھ لیا۔ اپنی پیاری ماں کو جو اس طرح میرے خطوں پر پھولے نہیں سماتی ہو گی۔ میرا دل آپ سے ملنے کو بے قرار ہو اُٹھا۔ بیچ بیچ میں ٹوک ٹوک کر اس نے ایک ایک جملہ کئی کئی بار سنا اور ہر جملے پر اپنے بیٹے کو لاکھ لاکھ دعائیں دیں۔ ساتھ ساتھ مجھے بھی دعائیں دیں کہ میں اسے اس کے بیٹے کا خط پڑھ کر سنا رہا ہوں۔ ''ورنہ'' اس نے ماتھے پر تیوری چڑھا کر کہا ''یہاں کے لوگ تو ایسے طوطا چشم ہیں بیٹا کہ کسی کا خط پڑھ کر نہیں دیتے۔ الٹا دھتکار دیتے ہیں۔''

دوسری باتوں کے علاوہ خط سننے کے دوران میں ہی اس نے بتایا کہ وہ میرے قریب پڑوس میں رہتی ہے اور بلا ناغہ مجھے کالج جاتے اور کالج سے لوٹتے ہوئے دیکھا کرتی ہے۔ اس کے بیٹے کی عمر اور میری عمر میں مشکل سے ایک دو سال کا فرق ہو گا۔ وہ بھی میری طرح بڑا ہنس مکھ اور دوسروں کے کام آنے والا ہے۔

انگریزوں کے کردار کی حقیقت

مغربی ممالک اور انگلستان سے آنے والے لوگ انگریز قوم کے مہذب ہونے کی بڑی تعریفیں کرتے ہیں۔ کسی انگلش آدمی کی کہنی غلطی سے آپ کو جا لگی یا اُس کا پاؤں آپ کے پاؤں پر آپڑا تو وہ آپ کو ''سوری'' ضرور کہے گا۔ آپ اس کا کوئی چھوٹا سا کام بھی کردیں تو بڑی دیر تک آپ کا احسان مند رہے گا۔ ہمارے جو دوست مڈل ایسٹ سے ہوکر آتے ہیں وہ عربوں کے جذباتی ہوجانے اور غلط رویے پر اظہارِ تشویش کرتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ عرب لوگ بہت جلد برانگیختہ ہوجاتے ہیں۔ انفرادی حیثیت سے تو یہ بات بالکل بجا ہے مگر آپ تھوڑا سا بھی غور کریں تو خیال آئے گا انگلش لوگوں کا انفرادی اخلاق تو بہت اچھا ہے مگر من حیث القوم ان کا کردار کیا ہے؟ اُنھوں نے ہر ملک پر چڑھائی کی، اردگرد بسنے والی ہر قوم کا استحصال کیا، ساری قوموں کو محکوم بنایا مگر اس کے مقابلے میں عربوں کے کردار کو ایک قوم کی حیثیت سے دیکھیں تو اس کی مثال ہی نہیں ملتی۔ اُنھوں نے اگر دوسری قوموں سے جنگ کی تو اُسی صورت میں جب اُن کے آفاقی دین کے آگے وہ لوگ رکاوٹ بنے ورنہ اُنھوں نے ہر قوم کو بھائیوں جیسا پیار دیا حتیٰ کہ مفتوح قوموں کے پورے حقوق دیے۔

(ڈاکٹر سلیمان عبداللہ کی کتاب ''قطرہ قطرہ دریا'' سے اقتباس)

''کتنی خوش نصیب ہیں وہ مائیں'' یکا یک اُچک کر اس نے میرا ماتھا چوم لیا، ''جن کے بیٹے ایسے خوبیوں بھرے ہوں'' اور جب میں نے خط کے وہ جملے دہرائے جن میں اس کے بیٹے نے لکھا تھا کہ اس نے چھٹی کی درخواست دے رکھی ہے اور چھٹی ملتے ہی وہ اپنی پیاری ماں سے ملنے آئے گا تو مارے خوشی کے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ پھر بڑے فخر سے بولی ''دیکھا! کتنا اچھا ہے میرا بیٹا۔'' اور پھر کافی دیر تک وہ اپنے بیٹے کی تعریفیں کرتی رہی۔ اس نے بتایا کہ کس طرح شوہر کی وفات کے بعد انگلیوں کی پوریں توڑ توڑ کر اس نے اسے پالا پوسا اور پڑھایا لکھایا تھا اور اب..... اب اس کے سارے دکھ درد دُور ہوگئے تھے۔ ایسا نیک اور ایسا سعادت مند بیٹا خدا ساری دنیا کی ماؤں کو دے اور پھر بڑے رازدارانہ لہجے میں اس نے کہا ''میں نے اس کے لیے چاندسی بہو دیکھ رکھی ہے۔ آتے ہی بیاہ کردوں گی۔'' اور بالکل بچوں کی سی خوشی کے ساتھ وہ تالیاں بجانے لگی۔

ماں جی! آپ سوچ رہی ہوں گی کہ یہ تو کوئی خاص بات نہ ہوئی۔ ہر ماں اپنے بیٹے سے اتنا ہی پیار کرتی ہے اور آپ تو مجھے اس سے بھی زیادہ پیار کرتی ہیں۔ پھر اس واقعہ سے میں اداس کیوں ہوا؟

یہاں مجھے اداس نہیں ہونا چاہیے۔ اگر ایسی معمولی معمولی باتوں پر میں اداس رہنے لگا تو آپ کی وہ اُمیدیں پوری نہ ہوسکیں گی، جنھیں آپ نے مجھ سے وابستہ کر رکھا ہے اور جنھیں پورا کرنے کی میں نے آپ کے سامنے قسم کھائی تھی۔ لیکن بات یہ ہے ماں جی! وہ خط آج سے 25 برس پہلے کا لکھا ہوا تھا اور کسی محاذِ جنگ سے آیا تھا۔

■■■

فاضل مصنف پی ٹی وی کراچی میں پروڈیوسر ہیں۔ ایسے مختصر افسانے اُن کی خاص پہچان ہیں، جو پڑھنے والوں کو ایک اور ہی دُنیا میں لے جاتے ہیں

سرخ سیارے پر مفادات کی جنگ

ایک اور سیارے پر پائی جانے والی زندگی کا ماجرا
وہاں انسانوں نے اپنی ذہانت کا لوہا منوانے
میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی

ایرک وِنی کوف / فیضان اللہ خان

پچھلی قسط کا خلاصہ

سرخ سیارے پر مفادات کی جنگ سے متعلق پہلی قسط آپ مئی کے شمارے میں ملاحظہ فرما چکے ہیں، جس میں ٹموتھی لو کے سرخ سیارے پر ریلوے لائن بچھانے کے منصوبے سے متعلق تفصیل تھی۔ جب ٹموتھی لو کو پتا چلا کہ ایک آئرش تاجر مائیکل کلین اُس کا منصوبہ چرا کر اُس کے مدمقابل آچکا ہے تو اُس نے اپنے اردگرد موجود کچھ لوگوں کی صفائی کرنے کا سوچا تاکہ سرخ سیارے پر بچھائی جانے والی ریلوے لائن صرف اُسی کی رہے

اقوام متحدہ کے خلائی ادارے ''اُنسا'' (United Nations Space Agency) کو اقوام متحدہ کے مرکزی دفاتر میں جگہ نہیں ملی تھی۔ اسے شہر کے مضافاتی علاقے میں ایک اوسط درجے کے دفتری بلاک کی تین منزلیں فراہم کی گئی تھیں۔ ٹموتھی لو ڈائریکٹر اوبومی کے دفتر سے ملحقہ انتظار گاہ میں بیٹھا ملاقات کی گھڑیاں گن رہا تھا۔ قریب ہی کینڈس دستی کمپیوٹر پر اب تک کی رپورٹوں کا خلاصہ تیار کر رہی تھی۔

''مسٹر لو! اب ڈائریکٹر صاحب آپ سے ملیں گے، اندر تشریف لے جائیے۔'' سیکرٹری نے اندرونی دروازے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

یونائیٹڈ نیشنز سپیس ایجنسی کے ڈائریکٹر اڈی اوبومی کا دفتر بیوروکریسی کے معیار سے بھی کچھ زیادہ شاندار نہ تھا۔ وہ کاروباری لوگوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتا اور ٹموتھی کو انتظار کروا کر اس نے اس حقارت کا اظہار بھی کر دیا تھا۔ چہرے پر ایک مصنوعی مسکراہٹ لیے وہ اپنی میز پر سے اٹھا۔ ''شام بخیر، مسٹر لو۔'' دونوں نے مصافحہ کیا۔ ''میں آپ کو انتظار کی زحمت دینے کی معافی چاہتا ہوں۔ دراصل یہ ہمارے بجٹ میں کی جانے والی کٹوتیوں کی مہربانی ہے کہ ایک ایک فرد کو تین تین آدمیوں کا کام کرنا پڑ رہا ہے۔''

''کوئی بات نہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ نے مجھ سے ملاقات کے لیے اپنے قیمتی وقت میں سے کچھ وقت نکالا۔''

دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ڈائریکٹر اوبومی نے گفتگو کا آغاز کیا۔ ''آپ کی تجویز بڑی خیال افروز ہے لیکن مجھے اس بارے میں شبہ ہے کہ ہمارے ادارے کے لیے آپ کو زمین کی مطلوبہ گرانٹ فراہم کرنا ممکن ہو پائے گا۔''

''لیکن کیوں؟ آخر اس سے پہلے آپ نے کنسورشیم اور ای آئی پی کو بھی مریخ کی زمین گرانٹ میں دی ہے۔ پھر مجھے کیوں نہیں دے سکتے؟''

''اقوام متحدہ نے نظام شمسی کا انتظام نوع انسانی کی فلاح کی خاطر اٹھایا سنبھالا ہے۔ قطبین کی زمین گرانٹ کرنے کا مقصد مریخ کی سرزمین کو اس کے وسائل کا کھوج لگانے اور ان سے فائدہ اٹھانے کے لیے کھولنا تھا۔''

''اسی لیے تو آپ کو میری ریلوے لائن کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ اس وقت مریخ پر دو قطعات آباد ہیں یا پھر آپ کا ''لوول ریسرچ سٹیشن'' ہے۔ اس کے علاوہ باقی تمام سیارہ ڈھنڈار، لق و دق پڑا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ مریخ پر 11 ہزار کلومیٹر طویل ریلوے لائن بچھانے میں جو فوائد پوشیدہ ہیں، آپ ان کا ادراک کر سکتے ہیں۔''

''اگر آپ صرف ریلوے لائن بچھانے کے لیے راستے کے حقوق کا مطالبہ کرتے تو اس کا اہتمام کیا جا سکتا تھا مگر یہ جو آپ راستے کے ساتھ ساتھ 5 کلومیٹر کے فاصلے تک کا رقبہ مانگ رہے ہیں، اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔''

''اس کی وجہ اس منصوبے کو مالی لحاظ سے قابل عمل بنانا ہے۔ اس کے کچھ حصے پر تو اسٹیشن اور ریلوے سفر سے متعلق دیگر سہولیات تعمیر کی جائیں گی اور باقی زمین کو کاروبار میں لگا دیا جائے گا۔''

''اچھا آپ کا مطلب ہے کہ اقوام متحدہ آپ کو 55 ہزار مربع کلومیٹر زمین دے دے اور آپ اسے بیچ کھائیں؟''

''دیکھیے جناب! اس وقت یہ ساری زمین کوئی بھی نہیں لینا چاہتا۔ سوائے قطبی علاقوں کے پورے مریخ پر زمین کا ایک بھی خطہ ایسا نہیں ہے جس کی کوئی قیمت لگائی جا سکے۔ جب میری ریلوے لائن بچھنے کے باعث جائیداد کی کوئی قیمت لگانا ممکن ہو جائے گا تو اس کے فوائد میں سے کچھ حصہ اگر مجھے بھی مل جائے تو اس میں آپ کو کیا اعتراض ہے؟ یاد رہے کہ ریلوے لائن کے دوسری جانب کا 55 ہزار مربع کلومیٹر رقبہ تو آپ کی ملکیت ہوگا۔ آپ کو تو اس میں ہماری نسبت کہیں زیادہ فائدہ ہے۔''

ڈائریکٹر اوبومی نے 'اُنسا' کے اخراجات کے لیے اضافی آمدنی کے امکانات کا تصور کرتے ہوئے اپنے چہرے کو سکیڑا لیکن اسے اب بھی اس تجویز کو قبول کرنے میں تامل تھا۔ ''آپ جو گرانٹ مانگ رہے ہیں، وہ قطبین کی مجموعی گرانٹ سے بھی کہیں زیادہ ہے۔ جناب سیکرٹری جنرل کو قائل کرنا انتہائی دشوار ہوگا خصوصاً جب میڈیا یہ خبر اچک لے گا۔''

ٹموتھی لو نے اپنا سر ہلایا۔ ''میں خلا میں بنی نوع انسان کے مستقبل سے متعلق تصور میں آپ کا شریک ہوں لیکن مجھے افسوس ہوتا ہے جب اس تصور کو بُری طرح پامال کیا جاتا ہے۔''

''کیا مطلب ہے آپ کا؟''

''آپ اپنے محدود وسائل کو استعمال کرتے ہوئے بڑے بڑے کارنامے سرانجام دیتے ہیں لیکن اگر آپ جنرل اسمبلی کی حمایت حاصل کر لیں تو آپ مزید بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ چھوٹے دماغ آپ کے کام کی اہمیت کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ میری مجوزہ ریلوے لائن انسانی ترقی کا ایک نیا محاذ کھولے گی۔ محاذ سے مراد ہے لوگ۔ لوگ ہی ٹیکس ادا کرتے اور ووٹ دیتے ہیں اور انہی کو عوامی سہولیات کی ضرورت ہوتی ہے۔ آخرکار آپ کو اپنا بجٹ بڑھانا اور عملے میں اضافہ کرنا ہوگا اور.....''

یہ کہتے ہوئے اس نے دفتر کے حد سے زیادہ سادہ گرد و پیش پر چھچھلتی ہوئی نظر ڈالی ''اپنی بڑھتی ہوئی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کوئی ڈھنگ کا دفتر بھی قائم کرنا ہوگا۔''

چند منٹ بعد جب ٹموتھی لو رخصت ہونے لگا تو ڈائریکٹر اوبومی نے دروازے تک اس کا ساتھ دیا۔ اس مرتبہ اس کے چہرے پر پُرخلوص مسکراہٹ تھی۔ ''جونہی مجھے اس مسئلے کا کوئی بہتر حل ملا، میں فوراً آپ کو بلاؤں گا۔''

''بہت بہت شکریہ! یہ میرے لیے بے حد خوشی کا مقام ہوگا۔''

اس کے بعد کئی ہفتے تک منصوبہ بندی، تنظیم سازی اور پس پردہ رشوت ستانی کا دور چلتا رہا۔ آخرکار بلاوا آ گیا۔

''مجھے امید ہے، کوئی اچھی خبر سننے کو ملے گی'' ٹموتھی لو استفہامیہ انداز میں بولا۔

''ہاں بھی اور نہیں بھی۔'' ڈاکٹر اوبومی نے جواب دیا۔ ''یونائیٹڈ نیشنز سپیس ایجنسی آپ کو زمین کی گرانٹ دینے کے لیے تیار ہے بشرطیکہ آپ ہمیں لوول کے تحقیقی مرکز یا کسی بھی دوسرے مرکز تک، جو ہم مستقبل میں قائم کریں، نقل و حمل کی مفت سہولتیں فراہم کریں۔''

''اور بری خبر؟''

''ہمیں آپ کی درخواست سے ملتی جلتی ایک اور درخواست موصول ہوئی ہے جو السٹر مارس ریل روڈ کمپنی کی طرف سے آئی ہے۔''

''اور جس کا مالک اور چلانے والا مائیکل کلین ہے۔ ہے ناں؟'' ٹموتھی لو نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

''ہاں۔ آپ صحیح سمجھے۔ آپ دونوں کی درخواستوں

کے ساتھ ایک جیسا برتاؤ کرنا ہمارے لیے ضروری تھا۔ چنانچہ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ آپ دونوں کے درمیان ایک ''دوڑ'' کرائی جائے۔ ریلوے لائنوں کی دوڑ۔''

''کیا مطلب؟''

''بات دلچسپ ہے لیکن آپ دونوں نے ریلوے لائن بچھانے کے لیے بالکل ایک جیسی درخواستیں دی ہیں اور ایک ہی راستہ منتخب کیا ہے۔'' ڈائریکٹر اوبومی بولا ''چنانچہ اُنسا نے فیصلہ کیا ہے کہ آپ اپنی ریلوے لائن نارتھ پولر کنسورشیم کے علاقے سے بچھانا شروع کریں گے جبکہ السٹر مارس کمپنی اس کام کا آغاز یورپین انڈسٹریل پارک سے کرے گی۔ منصوبے میں استعمال ہونے والے تمام ساز و سامان کی چھان پھٹک ہوگی، آپ دونوں اپنی اپنی ریلوے لائن تعمیر کرتے جائیں گے۔ جس جگہ آپ دونوں کی ریلوے لائن ملے گی، مقام آغاز سے وہاں تک کی زمین کے حقوق متعلقہ پارٹی کو دے دیے جائیں گے۔ یعنی جو اس دوڑ میں جتنا زیادہ فاصلہ طے کرے گا، اسے اتنی زیادہ زمین ملے گی۔ یہ ایک طرح کی دوڑ ہی تو ہے.....!''

کئی سیکنڈ تک ٹموتھی لو پر خاموشی طاری رہی۔ آخر اس نے پوچھا ''مالی جنون کا یہ بیہودہ مشورہ بھلا کس نے دیا ہے؟ شاید مسٹر کلین نے۔ میں تو اس شخص کو جانتا تک نہیں لیکن اب میرے دل میں اس سے سخت نفرت پیدا ہونا شروع ہوگئی ہے۔''

''مجھے افسوس ہے کہ آپ نے اس قدر منفی طرزِ عمل اختیار کیا ہے۔'' ڈائریکٹر اوبومی بولا ''تاہم اگر آپ مکمل تفصیلات معلوم کرنا چاہیں تو جمعرات کو صبح 10 بجے میرے دفتر تشریف لا سکتے ہیں۔''

☆☆☆

اِڈاچی کمپنی کا کمپلیکس خاص قسم کے شیشے سے تعمیر کردہ گنبدوں کا ایک جمگھٹا تھا جن کا سائز مریخ کی کم کشش کی بدولت اتنا بڑا تھا کہ زمین پر اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کمپنی کے مالک ہیڈا اڈاچی کا دفتر ایسے ہی ایک گنبد کی بالائی منزل میں واقع تھا جہاں سے چاروں جانب روشنیوں سے جگمگاتے کمپلیکس کا مکمل نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ رات کے وقت میں آسمان ستاروں سے بھرا ہوا نظر آ رہا تھا۔ مریخ کا ننھا منا سا چاند ''فوبوس'' مغرب کی جانب سے طلوع ہوتا ہوا ایک انوکھا منظر پیش کر رہا تھا۔

ٹموتھی لو اس منظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا جبکہ ہیڈا اڈاچی اپنی سیٹ پر براجمان تھا جو ایک ڈیسک اور اس سے منسلک مانیٹر پر مشتمل تھی۔ اُنسا کے نکھے سے دفتر کے مقابلے میں یہ دفتر اڈاچی کمپنی کی عظمت، کامیابی اور جدید ترین ٹیکنالوجی کے استعمال کی عکاسی کر رہا تھا۔

''خوش آمدید مسٹر لو'' ہیڈا اڈاچی بولا۔ ''آپ سے ملاقات میرے لیے باعثِ عزت ہے۔ جب سے کنسورشیم وجود میں آیا ہے، آپ کے ریلوے لائن والے پراجیکٹ سے زیادہ ولولہ انگیز پراجیکٹ میری نظر سے نہیں گزرا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں تو ابھی سے اس کے سحر میں مبتلا ہو چکا ہوں۔''

''بہت شکریہ! ویسے یہ واقعی ایک نادر موقع ہے۔'' چند منٹ تک دونوں خوشگوار موڈ میں باتیں کرتے رہے۔ تب ہیڈا اڈاچی نے پرتجسس لہجے میں سوال کیا ''کیا اڈاچی کمپنی اس عظیم منصوبے میں کسی طرح آپ کی معاونت کر سکتی ہے؟''

''جی ہاں، ایسا ممکن ہے۔'' ٹموتھی لو نے ایک میموری ڈسک جیب سے نکال کر صاف ستھرے دھاتی

ڈیسک کے اوپر سے ہیڈا اڈاچی کی جانب کھسکا دی۔

''مجھے آپ سے جس قسم کا تعاون درکار ہے، اس کی تفصیلات اس ڈسک میں موجود ہیں۔ کیا میں اس کا عمومی خاکہ آپ کی خدمت میں زبانی پیش کروں؟''

''جی ضرور!''

''کنسورشیم والوں کا خیال ہے کہ ریلوے لائن کا بچھانا کسی بھی طرح منافع بخش ثابت نہیں ہو سکتا، تاہم انھوں نے اس سلسلے میں جو حساب کتاب لگایا ہے، اس کی بنیاد اس مفروضے پر رکھی گئی ہے کہ اس کام میں بہت بڑے پیمانے پر خودکار مشینری استعمال ہوگی لیکن یہ کام ایک اور طریقے سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ وہ ہے افرادی قوت کا استعمال۔ اِنسان نے جن شرائط پر میرے منصوبے کی منظوری دی ہے، ان کی وجہ سے میرے لیے ضروری ہے کہ میں زیادہ سے زیادہ رفتار سے ریلوے لائن بچھاؤں۔ چنانچہ میرا ارادہ ہے کہ میں پانچ ہزار افراد زمین سے منگواؤں۔''

ہیڈا اڈاچی بڑے اعداد سے کھیلنے کا عادی تھا لیکن یہ تجویز اس کے تصور سے بھی بالاتر تھی۔ ''آپ اتنی بڑی تعداد میں مزدور منگوانے کے اخراجات کیسے برداشت کریں گے؟'' اس نے بے تابی سے کہا۔ اس کا تجسس شائستگی پر غالب آتا جا رہا تھا۔ ''مزدوروں کے اخراجات تو مشینوں سے بھی زیادہ ہیں۔''

''ضروری نہیں'' ٹموتھی لو نے کہا ''میں نے پانچ ہزار چینی کسانوں اور ان کے خاندانوں کو زمین سے درآمد کرنے کا بندوبست کر لیا ہے۔ چین کی حکومت بخوشی یہ معاہدہ کرنے پر رضامند ہو گئی ہے، دراصل وہاں پر خاندانی منصوبہ بندی کے پروگرام کے متوقع نتائج برآمد نہیں ہو رہے۔ انہیں ''سرد نیند'' کی حالت میں یہاں لایا جائے گا۔''

''لیکن وہ اپنے گھر بار چھوڑ کر اس ناسازگار مقام پر آنے کے لیے کیونکر رضامند ہوں گے؟''

''زمین کی ملکیت کی خاطر۔ یہ دراصل وہ کاشتکار ہیں جن کی زمینیں قومی تحویل میں لے لی گئی تھیں۔ میں انہیں معاوضہ رقبے کی شکل میں دوں گا، نہ کہ رقم کی صورت میں۔''

یہ سن کر ہیڈا اڈاچی بے ساختہ کھلکھلا کر ہنسنے لگا۔ پھر بولا ''معاف کیجیے گا..... لیکن مریخ پر کاشتکاروں اور کھیتی باڑی کا تصور ہی کچھ ایسا ہے کہ مجھ سے ہنسی ضبط نہ ہو سکی۔''

''اس میں ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' ٹموتھی لو نے سنجیدگی سے اپنی بات جاری رکھی ''دیکھیے، آپ نے اپنی کمپنی کے لیے یہ دیوہیکل گنبد بنوائے ہیں ناں۔ اسی طرح کے بڑے بڑے گنبد آپ مریخ کی بنجر زمین پر تعمیر کریں۔ ان میں ہوا بھریں، جس کے لیے آکسیجن پانی سے لی جا سکتی ہے، جبکہ نائٹروجن اور کاربن ڈائی آکسائیڈ آپ کو مریخ کے کرۂ ہوائی سے وافر مقدار میں مل جائیں گی۔ پھر آپ کسی کمیونٹی ری ایکٹر سے یہاں تک حرارت اور بجلی کی فراہمی کے لیے لائن بچھائیں۔ پانی کی فراہمی کے لیے آپ قطبی برف کو پگھلا سکتے ہیں اور غیر قطبی علاقوں میں زمین کھود کر پائپوں کے ذریعے نکال سکتے ہیں۔ اس کے بعد آپ چٹانوں کو باریک پیس کر اس میں ضروری نامیاتی مادے شامل کریں۔ اس طرح زرخیز مٹی وجود میں آجائے گی۔ آخر میں آپ ان گنبدوں کو ایسے پودوں اور جانوروں سے بھر دیں جو مریخ کے ماحول سے مطابقت اختیار کر چکے ہوں۔ یوں ایک زرعی فارم وجود میں آجائے گا۔''

(جاری ہے.....)

آہ کا اثر

ایک دُکھی دِل سے نکلی آہ اور بددعا کا قصہ

دوسروں کی زندگی عذاب بنانے والے کبھی خود بھی اس عذاب کی زد میں آتے ہیں

عامر سلیم

میں صوبیدار ریٹائرڈ محبت خان کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ والدین نے میری پیدائش کے موقع پر بہت ہی خوشی منائی اور میرا نام لہراسب خان رکھا۔ نام کے برعکس ابا مرحوم بڑی سخت طبیعت کے مالک تھے۔ غصہ بہت کرتے اور اپنی بات منوانے کے عادی تھے۔ گاؤں میں ہماری زمین علاقے کے تمام زمینداروں سے زیادہ تھی۔ ابا جان کو مجھ سے بہت محبت تھی۔ وہ مجھے بچپن میں ہی کیپٹن کہا کرتے تھے۔ انھوں نے یہ عہد کر رکھا تھا کہ وہ مجھے اچھی اور اعلیٰ تعلیم دلا کر فوج میں کمیشن دلوائیں گے۔ گاؤں کے لوگ ابا جان کے رُعب اور دبدبے کی وجہ سے ہماری عزت اور احترام کرتے۔ کمی کمین تو ان سے بہت ڈرتے تھے۔ ایک دن گاؤں کے مُصلّی مقبول کے گھر بیٹے نے جنم لیا۔ اس نے بھی اپنے بیٹے کا نام لہراسب رکھ دیا۔ جب ابا جان کو معلوم ہوا تو انھوں نے اسے حویلی میں بلایا اور چھترول کر ڈالی، اپنے بیٹے کا نام لہراسب کیوں رکھا؟ سبھی گاؤں والوں نے یہ تماشا دیکھا۔ مقبول نے ابا جان کے پاؤں پکڑ کر معافی مانگی اور بیٹے کا نام بدل کر ساجد رکھ دیا۔ اس کے بعد گاؤں میں کسی نے اپنے بیٹے کا نام لہراسب نہ رکھا۔ اس وقت میں گاؤں کے اسکول میں پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ میں نے بھی مقبول مُصلّی کی پٹائی اپنی آنکھوں سے دیکھی اور اس کی وجہ بھی جان گیا۔ تب سے میں اپنے نام پر فخر کرنے لگا۔ میں اپنا پورا نام چوہدری لہراسب خان لکھا کرتا تھا۔ ایسا کر کے مجھے فخر اور طمانیت کا احساس ہوتا۔

گاؤں کے اسکول سے پرائمری پاس کرنے کے بعد ابا جان نے مجھے نزدیکی قصبہ سوہاوہ کے ہائی اسکول میں داخل کرا دیا۔ میٹرک کا امتحان میں نے امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ گورڈن کالج راولپنڈی سے میں نے ایف۔ ایس۔ سی فرسٹ ڈویژن میں پاس کی اور ابا جان کی کوششوں اور اپنی محنت کے بل بوتے پر آرمی میں کمیشن حاصل کر لیا اور بی۔ ایم۔ اے کاکول ایبٹ آباد چلا گیا۔ ابا جان بہت خوش تھے کہ میں نے ان کے خوابوں کی تکمیل کر دی۔ پورے علاقے میں دھوم مچ گئی کہ صوبیدار کا بیٹا فوجی افسر بن رہا ہے۔ میں جب پہلی بار گھر گیا، تو پورا گاؤں مبارک دینے ہماری حویلی میں آ گیا۔ ابا جان نے منوں کے حساب سے مٹھائی بانٹی تھی۔ میں بھی خوش تھا اور اپنے آپ پر فخر کر رہا تھا۔

کاکول اکیڈیمی سے پاسنگ آؤٹ کے بعد میری تقرری کراچی ہوگئی۔ پھر مختلف شہروں میں گھومتے گھومتے میں میجر بن گیا۔ پنوں عاقل میں ایک یونٹ میرے حوالے کی گئی تو میری ذمہ داریوں میں اضافہ ہو گیا۔ یونٹ کے لوگوں سے جب میرا تعارف کرایا گیا تو ایک سپاہی سے مل کر میں نہ صرف چونکا بلکہ میرے اندر حسد اور نفرت نے جنم لیا۔ اتفاق سے اس کا نام بھی لہراسب خان تھا۔ یہ میری برداشت سے باہر تھا کہ میری ہی یونٹ میں کوئی میرا ہم نام ہو۔ پہلے دن ہی سے مجھے خواہ مخواہ اس سپاہی سے بیر ہو گیا۔ نام تبدیل کرانا تو میرے بس میں نہ تھا، مگر اسے ہر معاملے میں نظر انداز کرنے لگا۔ میں اس کے کام میں کیڑے نکالتا اور اسے ڈانٹ بھی دیتا مگر وہ کوئی گلہ شکوہ نہ کرتا اور میری ڈانٹ ڈپٹ سہہ لیتا۔ کسی کو بھی وجہ معلوم نہ تھی کہ میں لہراسب سپاہی کے ساتھ سختی سے کیوں پیش آتا ہوں۔ اس کی شکل وصورت بھی دلکش تھی اور وہ ایک بھرپور جوان تھا۔ یونٹ میں مقبول تھا کہ اس کا اخلاق اچھا تھا، مگر مجھے اس کی شکل اور کوئی بات اچھی نہ لگتی۔ ان دنوں ہماری یونٹ کوئٹہ میں تھی کہ لہراسب کی شادی طے ہوگئی۔ اس نے ایک ماہ کی چھٹی کی درخواست لکھی جو میں نے نامنظور کر دی اور اسے صرف 6 دن کی رخصت دی۔ وہ میانوالی کے نواح میں ایک گاؤں کا رہنے والا تھا۔ کوئٹہ سے وہاں جانے میں ایک دن تو لگ ہی جاتا تھا۔ لہراسب نے یونٹ کے صوبیدار سے سفارش کرائی کہ میں اس کی چھٹی بڑھا دوں مگر میں نے انکار کر دیا، وہ گاؤں چلا گیا۔ اس کی شادی ہوگئی..... یونٹ سے دو ساتھی اس کی شادی میں شرکت کرنے گئے۔ 6 دن بعد وہ واپس ڈیوٹی پر آ گیا۔ اس نے شادی کی خوشی میں یونٹ کے ساتھیوں کو پارٹی دی مگر میں نے کوئی بہانہ بنا دیا اور اس کی خوشی میں شریک نہ ہوا۔ میری غیر حاضری کو یونٹ کے سبھی لوگوں نے محسوس کیا مگر میں بے حس بنا رہا حتیٰ کہ میں نے اسے شادی کی مبارکباد بھی نہ دی۔ ابا جان میری شادی جہلم شہر میں رہنے والے ایک ریٹائرڈ میجر کی بیٹی سے کرنا چاہتے تھے۔ پہلے تو وہ ٹال مٹول کرتے رہے، مگر جب میں میجر بن گیا تو انھوں نے ہاں کر دی۔ یوں میری شادی ابا جان کی مرضی کے مطابق ہوگئی۔ میں نے اپنی شادی پر سوائے افسروں کے کسی کو نہ بلایا اور پورے ایک ماہ کی چھٹی بھی گزاری۔ یونٹ والوں کو میری شادی کا علم ہوا تو سب نے مجھے مبارک دی۔ ان میں لہراسب بھی شامل تھا۔ یونٹ والوں کے اصرار پر میں نے آرمی میس میں پارٹی کا انتظام کیا۔ جس میں لہراسب نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور دوڑ دوڑ کر سارے کام کیے مگر اس کی پھرتیاں میرا دل موم نہ کر سکیں۔ میرے اندر حسد کی آگ

کسی مرغی کی بات پر دھیان نہ دیجیے

کہتے ہیں ایک پہاڑ کی چوٹی پر لگے درخت پر ایک عقاب نے اپنا گھونسلا بنا رکھا تھا جس میں اُس کے دیے ہوئے چار انڈے پڑے تھے کہ زلزلے کے جھٹکوں سے ایک انڈا نیچے جا گرا جہاں ایک مرغی کا ٹھکانہ تھا۔ مرغی نے عقاب کے انڈے کو اپنا انڈا سمجھا اور سینے کے لیے اپنے نیچے رکھ لیا۔ ایک دن اُس انڈے سے ایک پیارا سا ننھا منا عقاب پیدا ہوا جس نے اپنے آپ کو مرغی کا چوزہ سمجھتے ہوئے پرورش پائی اور مرغی سمجھ کر بڑا ہوا۔ ایک دن باقی مرغیوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے اُس نے آسمان کی بلندیوں پر کچھ عقاب اُڑتے دیکھے۔ اُس کا بہت دل چاہا کہ کاش وہ بھی ایسے اُڑ سکتا.....

جب اُس نے اپنی اس خواہش کا اظہار دوسری مرغیوں سے کیا تو اُنھوں نے اُس کا مذاق اُڑایا اور قہقہے لگاتے ہوئے کہا ''تم ایک مرغی ہو اور تمھارا کام عقابوں کی طرح اُڑنا نہیں۔'' کہتے ہیں اس کے بعد اُس عقاب نے اُڑنے کی حسرت دل میں دبائے ایک لمبی عمر پائی اور مرغیوں کی طرح جیتا رہا اور مرغیوں کی طرح ہی مرا۔

منفی سوچوں کو دل میں بسا کر رہنا، اُن سوچوں کا غلام بن کر رہنے کے مترادف ہوتا ہے۔ اگر آپ عقاب تھے اور آپ کے خواب آسمان کی بلندیوں میں اُڑنے کے تھے تو پھر اپنے خوابوں کو عملی جامہ دیجیے۔ کسی مرغی کی بات پر دھیان نہ دیجیے کیونکہ اُنھوں نے تمھیں بھی اپنے ساتھ ہی پستیوں میں ڈالے رکھنا ہے۔ اپنے شخصی احترام کو بلند رکھنا اور اپنی نظروں کو اپنی منزل پر مرکوز رکھتے ہوئے پُرعزم اور بلند حوصلے کے ساتھ آگے بڑھنا ہی کامیابی کا راستہ ہے۔ معاملات آگے نہ بڑھ رہے ہوں تو اپنی روزمرہ کی عادتوں سے ہٹ کر کچھ کرنا بھی کامیابیوں کو آسان بناتا ہے اور پھر یہ بھی تو ذہن میں رکھنا ہوگا.....

؎ خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو خیال جس کو آپ اپنی حالت بدلنے کا

بڑھتی ہی گئی، کبھی کبھی جی چاہتا کہ اس کو بلاؤں اور کہوں کہ تم اپنا نام بدل لو..... میں برداشت نہیں کر سکتا کہ میری یونٹ میں کوئی میرا ہم نام بھی ہو مگر پھر یہ سوچ کر ہمت نہ پڑتی کہ کوئی سنے گا تو کیا کہے گا؟

یوں ہی ایک سال گزر گیا۔ مجھے سرکاری رہائش مل گئی اور میں اپنی بیوی کو بھی ساتھ لے آیا..... سپاہی لہراسب خان کو گاؤں سے والد کا خط آیا کہ اس کی بیوی اُمید سے ہے اس لیے وہ چھٹی لے کر گاؤں آئے۔ شاید زچگی نزدیک تھی، سپاہی لہراسب نے چھٹی مانگی تو میں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ بچہ تو تمھاری بیوی نے جنم دینا ہے تم نے نہیں..... وہ مایوس اور شرمندہ سا ہو کر گیا تو میرے دل کو سکون سا آ گیا۔ تین دن بعد اسے تار ملا کہ وہ ایک بیٹے کا باپ بن گیا ہے۔ خوشی میں اس نے یونٹ والوں کو مٹھائی کھلائی۔ ڈبا میرے لیے لے کر میرے پاس بھی آیا اور یہ خوشخبری سنائی کہ اوپر والے نے اسے بیٹا دیا ہے۔ میں نے اسے مبارک باد تک نہ دی اور صرف یہی کہا ''اچھا ہوا ہے۔'' اس نے مٹھائی کا ڈبا میری میز پر رکھتے ہوئے کہا ''میں گھر جا کر بیٹے کو دیکھنا چاہتا ہوں، مجھے چھٹی چاہیے۔''

میں نے مٹھائی کا ڈبا اُسے واپس کر دیا اور کہا ''مجھے مٹھائی کھانے کا کوئی شوق نہیں، اسے واپس لے جاؤ اور فی الحال تمھیں چھٹی نہیں مل سکتی کیونکہ سرحد کے حالات خراب ہیں۔ دشمن ملک کی افواج سرحد پر جمع ہو رہی ہیں۔ خطرہ بہت زیادہ ہے، ممکن ہے ہماری یونٹ کو حرکت کرنا پڑے۔''

سپاہی لہراسب نے مایوس ہو کر مٹھائی کا ڈبا اُٹھایا اور افسردہ سا ہو کر باہر نکل گیا۔ نجانے کیوں لہراسب کو دیکھ کر مجھے خوشی محسوس ہوتی تھی۔ آج اسے چھٹی نہ دے

کر میں بہت ہی مسرور تھا۔ یوں ہی دو ہفتے گزر گئے۔ اس روز جمعہ تھا، جوان نماز چھاؤنی میں واقع مسجد میں ہی پڑھتے تھے۔ جمعہ کی نماز کے دوران ہی کسی دوسرے سپاہی نے لہراسب کو ایک تار دیا۔ تار میں درج تھا کہ اس کا نوزائیدہ بیٹا وفات پا گیا ہے۔

لہراسب نے ٹیلی گرام پڑھا تو دھاڑیں مار کر رونے لگا، اس نے آسمان کی طرف نگاہیں اور دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا ''میجر لہراسب..... خدا کرے، تو بھی زندگی بھر اولاد کی خوشی نہ دیکھے۔'' یہ بات مجھے ایک جوان کی زبانی معلوم ہوئی۔

یہ کہہ کر وہ یونٹ سے غائب ہو گیا، ظاہر ہے اس نے گاؤں ہی جانا تھا لیکن مجھے غصہ آیا کہ وہ مجھ سے چھٹی لے کر کیوں نہیں گیا؟ سوچا واپس آئے گا تو اس کے خلاف کارروائی کروں گا مگر لہراسب لوٹ کر نہ آیا۔ میں نے دفتری کارروائی کی۔ جب کوئی جواب نہ آیا تو بالآخر اسے بھگوڑا قرار دے کر ملازمت سے فارغ کر دیا۔

چند ہی ماہ بعد میں لہراسب کو بھول گیا۔ ان دنوں میری بیوی اُمید سے تھی۔ گاؤں سے امی اور ایک نوکرانی آ گئی تھیں، ملازمہ میری بیوی کی خدمت کرتی اور اسے کسی کام کو ہاتھ نہ لگانے دیتی۔ میں اسے ہر پندرہ دن بعد ملٹری ہسپتال لے جاتا اور اس کا چیک اپ کرواتا۔ ہم سب بہت خوش تھے، ہماری خوشیاں اس وقت دوچند ہو گئیں جب میں ایک خوبصورت بیٹے کا باپ بن گیا..... ہم نے ڈھیروں خوشیاں منائیں، مٹھائیاں بانٹیں اور دعوتیں کی گئیں۔ جواد میرا بیٹا دو ماہ کا تھا کہ اسے بخار ہو گیا۔ ڈاکٹر کو دکھایا، دوا لی مگر کوئی افاقہ نہ ہوا تو اسے ہسپتال داخل کرنا پڑا مگر بخار اُترنے کا نام نہ لے رہا تھا۔ ڈاکٹروں کی بھی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ بخار کیوں نہیں اتر رہا؟ تین دن بعد جواد زندگی سے ناتا توڑ گیا۔ اس روز میں بہت رویا۔ پھر یہ سلسلہ چل نکلا..... ایک سال بعد پھر میں ایک بیٹی کا باپ بنا، وہ بھی جواد ہی کی طرح دو ماہ بعد بخار میں مبتلا ہونے کے بعد انتقال کر گئی۔ ڈاکٹروں کی سمجھ میں بیماری نہ آتی تھی کہ دو ماہ بعد بچے کو بخار ہوتا اور وہ زندگی سے ناتا توڑ جاتا۔ میں ہر طرف سے مایوس ہو کر پیروں فقیروں کے پاس گیا مگر کسی کی دعا نے اثر نہ کیا۔ میری بیوی پانچ بار ماں بنی..... لیکن ہمارے بچے زندہ نہ رہے۔

پانچویں بچے کی موت کے بعد ایک رات میں نے خواب میں سپاہی لہراسب کو دیکھا تو مجھے یاد آیا۔ میں نے اپنے جوان کی خوشیاں چھینی تھیں تو اس نے مجھے بددعا دی تھی کہ میں بھی اولاد کی خوشیاں نہ دیکھوں.....

یہ یقیناً لہراسب کی بددعا کا ہی اثر ہے کہ میں آج تک اولاد کی خوشیاں نہ دیکھ سکا۔ پچھتاوے کی آگ نے مجھے گھیر لیا، اگلے روز میں بیوی کو ساتھ لیے سپاہی لہراسب کے گاؤں روانہ ہو گیا تا کہ اس سے معافی مانگ سکوں۔

گاؤں پہنچ کر علم ہوا کہ لہراسب خان جب پہنچا تو اس کے بیٹے کو دفنا دیا گیا تھا وہ بیٹے کی قبر سے لپٹ کر اتنا رویا کہ اس کی روح بھی پرواز کر گئی۔ اس کی گور بھی بیٹے کی قبر کے ساتھ ہی بنی ہوئی تھی۔ میں نے اس کی قبر پر جا کر اس سے معافی مانگی مگر شاید سپاہی لہراسب نے مجھے معاف نہیں کیا کیونکہ ہم اولاد کی خوشیاں نہیں دیکھ سکے۔ اب تو ہم میاں بیوی بوڑھے ہو چکے۔ میں اب ہر لمحہ توبہ اور استغفار کرتا رہتا ہوں، اللہ شاید معاف کر دے۔

؎ نہ کر سختیاں زیر دستوں کے ساتھ
کہ تیرے بھی ہے ہاتھ پر کوئی ہاتھ

■■■

شکاریات

جنگل سے جنگل تک

ایک نوخیز شکاری کی سنسنی خیز سچی داستان

اُس کا واسطہ ایک آدم خور چیتے سے پڑ گیا تھا

حامد مشہود/عزیز احمد لیل

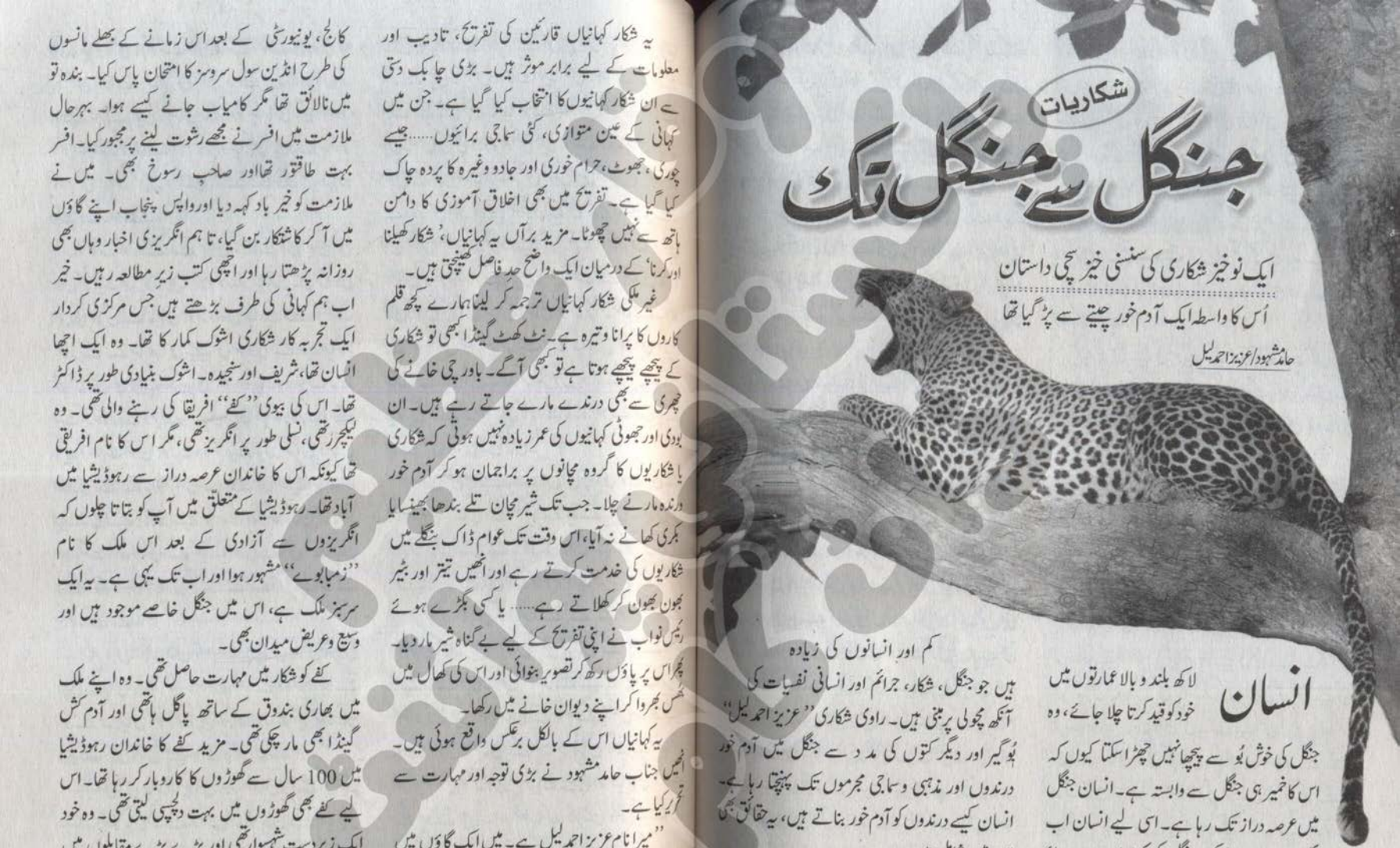

انسان لاکھ بلند و بالا عمارتوں میں خود کو قید کرتا چلا جائے، وہ جنگل کی خوش بُو سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا کیوں کہ اس کا خمیر ہی جنگل سے وابستہ ہے۔ انسان جنگل میں عرصہ دراز تک رہا ہے۔ اسی لیے انسان اب بھی دور دراز بیٹھ کر، جنگل کی کہانیاں بڑے چاؤ سے سنتا ہے۔ مگر اردو میں شکار کی کہانیوں کے موضوعات میں تنوع بہت ہی کم رہا ہے۔

وسیع کینوس پر محیط یہ رنگا رنگ کہانیاں جانوروں کی کم اور انسانوں کی زیادہ ہیں جو جنگل، شکار، جرائم اور انسانی نفسیات کی آنکھ مچولی پر مبنی ہیں۔ راوی شکاری ''عزیز احمد لیل'' بُوگیر اور دیگر کتوں کی مدد سے جنگل میں آدم خور درندوں اور مذہبی و سماجی مجرموں تک پہنچتا رہا ہے۔ انسان کیسے درندوں کو آدم خور بناتے ہیں، یہ حقائق بھی اس میں شامل ہیں۔

سچی کہانیاں ہم اپنے قارئین تک اِس یقین سے پہنچا رہے ہیں کہ وہ جم کاربٹ اور کینتھ اینڈرسن کے کارنامے بھول جائیں گے۔

یہ شکار کہانیاں قارئین کی تفریح، تادیب اور معلومات کے لیے برابر موثر ہیں۔ بڑی چابک دستی سے ان شکار کہانیوں کا انتخاب کیا گیا ہے۔ جن میں کہانی کے عین متوازی، کئی سماجی برائیوں..... جیسے چوری، جھوٹ، حرام خوری اور جادو وغیرہ کا پردہ چاک کیا گیا ہے۔ تفریح میں بھی اخلاق آموزی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹا۔ مزید برآں یہ کہانیاں، 'شکار کھیلنا اور کرنا' کے درمیان ایک واضح حدِ فاصل کھینچتی ہیں۔

غیر ملکی شکار کہانیاں ترجمہ کر لینا ہمارے کچھ قلم کاروں کا پرانا وتیرہ ہے۔ نٹ کھٹ گینڈا کبھی تو شکاری کے پیچھے پیچھے ہوتا ہے تو کبھی آگے۔ باورچی خانے کی چھری سے بھی درندے مارے جاتے رہے ہیں۔ ان بودی اور جھوٹی کہانیوں کی عمر زیادہ نہیں ہوتی کہ شکاری یا شکاریوں کا گروہ مچانوں پر براجمان ہو کر آدم خور درندہ مارنے چلا۔ جب تک شیر مچان تلے بندھا بھینسا یا بکری کھانے نہ آیا، اس وقت تک عوام ڈاک بنگلے میں شکاریوں کی خدمت کرتے رہے اور انھیں تیتر اور بٹیر بھون بھون کر کھلاتے رہے..... یا کسی بگڑے ہوئے رئیس نواب نے اپنی تفریح کے لیے بے گناہ شیر مار دیا۔ پھر اس پر پاؤں رکھ کر تصویر بنوائی اور اس کی کھال میں بھس بھروا کر اپنے دیوان خانے میں رکھا۔

یہ کہانیاں اس کے بالکل برعکس واقع ہوئی ہیں۔ انھیں جناب حامد مشہود نے بڑی توجہ اور مہارت سے تحریر کیا ہے۔

''میرا نام عزیز احمد لیل ہے۔ میں ایک گاؤں میں ایک زمیندار کے ہاں پیدا ہوا۔ اسکول میں کچھ شاعری کا خبط لاحق ہوا تو میں نے نام کے ساتھ تخلص 'لیل' کا اضافہ کیا۔ گاؤں سے نکل کر شہر میں تعلیم حاصل کی۔ کالج، یونیورسٹی کے بعد اس زمانے کے بھلے مانسوں کی طرح انڈین سول سروسز کا امتحان پاس کیا۔ بندہ تو میں نالائق تھا مگر کامیاب جانے کیسے ہوا۔ بہرحال ملازمت میں افسر نے مجھے رشوت لینے پر مجبور کیا۔ افسر بہت طاقتور تھا اور صاحبِ رسوخ بھی۔ میں نے ملازمت کو خیر باد کہہ دیا اور واپس پنجاب اپنے گاؤں میں آ کر کاشتکار بن گیا، تاہم انگریزی اخبار وہاں بھی روزانہ پڑھتا رہا اور اچھی کتب زیرِ مطالعہ رہیں۔ خیر اب ہم کہانی کی طرف بڑھتے ہیں جس مرکزی کردار ایک تجربہ کار شکاری اشوک کمار کا تھا۔ وہ ایک اچھا انسان تھا، شریف اور سنجیدہ۔ اشوک بنیادی طور پر ڈاکٹر تھا۔ اس کی بیوی ''کفے'' افریقا کی رہنے والی تھی۔ وہ لیکچرر تھی، نسلی طور پر انگریز تھی، مگر اس کا نام افریقی تھا کیونکہ اس کا خاندان عرصہ دراز سے رہوڈیشیا میں آباد تھا۔ رہوڈیشیا کے متعلق میں آپ کو بتاتا چلوں کہ انگریزوں سے آزادی کے بعد اس ملک کا نام ''زمبابوے'' مشہور ہوا اور اب تک یہی ہے۔ یہ ایک سرسبز ملک ہے، اس میں جنگل خاصے موجود ہیں اور وسیع و عریض میدان بھی۔

کفے کو شکار میں مہارت حاصل تھی۔ وہ اپنے ملک میں بھاری بندوق کے ساتھ پاگل ہاتھی اور آدم کش گینڈا بھی مار چکی تھی۔ مزید کفے کا خاندان رہوڈیشیا میں 100 سال سے گھوڑوں کا کاروبار کر رہا تھا۔ اس لیے کفے بھی گھوڑوں میں بہت دلچسپی لیتی تھی۔ وہ خود ایک زبردست شہسوار تھی اور بڑے بڑے مقابلوں میں تمغے اور اسناد جیت چکی تھی۔

برصغیر میں جنگل بہت ہیں اور جہاں جنگل ہوں وہاں درندے کبھی کبھار آدم خور ہو ہی جاتے ہیں۔

بڑے جانور بھی جو گوشت نہیں کھاتے، مختلف وجوہ کی بنا پر، بعض اوقات ''آدم کش'' بن جاتے ہیں، انسانوں کو مارتے پھرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہاتھی، گینڈا اور جنگلی بھینسا۔ درندے آدم خور ہو جائیں یا بڑے جانور آدم کشی پر اتر آئیں تو انھیں مارنے کے لیے کم یا زیادہ وقت درکار ہوتا ہے۔

اشوک اور کفے سے میری ملاقات بھی یوں ہی ہوئی کہ ایک لمبا چوڑا چیتا آدم خور ہو گیا تھا۔ تین شکاری اس کی تلاش سے مایوس ہو کر واپس جا چکے تھے۔ اشوک کمار کفے کے ساتھ اسی چیتے کی سرکوبی کے لیے جا رہا تھا کہ اس کی جیپ میں پانی ختم ہو گیا۔ وہ سڑک سے ہٹ کر ہمارے ڈیرے پر پانی لینے آیا تو ہمارے کتے دیکھ کر بہت خوش ہوا کہ وہ تربیت یافتہ سراغ رساں شکاری کتے تھے۔ پھر اس نے مجھے بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ میں اپنے ساتھ اپنے دوست اور معاونین محمد انور اور بھگت سنگھ کو بھی لے گیا۔ انھوں نے بھی کتے پال رکھے تھے اور وہ شکاری تجربہ رکھتے تھے، اگرچہ مجھ سے کم رکھتے تھے۔

پھر اس جنگل میں آدم خور چیتے کی تلاش شروع ہوئی۔ مقامی راہ نما کی مدد سے ہم نے وہ تمام علاقے ٹٹولے کہ جہاں آدم خور چیتا دیکھا اور سنا گیا تھا۔ تین دن تک ہمیں وہاں چیتے کا تازہ کھرا نہ ملا۔

کوئی بھی جاندار حیوان ہو یا انسان، جب کسی جگہ اٹھتا، بیٹھتا یا چلتا ہے تو اس کے بدن سے حیاتیاتی ذرات گرتے ہیں۔ انسانی آنکھ ان ذرات کو دیکھ نہیں سکتی اور ہمارے ہاتھ چھو نہیں سکتے۔ انگریزی میں انھیں Biological Particles کہا جاتا ہے۔ تربیت یافتہ کتے ان ہی حیاتیاتی ذرات کو سونگھتے ہیں، ان کی خاص بو یاد رکھتے اور اسکے بل پر اس جاندار کا پیچھا کرتے ہیں۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ اپنے ہدف کے عین قریب جا کر کتے خاموش ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس کی کئی وجوہ ہو سکتی ہیں۔ سب سے بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ مطلوبہ جاندار کسی طرح اپنی فطری بو چھپا لیتا ہے، وہ کسی اور بدبو یا خوشبو کے منبع میں جا چھپتا ہے۔ اسی طرح مفرور افراد اپنے اوپر پرفیوم چھڑک کر بھی کتوں کو گمراہ کر دیتے ہیں۔ کسی سمت سے آندھی کا آنا بھی کتوں کی حسِ سراغ رسانی کو متاثر کر سکتا ہے۔ اگر کتے خود مکمل طور پر تربیت یافتہ نہ ہوں تو بھی اپنے ہدف کے عین قریب جا کر خاموش ہو جاتے ہیں۔ تاہم یہ واضح رہے کہ حیاتیاتی ذرات تازہ کھرے میں پائے جاتے ہیں، باسی میں نہیں۔

آج کل ہمارے ملک میں بھی چوری اور ڈکیتی کے بعد سراغ رساں کتے منگوائے جاتے ہیں۔ کتوں کی ڈور تو آخر انسان کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ کوشش کریں کہ ایسے معاملے میں بے گناہ کو ملوث نہ کیا جائے۔

مفرور مجرمین کو ڈھونڈنے کے لیے فورسز جو کتے استعمال کرتی ہیں، انھیں اکثر مجرمین کے کپڑے سنگھا دیے جاتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے وہ کپڑے زیادہ بہتر رہتے ہیں جو انسان کے جسم کے بالکل ساتھ چپکے ہوئے ہوں۔ مثال کے طور پر بنیان، جراب، جانگیا اور محرم وغیرہ کہ ان پر زیادہ پسینا اور حیاتیاتی ذرات لگے ہوتے ہیں۔ اور خطرناک مجرمین کو تو پکڑتے ہی بعض اوقات فورس اپنے کتوں کے سامنے پیش کر دیتی ہے تاکہ اس کے بدن کی بُو یاد کر لیں۔ کیونکہ ایسے مجرمین بعض اوقات دوران تفتیش فرار ہو جاتے یا حملہ کر کے چھڑوا لیے جاتے ہیں۔

آدم خور درندے چونکہ نہ تو جراب پہنتے ہیں اور نہ کوئی اور پوشاک ہی زیب تن فرماتے ہیں، اس لیے ان کا تازہ کھرا ہی کارآمد ثابت ہوتا ہے کہ سراغ رساں کتے ان کے کھرے سے ان کے بدن کی بو پا کر ان کی تلاش میں سرگرداں رہیں۔ تب درندہ، کتے اور وقت مل کر زندگی اور موت کی آنکھ مچولی کھیلتے ہیں۔

تین دن گزرے تو ہم شام کو واپس ڈاک بنگلے میں آئے، میں بنگلے کے ملازموں کو مرغ خریدنے کے لیے پیسے دے گیا تھا۔ انھوں نے ہمارے لیے اور اپنے لیے مرغ پکا رکھا تھا۔ اشوک کمار ماساہاری ہندو تھا۔ وہ گوشت کھاتا مگر کم کھاتا تھا، البتہ کفے ڈٹ کر گوشت کھاتی تھی۔ اس نے مرغ سے خوب خوب انصاف کیا۔ کھانا کھا کر ہم نے اپنے کتوں کو بھی کھانا کھلایا اور انھیں ٹہلانے کے لیے باہر لے گئے۔ میاں بیوی نے بھی ہمارا ساتھ دیا۔ محکمہ جنگلات کا یہ ڈاک بنگلا نہ تو گاؤں میں تھا اور نہ جنگل کے کنارے پر، بلکہ یہ ایک نہر کے کنارے پر واقع تھا جو جنگل اور آبادی سے ہٹ کر بہتی تھی۔

کتوں کو ٹہلاتے ہوئے ہم دنیا بھر کی باتیں کرتے رہے، افریقا، برصغیر، جنگل، کتے اور درندے۔ کفے نے بتایا کہ اس کے والد نے اسے کم سنی میں ہی گھڑ سوار بنا ڈالا تھا۔ اس کے برعکس میں نے اس کے پتی کو اناڑیوں کے سے انداز میں گھوڑا ہانکتے ہوئے دیکھا تھا۔

تو آپ اپنے پتی کو بھی گھڑسواری سکھاؤ ناں'' میں نے کفے سے کہا۔

''یہ مجھے استاد نہیں مانتے'' کفے نے بتایا۔ ''برصغیر میں مرد اپنی عورت کو اچھا درجہ نہیں دیتا کہ اسے استاد مانے اور اس سے کچھ سیکھ لے۔ اگر میری شادی یورپ کے جارج یا ڈیوڈ سے ہوتی تو وہ کب کا مہارت تامہ حاصل کر کے شہ سوار بن چکا ہوتا۔''

کفے کی برصغیر کی اجتماعی ذہنیت کی طرف انگشت نمائی واقعی حقیقت بیانی تھی۔ برصغیر میں کیا محمد اسلم تو کیا قیصر مسیح، کیا رام لال تو کیا گرم سنگھ..... ہم سب مرد اپنی بیویوں کو استاد مان کر کوئی علم، کوئی ہنر سیکھنے سے قاصر ہیں۔

''کفے! آپ نے یورپ کے کسی جارج یا ڈیوڈ سے بیاہ کیوں نہ رچایا کہ وہ آپ کو استاد تو مانتا۔''

وہ بولی ''مسٹر عزیز! میں اپنی قسمت سے بھاگ نہ سکی، کوئی بھی اپنی قسمت سے بھاگ نہیں سکتا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ لندن کی ایک ٹیڑھی میڑھی اور تنگ گلی میں پالتو مرغ مجھ پر حملہ کر دے گا اور اسے بھگانے کی کوشش میں پھسل کر مجھے چوٹ لگے گی اور اشوک آ کر میری مدد کرے گا۔ قسمت کہ ایک ماہر شکاری ہو کر معمولی مرغ کے سامنے گر پڑی۔''

میں نے کہا ''اشوک صاحب! کہیں وہ مرغ آپ نے ہی تو نہیں تربیت دے کر چھوڑا تھا؟''

اشوک بولا ''آئیڈیا اچھا ہے، اگلی شادی کے لیے اب مرغ ہی تیار کرنا ہوگا۔'' یہ سن کر ہم سب ہنسنے لگے۔

کچھ دیر ہنسی خوشی کی باتوں میں گزار کر میں نے

فطرت نے ہر دو انسانوں کو ریشم کی ڈور میں باندھ رکھا ہے۔ اس لیے وہ جتنی بھی بھاگ دوڑ کر لیں، شادی اِسی ڈور کے تحت ہی ہو گی

کہا ''ایک غیر ملکی کہانی میں نے پڑھی تھی کہ فطرت نے ہر دو انسانوں کو ریشم کی ڈور میں باندھ رکھا ہے۔ اس لیے وہ جتنی بھی بھاگ دوڑ کر لیں، شادی اسی ڈور کے تحت ہی ہوگی''۔

بھگت سنگھ نے کہا'' اور اس ریشم کی ڈور کا کمال ہے کہ کفے جیسی استاد گھڑ سوار اپنے گھوڑے پر بیٹھ کر بھی اس ڈور کو نہ تڑوا سکی۔''

اسی رات ہم تینوں دوست شیر سے جا ٹکرائے۔ ہوا یوں کہ آدھی رات کے وقت شیر زور سے غرّایا۔ میں نے نیند میں ہی انور کو زور سے لات دے ماری۔ انور چونکہ رنڈوا تھا، اپنی دل بستگی کے سامان کے لیے وہ اس قسم کے ڈرامے کرتا رہتا تھا۔ شیر پھر غرایا تو بھگت سنگھ چلایا ''انور کے بچے! کیوں نیند غارت کرتا ہے، دوبارہ غرایا تو سر توڑ دوں گا، خود سوتا ہے اور نہ سونے دیتا ہے۔''

عین اسی وقت ہمارے کمرے کا دروازہ گرتے گرتے بچا۔ ہم تینوں کمبل پھینک کر اپنے اسلحہ کی طرف لپکے۔ شیر ہمیں کھڑکی سے ذرا نظر آیا مگر پلک جھپکتے ہی شیر کھڑکی سے پرے ہٹ چکا تھا۔ اب ہم دروازہ کھول کر ہی اسے دیکھ سکتے تھے۔ پھر بنگلے کے ملازمین چیخ اٹھے اور باہر ہاہا کار مچ گئی تو دروازہ کھولنا لازم ٹھہرا۔ ہم دروازہ کھول کر لپکے۔ شیر شور سن کر بنگلے کے کسی ویران گوشے میں چلا گیا تھا۔ یہ ایک تگڑا اور جوان شیر تھا۔ اس شیر کا یوں ویران گوشے میں جانا یہ ظاہر کرتا تھا کہ وہ آدم خور نہیں اور نہ ہی ایسا بننے پر تلا ہوا تھا۔ سو ملازمین کی فرمائش کے عین برعکس میں نے شیر کو باہر نکل جانے کا موقع فراہم کیا۔

شیر بنگلے سے باہر نکل کر دھاڑا'' میں بھوک سے بے تاب ہو کر ادھر آ گیا تھا مگر میں آدم خور نہیں۔ اے رحمدل شکاری..... تیرا شکریہ۔''

کمرے سے اسلحہ اٹھاتے وقت میں نے سوچا تھا کہ کتے کہاں گئے؟..... شکار کی دور سے بُو پالینے والے زبردست کتے خاموش کیوں رہے؟..... میرے خدشے کے عین مطابق ہمارے آٹھ کے آٹھ کتے غائب تھے۔ تب تک اشوک اور کفے بھی اپنے کمرے سے باہر نکل آئے تھے۔ ان کے پاس اسلحہ تھا مگر انھوں نے بھی میرے ساتھ شیر کو زندہ بھگا دینے کے فیصلے میں شمولیت اختیار کی تھی۔ بھگت کھرے کی سمجھ رکھتا تھا، اس نے بنگلے کے باہر چوروں کے کھرے دیکھ لیے جو یکے میں کتے لاد کر لے گئے تھے۔

کفے بار بار کتوں کا خالی تھان دیکھ کر کہہ رہی تھی کہ یہ سب کیسے ہوا؟

میں نے بتا دیا کہ کتوں کو غذا میں دوا ملا کر بے ہوش کیا گیا تھا ورنہ ہوش میں وہ کتے اغوا ہونے والے نہیں تھے۔ رات اسی طرح کٹی، صبح دم ہمارا ایک کتا واپس بنگلے میں آ گیا۔ اس سے مچھلی کی بساند آ رہی تھی۔

بھگت سنگھ کتے کو سونگھ کر بولا'' کوئلوں کی دلالی میں منہ کالا ہوتا ہے اور مچھلی کی دلالی میں سے بساند آتی ہے۔''

پتا چلا کہ اس علاقے میں ''سلیمان'' مچھلی کا اکلوتا تاجر تھا اور اس کا بیٹا ظہیر کتوں کا شوقین تھا۔ محکمۂ جنگلات اور پولیس کو اس چوری کی اطلاع دے دی گئی اور مقامی راہ نما اس دم میسر نہ تھا۔ ہم نے اشوک اور کفے کو شکار پر بھیج دیا۔ خود ہم تینوں سلیمان اور ظہیر کے ہاں پہنچے۔ ظہیر ہمیں دیکھ کر پہلے تو گھبرایا پھر اس نے خود پر قابو پا لیا۔

ظہیر نے کتوں کی چوری کے متعلق بالکل لاعلمی ظاہر کی اور افسوس کا اظہار کیا۔ بنگلے کے دو ملازم بھی

وہاں آن پہنچے۔ میں اور انور وہاں ہی ٹھہرے، بھگت بنگلے کے ملازمین کے ہمراہ ہوا۔ کچھ دیر بعد پولیس وہاں پہنچ گئی اور دینا ناتھ نامی زمیندار بھی۔ تب بھگت سنگھ ایک یکے پر سوار نمودار ہوا، جسے ایک ایسا مرد ہانک رہا تھا جو اپنی وضع قطع سے چھٹا ہوا اوباش دکھائی دیتا تھا۔ موصوف کا نام ''ہانو'' تھا۔ بھگت سنگھ نے ہانو اور ظہیر کے کھرے پہچان لیے تھے۔ بنگلے کے باہر جو یکہ آیا تھا، اس کے جانور کے ایک سُم پر نصب نعل پر خاص نشان تھا اور یکے کا ایک پہیا بھی جھول رہا تھا۔ پولیس نے یکے کی گھوڑی کے سُم پر نصب نعل کا نشان دیکھا اور ظہیر کو ذرا پرے لے گیا۔

وہ پولیس انسپکٹر تھا۔ اس نے ظہیر کو نہ جانے کیا کہا مگر ظہیر چوری برآمد کروانے پر آمادہ نہیں تھا۔ اس کا بار بار نفی میں ہلتا سر اس کے انکار کا غماز تھا۔ تب انسپکٹر نے بید کی چھڑی سنبھالی اور ظہیر کی دھُنائی شروع کی تو ظہیر نے بلبلا کر چوری برآمد کروانے کا ببانگِ دُہل اعلان کیا۔

کتے انھوں نے آبادی سے دُور چھپا رکھے تھے۔ یہ ویران ڈیرا ظہیر نے مستعار حاصل کیا ہوا تھا۔ کتوں میں سے مچھلی کی بساند اس لیے آ رہی تھی کہ ظہیر نے بے ہوش کتے یکے پر ڈال کر انھیں مچھلیوں والی چادر سے ڈھانپا تھا۔ چادر پر مچھلی کا گوشت لگا ہوا تھا۔ جو کتا بنگلے تک آن پہنچا تھا، وہ وہیں سے فرار ہوا تھا۔ شاید ظہیر نے کسی کوتاہی کا مظاہرہ کیا تھا۔ ہم نے کتے حاصل کیے، انھیں نمکین دودھ پلایا اور ذرا ذرا کھٹا گوشت بھی کھلایا تا کہ ان پر سے نشیلی دوا کا اثر بالکل ہرن ہو جائے۔ کتوں کے ہشیار ہوتے ہی ہم جنگل کی طرف بڑھے۔ باقی کام میں پولیس مصروف تھی۔

جنگل کی پٹی سے گزر کر ہم جوں ہی اندر داخل ہوئے..... سامنے ایک حواس باختہ لڑکی کو پایا، جس کی عمر کوئی 20 سال تھی۔ اس نے ہمیں بتایا ''میرے والدین میری شادی میری مرضی کے خلاف کر رہے تھے۔ آج برات آنی تھی تو میں اس سے پہلے ہی منے کے ساتھ چل نکلی تا کہ جنگل میں سے گزر کر ہم قصبے تک جا پہنچیں اور وہاں سے لاری میں بیٹھ کر شہر چلے جائیں۔ شہر میں منے کی بُوا رہتی ہے۔ منا کہتا تھا کہ ہم وہاں شادی کر لیں گے۔''

پھر لڑکی نے زور زور سے رونا شروع کر دیا۔

''تو پھر کیا ہوا..... منّا کہاں گیا؟'' میرے اندر آدم خور کے وہم نے سر اُٹھایا مگر میں زبان پر نہ لایا۔

تو بھاگ گیا، چھوڑ گیا منّا تجھے؟'' بھگت نے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

اس نے روتے روتے زور سے سر ہلایا'' منّے کو چیتا اٹھا کر لے گیا''، اس نے ہچکیوں میں بتایا۔

''میں صدقے جاؤں تم دونوں کی عقل پر'' انور بولا۔ ''ایک کریلا دوسرا نیم چڑھا..... شادی کے لیے بھاگنا ہی تھا تو جنگل میں سے؟ جب کہ سارا زمانہ آدم خور سے واقف ہے۔''

وہ روتے روتے بولی ''منّے کے پاس پستول تھا۔'' وہ پھر رونے لگی۔ کچھ اور کہا بھی جو ہمارے پلے نہ پڑا۔ مجھے لڑکی پر برابر ترس اور غصہ آ رہا تھا۔

زبردستی کی شادی ہمارے برصغیر کا المیہ تھا۔ یہاں اس قسم کے جبر کو روا گردانا جاتا ہے۔ اس استبداد کا

آدم خور چیتے نے خوبرو دوشیزہ کے سارے ارمانوں کو روند ڈالا تھا

نشانہ لڑکا اور لڑکی دونوں بنتے ہیں۔ حکم عدولی کی صورت میں نتیجہ، مار پیٹ، موت یا قطع تعلق ہوسکتا ہے، تاہم اس زبردستی کا علاج سرِ عام فرار بھی ہرگز نہیں۔

تب لڑکی نے مزید بتایا ''جب چیتے نے منے کو اٹھا لیا تو میں اس کے پیچھے بھاگی۔ میری آوازوں پر بندوق والے مرد اور عورت ادھر آ گئے۔ مرد دیسی تھا اور عورت ولایت کی میم تھی۔ وہ چیتے کے پیچھے چلے گئے ہیں''۔

وہ لڑکی یا تو منّے کی زندہ وسلامت واپسی کی منتظر تھی کہ وہاں بیٹھی ہوئی تھی اور یا پھر اس کی عقل جواب دے چکی تھی۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے اہلِ خانہ کے خوف سے وہاں رُکی ہوئی تھی کہ اب جائے تو کہاں جائے۔ اس کے دونوں جانب جنگل تھا۔ ایک طرف درندوں کا جنگل تو دوسری طرف انسانوں کا۔

انور اور بھگت اس لاچار لڑکی کو جنگل کی پٹی پر چھوڑ آئے کہ سامنے کے کھیت عبور کر کے گاؤں میں چلی جائے۔

ہم نے چیتے کے تازہ کھرے کو قدرت کا انعام سمجھا اور کتوں کو اس پر چھوڑا۔ مخصوص جگہ کی مٹی بھی اٹھا کر محفوظ کر لی گئی تا کہ راہ میں پھر ضرورت پڑنے پر کتوں کو سنگھائی جائے پھر چیتے کا تعاقب شروع ہوا۔ آدم خور کہیں دور نکل چکا تھا۔ ایک جگہ پر مجھے نوجوان منّے کی نعش بھی مل گئی۔ نعش جھاڑیوں میں آڑی ترچھی گری پڑی تھی اور اسے جھاڑ جھنکاڑ سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ اشوک اور کتوں کے تعاقب پر آدم خور نے نعش گرا کر اپنی رفتار بڑھا دی تھی۔

وہ تازہ نعش اس وقت ''ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے'' کی طرح لہو سے مہک رہی تھی۔ ہم افسوس سے سر ہلا کر آگے بڑھے...... کتوں نے پھر چیتے کا کھرا سونگھا اور ایک سمت کو لپکے۔ راستے میں ہمیں میاں بیوی مل گئے۔ ہم نے انھیں اپنے پیچھے آنے کا کہا۔ آخر کار ہم نے چیتے کو جا لیا۔ وہ ایک بہت بڑے اور پھیلے ہوئے درخت پر ایک بندر کا تعاقب کر رہا تھا۔ میں نے محسوس کر لیا کہ چیتا اس وقت شدید بھوکا تھا۔ تاہم اس کی بھوک کا دائمی علاج کرنے کے لیے ہی ہم اس تگ و دو سے وہاں پہنچے تھے۔

ہم حیران رہ گئے کہ ہمارے پیچھے پیچھے آنے والے میاں بیوی اس وقت غائب تھے۔ ہم نے حیرانی کو وہاں ہی محدود کیا کہ آدم خور انسانی نظروں کے سامنے چند لمحات کا مہمان ہوتا ہے۔ میرے اشارے پر ہم محتاط انداز میں اس عظیم الجثہ درخت کے پاس جانے لگے، جس کے ہرے پتوں میں چیتے اور بندر کی جھلک بار بار دکھائی دے رہی تھی۔ وہ چھپ رہے تھے، سامنے آ رہے تھے۔ بندر پر خوف طاری ہو چکا ہو گا ورنہ وہ کودنے پھلانگنے میں چیتے سے درختوں پر زیادہ مشاق ہوتا ہے۔

ہمارے درخت کے پاس جاتے ہی چیتا اور بندر دونوں پتوں میں چھپ گئے۔ میں چیتے کو اس کی لٹکتی ہوئی موٹی دم سے بھانپ رہا تھا کہ وہ کہاں تھا۔ ہم نے اپنے کتے چھوڑ دیے۔ وہ درخت کے لمبے چوڑے تنے پر بھونک بھونک کر چڑھنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ میرا مقصد تھا آدم خور کو تنگ کرنا اور خوف دلانا۔ میں نے دُم کے اندازے سے گولی داغ دی مگر وہ کسی اور پہلو سے بیٹھا ہوا تھا، صاف بچ نکلا۔

تب چیتے نے اچانک بلندی سے مجھ پر جست لگا دی۔ میں نے بغیر خوف کھائے، اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور پرے ہٹ کر اس درندے کو گولی مار دی۔ یہ صرف چند فیٹ کا ہی فرق رہا ہو گا۔ درندے کے زمین پر پہنچنے سے پہلے ہی گولی اس کی گردن کے آر پار ہو گئی

تھی۔ اس کام میں اگر ذرا دیر ہو جاتی یا مجھ پر خوف غالب آ جاتا تو میرا بڑا نقصان ہو سکتا تھا۔ انور اور بھگت نے بھی ایک ایک گولی اس کے سر میں اتار دی۔

چیتا دراصل مجھ پر کود کر، مجھے نقصان پہنچاتے ہوئے وہاں سے بھاگ نکلنا چاہتا تھا۔ وہ جسیم چیتا اگر وہاں سے زندہ وسلامت بھاگ نکلتا تو ہمارا کوئی بھی کتا اس کی گرد کو نہ چھو سکتا۔ چیتا جنگل کا سب سے تیز رفتار جانور ہوتا ہے۔ یہ تو حضرت انسان کی عقل ہے کہ وہ تیز رفتار اور طاقتور، ہر جانور کو قابو کر لیتا ہے۔ آدم خور مر چکا تھا۔ ہم اپنے تئیں پہلا آدم خور مارنے پر بہت خوش ہوئے۔

یہ سرما کے دن تھے جو بالشت بھر کے ہوتے ہیں۔ پھر جنگل میں شام رات سی ہوتی ہے۔ ہم رات ڈھلنے سے پہلے واپس جانا چاہتے تھے تا کہ بندے بلوا کر چیتے کی کھال اتروائی جائے۔ تب میاں بیوی بھی ہمیں آتے دکھائی دیے۔ ہوا یوں کہ کفے کے سرکش گھوڑے نے اچانک چلنے سے انکار کر دیا تھا۔ اشوک چونکہ گھوڑوں کو زیادہ نہ جانتا تھا، اس لیے اس نے اپنی دلیری اس گھوڑے کو ڈنڈے مار کر دکھائی۔ جواب میں اس گھوڑے نے اپنی لگام تڑوائی اور کفے سمیت بھاگ نکلا۔ اپنی بیوی کو بچانے کے لیے اشوک نے چیتے کے تعاقب سے کہیں بہتر منہ زور گھوڑے کا تعاقب سمجھا اور اس کے پیچھے نکل گیا۔

گھوڑا جنگل میں خوار ہو کر روکا گیا تھا۔ ہم نے واپسی پر منّے کی نعش اٹھا کر آبادی میں پہنچا دی۔ پستول اس کے لباس میں محفوظ تھا۔ پستول پاس ہونا اور پستول آدم خور پر چلا دینا دو متضاد اور مختلف امور ہوتے ہیں۔

چیتے کی قیمتی کھال اتروائی گئی۔ کتوں کی چوری کے سلسلے میں محکمہ جنگلات کے افسر آ گئے تھے اور ڈی ایس پی بھی۔ دینا ناتھ نے اپنے ملازم کی گزشتہ 3 ماہ کی تنخواہ ہمارے کتوں کو دے دی اور ہانو کو اپنے ڈیرے سے نکال دیا۔ اس چوری کا دوسرا کردار ڈاک بنگلے کا سرکاری ملازم بوٹا مسیح تھا۔ بوٹا امیر گھر کا بیٹا تھا جو والدین سے لڑ جھگڑ کر یہاں ملازمت کر رہا تھا۔ جرمانہ وصول کر کے اسے بھی نوکری سے نکال دیا گیا۔ ظہیر کی اس دن ہی عدالت میں ''زرِ ضمانت'' بھر کر ضمانت پر رہائی کروا لی گئی تھی، تاہم وہ اپنے باپ کے خوف سے فرار تھا۔ اس کے صاحبِ ثروت باپ نے جرمانہ ادا کر دیا۔ یہ جرمانے ہم اس لیے وصول کر رہے تھے کہ ڈی ایس پی ''کلارک'' نے ہمیں دو راستے دکھائے تھے، اول جرمانہ وصول کر کے مجرمین کو معاف کرنا اور دوم مقدمہ آگے بڑھانا۔

ہم ٹھہرے گاؤں کے لوگ، ہم فصلیں بوتے کہ مقدمہ آگے بڑھاتے، ہمارے لیے جرمانہ وصول کرنا ہی بہتر راستہ تھا۔

بعد ازاں ہانو اور بوٹے نے مل کر ظہیر کو ڈھونڈ نکالا اور اس کی زبردست پٹائی کی کہ اس کی غفلت سے ایک کتا مچھلی کی بساند لیے ڈاک بنگلے تک واپس جا پہنچا اور چوری پکڑی گئی۔ ظہیر ہسپتال پہنچ گیا اور وہ دونوں حوالات میں بند ہوئے۔ ایک بالکل نیا مقدمہ شروع ہوا۔ برے کاموں کے ہمیشہ برے نتائج ہی سامنے آتے ہیں۔

اشوک اور کفے ہمارے شکار پر خوش تھے۔ انھوں نے محکمہ جنگلات کو تحریری درخواست دی کہ عزیز احمد لیل کو محکمہ بطور شکاری رجسٹر کر لے۔ اس بڑے افسر نے، جو کتوں کی چوری پر وہاں آیا تھا، میری ٹیم کو وہ نقد انعام بھی دلوایا جو سرکار نے مقرر کر رکھا تھا۔

ہم چیتے کی کھال اور مال لے کر گھر پہنچے تو ماں جی

نے جو کچھ مجھے کہا، وہ میں آپ کو بتا ہی چکا ہوں۔ میں نے ان کی ٹانگیں دبائیں اور انھیں منا لیا۔ ابا جی آدم خور مارنے پر خاموش رہے۔

دو تین دن بعد انھوں نے مجھے بلایا ''گدھے.....! آدم خور چیتا مارا، بہت اچھا کیا۔ مجھے ڈر ہے کہ تم شکاری بن جاؤ گے پھر آدم خور مارتے پھرا کرو گے''۔

ابا جی سخت مزاج شخص تھے، دادا جی بھی ایسے ہی تھے۔ ان کے سامنے بولنے کے لیے بھی شیر کا جگر چاہیے تھا جو مجھے میسر نہ تھا۔ میں آدم خور تو مار آیا تھا۔ اب ابا جی کے سامنے بولا نہیں جا رہا تھا۔

میرے ابا جی عالم گیر جنگ اول میں انڈو برٹش آرمی میں بھرتی ہوئے۔ جنگ میں انگریزوں کو افراد اور اموال کی اشد ضرورت تھی۔ ابا جی نے وار فنڈ میں بھاری رقم جمع کروائی تو انھیں مختصر تربیت کے بعد بڑا افسر بنا دیا گیا۔ آخر جنگ میں انھیں ملک سے باہر بھیج دیا گیا اور ترکوں پر گولی چلانے کا حکم دیا گیا۔ مسلمان فوجیوں نے صاف انکار کر دیا کہ ترک اس جنگ میں براہِ راست شامل نہیں اور وہ مسلم ہیں جب کہ عالمگیر جنگ غیر مسلم دنیا کی ہے۔ اس انکار میں بہت سے مسلم فوجی شامل تھے۔ انگریزوں نے استعفے دینے پر ان سب کی یک لخت ملازمت ختم کر دی۔ پھر بھی ان مسلم فوجیوں کو میڈلز عطا کیے گئے، جن پر نقش تھا کہ یہ جنگ تہذیب کی خاطر لڑی گئی۔ ابا جی نے اس جنگ اور اس تہذیب کو کبھی کوئی اہمیت نہیں دی تھی جو بے پناہ لہو سے رنگین تھی۔ یہ ہے میرے ابا جی کا تعارف۔ میں نے ڈرتے ڈرتے کہا ''آپ نے اور دادا جی نے بھی تو عمر بھر آدم خور ہی مارے ہیں''۔

''ہماری بات اور ہے..... تم زیادہ تعلیم یافتہ ہو، جوان ہو، سرکاری ملازمت ہی کر لو۔ چھوٹے بڑے سب تجھے بابو بابو کہا کریں گے۔ بنگلا، سرکاری جیپ اور طاقت'' جواب ملا۔

''ابا جی! یہ سب آپ نے بھی تو چھوڑا ہے۔'' میں نے عرض کیا۔ ''آپ بھی تو میجر تھے۔''

وہ ناراض لہجے میں بولے ''مجھے کوئی شوق نہیں، کسی بے گناہ پر گولی چلانے کا، میں جوتے گانٹھ کر اپنا پیٹ پالوں گا، مگر غلط کام نہیں کروں گا۔'' میں نے کہا ''ابا جی! میں نے بھی تو رشوت نہ لینے پر ملازمت چھوڑی ہے۔ میں بھی آپ کا بیٹا ہوں۔ میں ہزار جوتے کھا کر ہزار پیاز بھی کھا لوں گا، مگر کبھی کوئی غلط کام نہیں کروں گا''۔

اس جواب پر وہ خوش ہوئے مگر اپنی عادت کے مطابق خود پر قابو پائے رکھا۔

''اچھا ٹھیک ہے، جاؤ..... کسی وقت تجھے آدم خور درندوں کے متعلق کام کے گر بتاؤں گا''۔

پھر میں کچھ عرصے بعد اشوک کمار اور کفے سے ملا تو اشوک کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ شکار کے دوران وہ گھوڑے سے گر گیا تھا۔ میں نے اسے مشورہ دیا کہ اب وہ اپنی بیوی سے گھڑ سواری سیکھ لے۔

وہ اپنی پٹی پر ہاتھ رکھ کر خوب درد بھری ہنسی ہنس کر بولا ''کفے سے میں نے گھڑ سواری سیکھنے کی کوشش کی تھی مگر یہ استانی بڑی سخت اور جابر ہے۔ اس کی مار اور ڈانٹ کھانے سے تو لاکھ بہتر یہ ہے کہ میں خود ہی گھوڑا بن جاؤں اور ادھر اُدھر ہنہناتا پھروں، دولتیاں جھاڑوں۔''

میں نے اشوک سے کہا ''دوست..... معاف کرنا، اُستاد کیسا بھی ہو سخت گیر اور کڑوا کیوں نہ ہو، اُس سے علم و فن سیکھ لینا چاہیے، یہی عمر بھر کام آتا ہے۔''

■■■

سفر نامہ

ہم بے خبر تھے کہ

''خان یونس''

میں ہمارے ساتھ کیا ہونے والا ہے

غزہ ڈسٹرکٹ کے شہر ''خان یونس'' کے سفر کا ایک حیران کن باب

مصری بارڈر تک جانے سے اچانک روکنے کی وجہ کسی کی بھی سمجھ سے باہر تھی۔

کبھی قدرت اپنے فیصلے یوں بھی کرتی ہے۔

اختر عباس

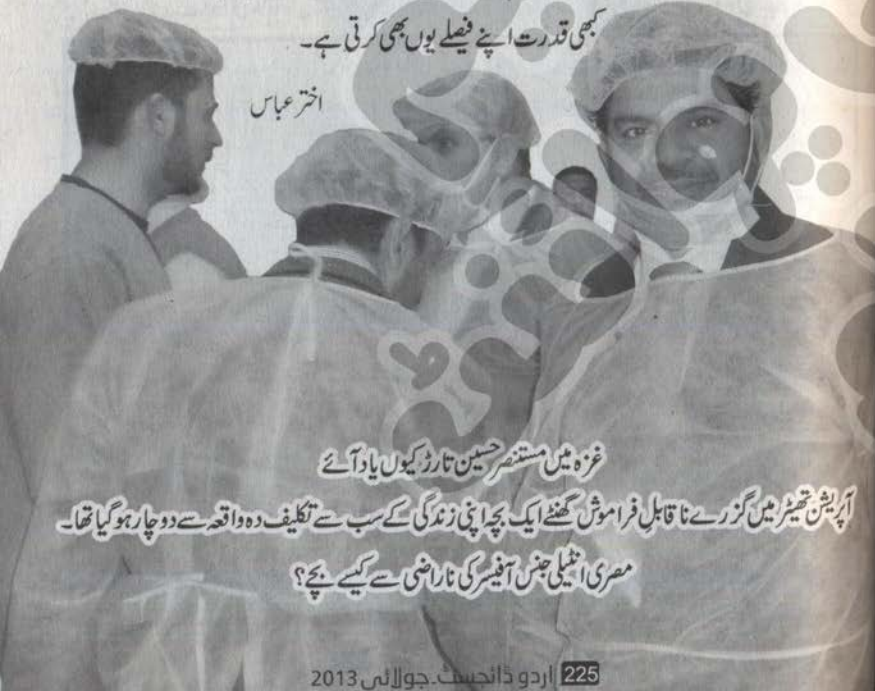

غزہ میں مستنصر حسین تارڑ کیوں یاد آئے

آپریشن تھیٹر میں گزرے ناقابلِ فراموش گھنٹے ایک بچہ اپنی زندگی کے سب سے تکلیف دہ واقعہ سے دوچار ہو گیا تھا۔

مصری انٹیلی جنس آفیسر کی ناراضی سے کیسے بچے؟

حریت پسندوں کا شہر

نام

بے شک عجیب تھا مگر شہر اچھا تھا۔ صاف ستھرا نہ بہت پھیلا ہوا، نہ بہت سکڑا ہوا۔ یہاں ہم دوپہر 2 بجے کے قریب پہنچے تو اس بات سے بے خبر تھے کہ ہمارے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔ گاڑی میں میرے اور ڈاکٹر انتظار صاحب کے بیگ پیک کیے پڑے تھے، خیال تھا کہ خان یونس ہسپتال میں رک کر ڈاکٹر عمران صاحب اور عمران غیور صاحب سے مل لیں گے اور دو چار دن بعد جب وہ یہاں سے روانہ ہوکر قاہرہ پہنچیں گے تو اس بارے میں تبادلہ خیال ہوجائے گا۔

انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوکچھ اور جاتا ہے۔ قاہرہ سے ہمیں لینے کیلئے گاڑی رفح بارڈر پر صبح سے کھڑی تھی۔ ہم غزہ سٹی میں عمائدین سے الوداعی ملاقاتوں میں مصروف رہے، پھر ہوٹل کموڈور پہنچ کر جلدی جلدی میں اپنا سامان پیک کیا اور ادھر سروس والے لڑکے نے انہیں گاڑی تک پہنچایا۔ ہوٹل کے استقبالیہ والے سے مصافحہ کیا۔ اس نے بہت گرم جوشی سے رخصت کیا۔ محسوس ہی نہیں ہورہا تھا کہ ہم تو یہاں پہ دو تین دن سے مہمان تھے۔ گرم جوش مہمانداری اور بھرپور مصروفیات نے جیسے ہمیں اپنے اندر سمو لیا تھا۔ شاید یہی انجذاب ہوتا ہے جو اچھے لوگوں اور شہروں کو یادوں کا حصہ بنا دیتا ہے۔ جاتے ہوئے مُڑ مُڑ کر غزہ اور اسکی سڑکوں کو دیکھ رہے تھے۔ ڈاکٹر عبدالسلام سپرنٹنڈنٹ اور ڈائریکٹر جو اس دورے کے انتظامی معاملات کو دیکھ رہے تھے ہوٹل سے ہمیں رخصت کرتے ہوئے دل گیر بھی تھے۔ ایک موقع پر انھوں نے کہا تھا ''میں نے ڈاکٹر کاشف سے بہت سیکھا مگر ان جیسا بننے میں وقت درکار ہے۔'' میرا اندازہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب کا دھیما پن اور لوگوں کے ساتھ حسن سلوک انہیں سرکاری طور پر کافی آگے لے کر جائے گا۔

کل شام جب ڈاکٹرز کا سیمینار ختم ہورہا تھا تو ڈاکٹر عبدالسلام نے مجھے اور بٹ صاحب کو اپنی ان ڈاکٹرز سے ملوایا جو میڈیکل کالج میں پڑھ رہی تھیں اور مستقبل میں آئی کو بطور کیریئر اختیار کرنے والی تھیں۔ ہم دونوں نے تھوڑا تھوڑا خطاب فرمایا، بٹ صاحب کو ایک آئیڈیا سوجھا انھوں نے ایک کاغذ پر سب سے دستخط اور پاکستانی ڈاکٹرز کے لیے پیغام لکھوانے شروع کردیئے۔ بعد میں انھوں نے کہا یہ MOU سے

مریض بچوں کو ٹافیاں تقسیم کرتے ہوئے

بڑی کامیابی اور دورے کی خوب صورتی ہے۔

مستنصر حسین تارڑ کی یاد

اس موقع پر مجھے مستنصر حسین تارڑ بہت یاد آئے، سوچا انھوں نے جاتے ہی پوچھ لینا ہے ہاں بھئی ایڈیٹر بھیا! کوئی کام کی چیز بھی دیکھی یا بس دفتروں اور لوگوں کو ہی دیکھتے رہے؟ یہ سوچتے سوچتے میں بے خیالی میں مسکرا رہا تھا جب اچانک ایک بے حد خوب صورت لڑکی میرے پاس آئی اور بولی "I like Pakistanis" خوش شکل لڑکی کے منہ سے اتنا اچھا جملہ سن کر بڑی خوشی ہوئی۔ میں بھی تو انہی پاکستانیوں میں شامل تھا۔ اس نے آٹو گراف لیا پھر ساتھ کھڑے ہوکر تصویر بنوانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ ہمارے فوٹو گرافر نے جو اصل میں انہی کا تھا، تصویر لینے میں ذرا برابر تاخیر نہ کی۔ میں سوچ سوچ کر مسکراتا رہا کہ چند منٹ کی یہ ملاقات اُردو ڈائجسٹ میں لکھوں گا تو چند سطروں میں ہی آجائے گی اور سفرنامے کے روایتی فارمیٹ میں لکھنا شروع کیا تو کیا کہانی بنتی ہے۔ مسکراہٹوں کے تبادلے میں عربی شدید طرح سے حائل تھی، اللہ معاف کرے ویسے تو کبھی احساس نہیں ہوا کہ عربی کیوں نہیں سیکھی، کیوں نہیں آتی اس لمحے گونگی مسکراہٹ نے عربی کی فضیلت کافی واضح کردی۔

''دوشیزہ'' کا انگریزی میں ہاتھ تنگ تھا ہمیں عربی نہ آتی تھی بے زبانی تھی زبان میری والا معاملہ ہوا۔ وہ قہوہ پیتی رہی اور میں علیحدہ گلاس میں سادہ پانی۔ اب تارڑ صاحب سے ڈانٹ نہیں پڑے گی تو اور کیا ہوگا۔ گروپ فوٹو ہونے لگا تو اسے میں نے شریک ہونے کی دعوت دی۔ وہ دور کھڑی قہوے کی چسکیاں لے رہی تھی۔ وہ اللہ کی بندی بھی ساتھ آکر کھڑی ہوگئی۔ وہ ''غریب'' چاہے اپنا ''بزرگ'' سمجھ کر احترام کیے جارہی ہو۔ تارڑ صاحب کے فکری زیرسایہ ہونے کے اپنے نقصان وفوائد ہیں۔ میں نے شام میں ہم راہیوں سے بھی ذکر نہ کیا کیونکہ سبھی بٹ صاحب کو چھیڑ رہے تھے اور وہ چھڑ رہے تھے کہ یہاں کام کے بڑے مواقع ہیں۔ رشتہ بھی آسانی سے ہوجائے گا اور مقامی منکوحہ ہونے کے نتیجے

خان یونس کا یہ قصبہ بے حد تاریخی اہمیت کا حامل ہے اور کئی صدیوں سے آباد ہے غزہ سٹرپ کے جنوب میں واقع یہ قصبہ بحیرہ روم سے 4 کلو میٹر دور ہے۔ گرمیوں میں یہاں درجہ حرارت عام طور پر 30 سنٹی گریڈ اور سردیوں میں 10 سنٹی گریڈ رہتا ہے۔ بارش سال بھر میں 260 ملی میٹر تک ہوجاتی ہے۔ 2007 میں آبادی ایک لاکھ 42 ہزار تھی۔ جو اب بڑھ کر ساڑھے تین لاکھ کو عبور کرچکی ہے۔ فلسطینی پارلیمنٹ کے لئے یہاں سے 5 ممبر منتخب کیے جاتے ہیں۔ 2006 کے الیکشن میں منتخب ہونے والے 3 کا تعلق حماس سے تھا اور 2 الفتح سے تھے۔

14 ویں صدی میں جب یہ قصبہ آباد ہوا تو اول اول اس کا مقصد مسافروں اور حاجیوں کو آرام پہنچانا تھا اور امیر یونس النروزی نے 1387ء میں اسی مقصد کے لئے آباد کیا۔ مملوک بادشاہ سلطان برکہ کے عہد میں پورے ریجن کی تجارتی سرگرمیوں کا مرکز بن چکا تھا۔ خان یونس ہی وہ واحد جگہ ہے جہاں 1956ء کی ''جنگ سویز'' میں مصری فوج نے کچھ مزاحمت کی اور بعد میں ہتھیار ڈال دیے۔ اسرائیل نے قبضہ کرکے قریباً 270 مسلح سویلین کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر مار ڈالا۔ 1967ء سے یہاں پر اسرائیل کا قبضہ رہا۔ اُوسلو معاہدے کے مطابق اسے نئی بننے والی فلسطینی اتھارٹی کا حصہ بنا دیا گیا۔ 02-2001 میں اسرئیلی بیلی کاپٹروں نے بمباری کرکے یہاں بہت تباہی مچائی اور سیکڑوں لوگ مارے گئے۔ یہ مجاہدین کا گڑھ رہا ہے۔ اس لیے اسرائیلی فوج یہاں ہمیشہ بلڈوزروں کے ساتھ حملے کرتی رہی ہے اور ہراس بلڈنگ کو گرا دیتی ہے جہاں سے ''ملی ٹینٹ'' حملے کرتے تھے۔ 2005 سے قریباً 2500 قسام راکٹس اسرائیلی شہر Sderot پر پھینکے جاچکے ہیں۔ جوابی حملے میں ہمیشہ بہت اموات ہوتی رہی ہیں۔ 2012ء تک غزہ سٹرپ میں سب سے زیادہ بے روزگاری کا شکار یہیں کے لوگ ہیں۔

میں وہ غزہ میں ہی رکھ لیں گے۔ کبھی کبھی دورے پر پاکستان آتے جاتے رہیے۔ بڑے عمران صاحب نے دور خلاؤں میں سوچتے ہوئے کہا ''یارو! آئیڈیا تو اچھا ہے، بٹ صاحب تیار نہ ہوں تو کسی اور کی خدمات کا بھی سوچا جاسکتا ہے۔'' اس نے اپنا ای میل بھی دیا تھا۔ بے شک مشکل سا نام تھا مگر اسی کی طرح جاذب تھا۔ نام یاد رکھنا تو دور کی بات وہ چٹ بھی کہیں کھو بیٹھا۔ میری بیٹی انشراح کبھی کبھی صبح ناشتے کے بعد تنگ کرنے کے لیے کہا کرتی ہے ''بابا ہر چیز کی ایک جگہ ہوتی ہے اور ہر چیز کو اپنی جگہ پر ''نہیں'' ہونا چاہیے۔''

اللہ کا شکر ہے اس لمحے گاڑی میں ہر چیز اپنی اپنی جگہ پر تھی اور بحیرہ روم کے کنارے ٹوٹی کشتیوں، پھٹے بادبانوں اور تازہ شکار کی ہوئی مچھلیوں کو دیکھتے خان یونس کے قریب پہنچ رہے تھے۔ پروٹوکول افسر سعید اور فوٹو گرافر عبداللہ ہمارے ساتھ ہی شریک سفر ہوئے۔ پروگرام یہ تھا کہ چار بجے تک بارڈر کراس کر جائیں گے۔

دو بجے خان یونس کے بہت بڑے سرکاری ہسپتال کے ڈائننگ ہال میں ڈاکٹروں کے ایک پورے گروپ سے ملاقات ہوئی جو پاکستانی مہمانوں سے تربیت پا رہا تھا۔ ہسپتال کا انتظام دیکھ کر خوشگوار حیرت ہو رہی تھی۔ پانی کی کمی کے باعث ایک ایک پودے کے نیچے کالے رنگ کا پائپ پہنچایا گیا تھا۔ اس سے پوری زمین نہیں سینچی جاتی صرف پودوں کی جڑوں کو مطلوبہ پانی فراہم کر دیا جاتا ہے۔ ہسپتال میں کچھ بین الاقوامی ڈونرز نے پینے کے پانی کے سسٹم لگا دیے تھے۔ ڈائننگ ہال کا ماحول بذات خود اپنے اندر حیرانی لیے ہوئے تھا۔ صاف ستھرے کک اور مہمانوں کو سرو کرنے والے ملازم۔ ایک لحاظ سے بوفے کا ہی منظر تھا۔ کھجور، جام، اچار، گول روٹیاں سب درمیانی میز پر سجی تھیں اور اس کے بعد چاول اور سالن سرو کر دیا گیا۔ کھانے کے بعد سبھی کو گفتگو میں مصروف پایا تو میں ساتھ ہی لان میں واقع مسجد میں چلا گیا۔ نماز ظہر اور عصر قصر کر کے پڑھیں اور وہیں لیٹ گیا۔ آنکھ کھلی تو 3 بج چکے تھے اور بٹ صاحب عمرہ پہ جانے والے زائرین کو انڈکر رہے تھے۔

آپ کی تیاری مکمل ہو۔ ذہنی بھی اور عملی بھی، ایسے میں ایک دم سے پروگرام میں رکاوٹ پڑے۔ خلل آئے یا موخر ہو جائے کوئی نہ بھی کہے، غصہ بھی آتا ہے اور برا بھی لگتا ہے۔ اب حالت یہ تھی کہ کسی کو بھی خبر نہیں تھی کہ کیا ہوگا۔ کیا کرنا ہے۔ غالب امکان یہی تھا کہ واپس غزہ سٹی جا کر کموڈور میں آرام کریں گے اور اگلے دن سفر پر نکلیں گے۔ اچانک ایک ڈاکٹر صاحب نے کہا آئیے ہمارے ہاں آنے والے مہمان ڈاکٹرز کا ایک ہاسٹل ہے۔ اسکی تیسری منزل پر آپ ٹھہریں گے اور کل یہیں سے روانہ ہوں گے۔ ہمارا سامان کافی بھاری ہو چکا تھا اور میں تو بالکل اسے اٹھانے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ کمر درد سے افاقہ تو تھا مگر کسی وزن اٹھانے کی جذباتی غلطی اور نادانی سے اسے بلایا جائے تو وہ ظالم تو واپسی کے لیے تیار ہی بیٹھا ہوتا ہے۔

ڈاکٹرز ہاسٹل میں

آمنے سامنے وہاں دس کمرے تھے اور ایک کچن نما کمرہ۔ ہمارے عارضی گائیڈ نے دروازے تک پہنچا کر کہا آپ کسی بھی کمرے کو پسند کر کے اپنا سامان رکھ لیں۔ یہ کہہ کر وہ آناً فاناً سیڑھیاں اتر گئے۔ اب وہاں ہم دونوں تھے اور بھائیں بھائیں کرتے دس کمرے۔ ہر کمرے میں 5،5 بیڈ لگے ہوئے تھے۔ ایک لمحے کو بہت برا لگا

کہاں کموڈور ہوٹل کہاں یہ ہاسٹل، خیال آیا کیا مہمانداری کے تین دن پورے ہوگئے ہیں۔ ساتھ ہی ڈاکٹر کاشف کے ڈپلومیٹک جملے کانوں میں گونجنے لگے جب وہ ایم۔ او۔ یو پر دستخط کر چکے تو انھوں نے کہا تھا ''آپ کے ہاں سے آنے والے ڈاکٹرز کو ہم ہاسٹلز میں ٹھہرایا کریں گے۔ ہوٹلز میں ٹھہرانا مناسب نہیں رہے گا۔''

F.16 کی آمد

ایک کمرہ جس میں بالکل نئے کمبل اور بستر بچھے تھے، پسند کر کے اپنا بیگ وہاں منتقل کر لیا۔ آرام کرنے سے پہلے ضروری سمجھا کہ آس پاس کا مکمل جائزہ لے لیا جائے۔ سیلف سروس کی بنیاد پر کام کرنے والا ایک کچن تھا۔ فرج میں کھیرے اور ٹماٹر وافر مقدار میں پڑے تھے۔ ٹیبل پر روایتی سوکھی اکڑی ہوئی گول بریڈ جس کے اندر کھیرے رکھ کر کھائے جاتے ہیں بھی موجود تھی۔ پنیر بھی تھا اور ڈبہ بند سالن کے علاوہ کھجور بھرے بسکٹ پڑے تھے۔ چائے بنانے کا موڈ ہوا تو معلوم ہوا کہ برتن تو ہیں پر ڈسپوزایبل، تھوڑی دیر میں چائے تیار ہوگئی۔ خوش قسمتی سے اتنے دنوں بعد گاڑھے اور میٹھے دودھ کا ڈبہ میسر آگیا۔ تب تک 4 بج چکے تھے اور وقت رینگ رینگ کر گزر رہا تھا۔ بیگ کھول کر پڑھنے کے لیے جونہی کتاب نکالی، نیند سے بوجھل آنکھیں بند ہونے لگیں۔

یہ سوچ کر بے اختیار مسکرا دیا کہ جب بھی پڑھنے کی کوشش کی، ہمیشہ نیند سے منہ کی کھائی اور چار لفظ پڑھے بنا نیند کی وادی میں اترنا پڑا۔ اب یہ تھکاوٹ کا اثر تھا یا باہر بدلتے ہوئے موسم کی ہلکی ہلکی خنکی کا کہ لیٹتے ہی نیند آگئی۔ دو گھنٹے بعد آنکھ کھلی تو ڈاکٹر انتظار بٹ صاحب ساتھ والے پلنگ نما بیڈ پر براجمان اپنے لیپ ٹاپ سے کھیلنے میں مصروف تھے، انھوں نے بتایا کہ دونوں بزرگ ڈاکٹر صاحبان ملے بغیر غزہ چلے گئے ہیں۔ یہاں کوئی بندہ ہے نہ بندے کی ذات کہ جس سے رابطہ کیا جاسکے اور جو کچھ بتا سکے یا کسی سے رابطہ ہی کروا سکے۔ پھر یہ کہ غزہ سٹی سے نکلتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے اپنے فون کی سم ڈاکٹر عبدالسلام کو دیتے ہوئے تاکید کی کہ یہ ڈاکٹر عمران صاحب کو دے دیں جو

خان یونس ہسپتال کے ڈاکٹرز کے ساتھ

مزید چند روز غزہ میں رہنے والے تھے۔ ہمیں رابطے میں آسانی ہوگی۔ سارے رابطے کے نمبر اُسی سم میں تھے۔ ڈاکٹر عبدالسلام انھیں وہ سم دینا ہی بھول گئے اور پریشانی یہ تھی کہ وہ دونوں ڈاکٹر بھی ہوا میں معلق ہوں گے۔ انھیں یہ بھی خبر نہیں تھی کہ ہم آج جا نہیں پائے اور اب کل جائیں گے۔ میں نے بٹ صاحب سے کہا کہ کیوں نا ان کو بھی کل ساتھ لے کر جایا جائے۔ دونوں بزرگ ہیں، لمبے سفر میں ان کا کون خیال رکھے گا اور دونوں عربی کا ایک جملہ نہیں سمجھ اور سمجھا سکتے، اسی پر اتفاق ہوا۔ بٹ صاحب کی اچھی عادتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بات فوراً مان لیتے ہیں۔ امید ہے ابھی بزرگ بننے میں ''ایک'' دہائی تو لیں گے، تب کیسے ہوں گے امید تو اچھی ہی ہے۔

ابھی ہم کل کی منصوبہ بندی ہی کر رہے تھے کہ اچانک فضا میں ایک خوفزدہ کرنے والی گونج اور گڑگڑاہٹ پیدا ہوئی۔ تین دن سے سن رہے تھے کہ اسرائیلی F.16 وقتاً فوقتاً جب جی چاہے آتے ہیں کبھی بم گراتے ہیں اور کبھی ڈرا کر واپس چلے جاتے ہیں، ان کو روکا جاسکتا ہے اور نہ ان پر جوابی حملہ ہی کیا جاسکتا ہے۔ میں بے اختیار اُٹھ کر کمرے کے ساتھ بنی ہوئی بالکنی میں آگیا۔ بے شک عمارت مضبوط تھی مگر دائیں بائیں نہ کوئی بندہ نہ بندے کی ذات، کوئی جاننے والا یا شناسا بھی نہیں تھا۔ ایسے میں بیٹھے بٹھائے بغیر کچھ کیے شہید ہونے میں چارم نہیں تھا۔ اس لیے اللہ جی سے خیریت سے رکھنے کی دعا کی۔ F.16 ذرا نیچی پرواز پہ ہو اور ہو بھی اسرائیل کا تو آواز بھی زیادہ پیدا کرتا ہے۔ میں نے چشم تصور میں آس پاس کی عمارتوں کو دھماکوں سے گرتے دیکھا، مٹی اور دھوئیں میں اپنے والی بلڈنگ کو بھی گھرے پایا تو گھبرا کر ذہن کو جھٹک دیا۔ یہاں طبی چھوڑ ہنگامی امداد کے بھی جلدی پہنچنے کا امکان نہ تھا۔ بٹ صاحب شاید مسلسل دیکھ رہے تھے۔ بیڈ سے ٹیک لگا کر بولے:

جی تو چاہتا ہے شہید ہو جائیں
سنا ہے ظالم جان سے مار دیتے ہیں

پھر بولے اس کام کے لیے اپنا ہی ملک اچھا ہے بھائی۔ یہاں تو غیر ملکی شہداء کے لیے الگ سے پتا نہیں کوئی پروٹوکول ہے بھی یا نہیں۔

میں نے جواباً کہا خیر مانگیں پتا چلے اپنے ہاں سے ہماری ''باقیات الصالحات'' کو لینے سے ہی پاکستانی حکومت انکار کردے کہ ''ساڈے کولوں کیہڑا پچھ کے گئے سی'' (ہم سے کون سا پوچھ کر، اجازت لے کر گئے تھے)

خان یونس روڈ کے جانے کی اصل وجہ

شام ہونے والی تھی جب ایک نوجوان ڈاکٹر صاحب ہمارے پاس پہنچے۔ تعارف ہوا تو پتا چلا ان کے والد حماس گورنمنٹ میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں، میں نے موقع غنیمت جان کر اس سے پوچھا ''حماس سے پہلے یہاں کئی دہائیاں الفتح حکومت رہی۔ ویسٹ بنک میں وہ اب بھی حکمران ہیں۔ یہاں وہاں، جہاں ان کا بس چلتا ہے وہ حماس کے لوگوں پر حملے ہی نہیں کرتے انھیں جان سے مارنے سے بھی دریغ نہیں کرتے، مگر حماس والے ان کے خلاف بات کیوں نہیں کرتے،'' وہ الفتح کے حق میں تھا مگر باوجود کوشش کے وہ حماس کے خلاف کوئی دلیل فراہم نہ کرسکا۔ ہم دونوں ہر طرح سے ٹوہ لینے کی کوشش کرتے رہے۔ پتا چلا کہ موصوف کو پہلے دور میں موجود ہر طرح کی آزادیاں زیادہ بھاتی تھیں، حماس والے اس معاملے میں لحاظ نہیں کرتے۔ انھوں نے شادیاں آسان اور شناسائیاں مشکل بنادی ہیں۔ پھر اسے قصام پر بہت غصہ تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اسرائیل کیلئے تو یہ ایک دہشت ہے ہی، ہمارے جیسے ترقی پسند اور روشن خیال بھی آزادی سے سوچ نہیں سکتے۔ پتا نہیں آپ کے آس پاس والا کون سا آدمی قصام کا ہے۔ ممکن ہے وہ مزدور ہو، دکاندار، کوئی ڈسپنسر یا ڈاکٹر یہ سارے لوگ دن کو اپنا اپنا کام کرتے ہیں، شام ہوتے ہی ان کی شکلیں اور یونیفارم بدل جاتی ہے۔ شہر اور قصبے کا امن، جرائم سے حفاظت، یہ اپنے ذمے لے لیتے ہیں۔ یہ سارے رضاکارانہ کام کرتے ہیں اور پاگل پن کی حد تک اپنی ''چین آف کمانڈ'' سے جڑے ہوئے وفادار ہوتے ہیں۔

''تفریح کے کیا مواقع ہیں؟'' اس نے دکھی دل سے کہا ''ایک سینما تھا وہ بھی نہیں رہا۔'' کیا حماس والوں نے ڈھا دیا یا قبضہ کرلیا؟'' بولا نہیں انھوں نے لوگوں کو ہی قائل کیا کہ ان کے بچوں کے اخلاق خراب ہو جائیں گے تو انہی کا نقصان ہوگا۔ اس پر ایک صاحب نے وہ سینما ہی خرید لیا اور اسے لائبریری بنا کر عام لوگوں کیلئے کھول دیا۔ ڈاکٹر صاحب کی آزاد روی کا راز پتا چلا کہ کئی سال کراچی میں رہے، وہیں سے ایم۔بی۔بی۔ایس کیا۔ بتا رہے تھے کہ کالج میں پروفیسرز کو اگر پتا چلتا کہ لڑکا عربی ہے تو سوال سخت سے سخت کرتے اور اگر معلوم ہوتا کہ فلسطینی ہے تو وہ کوشش کرتے کہ آسان سے آسان سوال کریں۔ اسے کراچی کی زندگی اور لوگ بڑے پسند تھے۔ نہ کوئی روک ٹوک اور نہ کوئی پابندی، موجودہ کراچی کے حالات سے بہرحال وہ قطعی ناواقف تھا۔ اپنے پسند کے ماضی میں جینے اور رہنے کی بڑی سہولت اور آسانی ہوتی ہے۔ نماز مغرب سے پہلے وہ ہم سے رخصت ہوگیا۔ پتا چلا کہ ہسپتال کے سپرنٹنڈنٹ صاحب نے انھیں ہمارے پاس دلداری کیلئے بھجوایا تھا۔

رات اترے کافی دیر ہوچکی تھی، بھوک بار بار دستک دے رہی تھی اور آس پاس کوئی میزبان اس دستک کو سننے والا نہیں تھا۔ کچن میں جاکر ''کھجور سے بھرے بسکٹس'' کے کچھ پیکٹس لایا اور وقتی طور پر کام چلانے کی کوشش

دوبارہ رفح کے بارڈر پر۔۔۔غزہ سے واپسی

کی۔اسی دوران ہسپتال کے سپرنٹنڈنٹ ڈاکٹر یوسف فوزی صاحب خود آگئے۔ بہت محبت سے ملے اور بولے ”قدرت کا اپنا ایک نظام ہے۔ہم اور آپ سوچ رہے تھے کہ کیوں رفح بارڈر والوں نے عین موقع پر آپ کو بارڈر پار کرانے سے منع کردیا۔ پھر آپ نے غزہ سٹی واپس جانے کی بجائے ادھر ہی قیام کا فیصلہ کرلیا۔ میں نے سوچا تھا رات کو آپ کے ساتھ کھانا اکٹھے کھائیں گے پھر آپ کو شہر دکھائیں گے کہ آپ میرے پاکستان سے آئے ہیں۔ وہ آٹھ سال پشاور میں رہے ،وہیں میڈیکل کی تعلیم مکمل کی اور پھر کئی سال آنکھوں کے ڈاکٹر کے طور پر پریکٹس بھی کی۔ انھوں نے بٹ صاحب سے کہا ”اسرائیل کے فوجیوں سے جھڑپوں کے دوران ہماری نئی نسل دور سے پتھر سے نشانہ مارنے کی بڑی ماہر ہوگئی ہے، مگر بدقسمتی سے یہ مہارت عام دنوں میں گلی کوچوں میں بھی ظاہر ہونے لگی ہے۔

آج شام ایک محلے میں بچوں نے باہم کھیلتے ہوئے ایک پتھر پھینکا تو چھ سات سال کے ایک بچے کی آنکھ میں آن لگا۔ اس پتھر نے بچے کی آنکھ کو اس حد تک تباہ کردیا کہ اس کا آئی بال (ڈیلا) پھٹ گیا ہے۔ آس پاس کی ساری نسیں کٹ گئی ہیں اور آنکھ کے پیچھے تک اس چوٹ نے اثر دکھایا ہے۔ یہ ایسا نازک اور رسکی آپریشن ہے جسے ہمیں ہنگامی طور پر کرنا ہے اور ہمیں اندازہ ہے کہ ہم نہیں کرپائیں گے۔ ڈاکٹر انتظار بٹ نے جلدی سے جوتے پہنتے ہوئے کہا آپ اپنے باقی سرجن کو بھی بلوالیں۔ وہ وہاں موجود رہیں میں ساتھ ساتھ ان کو سمجھاتا اور سکھاتا جاؤں گا، ایسے آپریشن میری اسپیشلیٹی (تخصص) ہیں۔ میں نے گفتگو سنی تو بچے کی حالت کا سوچ کر لرز کر رہ گیا۔ پوچھا کتنی دیر کا آپریشن ہوگا بتایا گیا، کئی گھنٹے لگ جائیں گے۔ بٹ صاحب نے شاید میرے دل میں آئے غم کو بوجھ لیا کہ میں اتنی دیر یہاں بیٹھ کر کیا کروں گا؟ بولے آپ بھی تیار ہوجائیں۔ آپریشن تھیٹر میں ہمارے ساتھ رہیے۔ وہاں سے ہم تیز رفتاری سے چلتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کے آفس پہنچے وہاں کچھ مریض بیٹھے ہوئے تھے۔ بٹ صاحب سے فرمائش کی گئی کہ ان کو دیکھ لیں اس دوران مریض بچے کو آپریشن کیلئے تیاری کے مراحل میں ڈال دیا گیا۔ آپریشن تھیٹر میں داخلے سے پہلے کپڑے بدلے گئے۔ مجھے بھی سرجن والا لباس سر کی ٹوپی، چہرے پہ ڈالنے والا نقاب اور پاؤں پہ پہننے کیلئے پلاسٹک کور والے جوتے دیے گئے۔ میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ کبھی آپریشن تھیٹر جانے کا اتفاق بھی نہیں ہوا تھا۔ جن دنوں ایس ای کالج بہاولپور میں ایف،ایس،سی میں داخلہ لیا۔ پہلے ہی ہفتے آپریشن تھیٹر میں مینڈکوں کی چیر پھاڑ اور کتابوں میں دی گئی آپریشن کی تفصیلات سے گھبرا کر بیالوجی چھوڑ دی تھی کہ خون دیکھا نہ جاتا تھا۔ گردے میں پتھری کا سامنا کرنا پڑا تو ڈاکٹر صاحب نے لٹا کر آپریشن کرنے کی بجائے لیتھوٹراپسی کردی یعنی لیزر سے پتھری توڑ کر اس درد سے نجات دلادی جو والدہ کی

”اسرائیل کے فوجیوں سے جھڑپوں کے دوران ہماری نئی نسل دور سے پتھر سے نشانے مارنے کی بڑی ماہر ہوگئی ہے، مگر بدقسمتی سے یہ مہارت عام دنوں میں گلی کوچوں میں بھی ظاہر ہونے لگی ہے

وفات والے دن سے شروع ہوئی تھی اور ایک ہفتہ تک اس عالم میں تڑپاتی اور رلاتی رہی کہ بیان مشکل ہے، یہاں تک کہ اگلے ہفتے والد صاحب بھی رخصت ہوگئے اور یہ درد چھوٹا پڑ گیا۔ درد کی دوا کبھی کبھی اس سے بڑا درد ہوتا ہے۔ 77ء میں جب بھٹو صاحب کے خلاف الیکشن دھاندلی کے خلاف قوم سڑکوں پر تھی تو والد محترم کو امریکن یونیورسٹی بیروت میں پڑھنے کیلئے منتخب کیا گیا۔ پورے پنجاب سے دو یا تین سرکاری آفیسرز تھے جنھیں بیروت بھیجا گیا۔ تب ان کی پوسٹنگ بہاولپور کے قریب نور پور نورنگا ہائی سکول میں تھی، ہڑتال کا دن تھا۔ پورے ملک میں ٹریفک بند تھی اور انھیں بہاولپور سے کراچی کیلئے روانہ ہونا تھا۔ نور پور سے ایک رکشہ ڈرائیور کو منہ مانگی رقم پہ تیار کیا گیا۔ بیس پچیس کلومیٹر کی بے یقینی سے بھرا وہ سفر ابو بتایا کرتے تھے بہت لمبا اور تکلیف دہ تھا۔ مگر بیروت پہنچ کر جب کبھی انھیں یونیورسٹی کیمپس سے باہر نکل کر شہر میں گھومنے کا موقع ملتا تو فلسطینیوں کے لیے قائم مہاجر کیمپ کی حالتِ زار بے یقینی اور خوف سے بھری زندگی شدید دکھ میں مبتلا کردیتی۔

سال بھر بعد وہ واپس آئے۔ بیروت جو کبھی خوب صورتی، حسن، مٹھاس کا مرقع ہوتا تھا، دنیا بھر سے سیاح اس زمینی جنت کی سیر کو آتے جس کے گھر گھر کی بالکونیوں پر سبز انگوروں کے خوشے مسکراتے اور سیبوں کی لٹکتی ہوئی پھلدار شاخیں اپنائیت بھری خوشبو سے مسافروں اور سیاحوں کے قدموں کو روکنے کا باعث بنتیں۔ تب بیروت ایسا زندگی بھرا، آسودہ حال شہر تھا جس کے خوابوں کے آسمان کی وسعت فرانس اور یورپ تک پھیلی ہوئی تھی۔ زندگی کا رس کبھی بھی بانٹے بنا باقی نہیں بچتا۔ فلسطینی پناہ گزینوں کی بے بسی، بے عزتی، رسوائی اور بیماریوں سے بھرے شب و روز طویل ہوئے تو قادر مطلق نے بیروت کو خانہ جنگی کے حوالے کردیا۔ پھر یہی بیروت دنیا کے مظلوم ترین ہزاروں فلسطینیوں کے دو کیمپوں صابرہ اور شتیلہ میں ڈھائے جانے والے انسانی تاریخ کے بدترین مظالم کا گواہ بنا جن میں سے کسی کو سانس لینے کے قابل ہی نہ چھوڑا گیا۔

اپنے گھر میں میں نے پہلی بار فلسطینیوں کا ذکر انہی دنوں سنا۔ اخباروں سے پڑھی خبروں اور چھپی تصویروں سے بعد میں ہونے والے قتل عام کو کبھی بھلا نہ سکا۔ حتیٰ کہ الطاف فاطمہ نے اپنے افسانے ”تارِ عنکبوت“ میں اس کیمپ کی عکاسی کرتے ہوئے اسے ادب میں زندہ کردیا۔ بیروت اور لبنان پہ تب کا آیا زوال چند سال پہلے اسرائیلی فوج کے حملوں کے وقت اپنے کمال کو پہنچ چکا تھا جب حامد میر نے بیروت جا کر لبنان کے فوجی صدر سے انٹرویو کیا۔ مجھے صدر کا وہ عبرتناک جواب یاد ہے جو اس نے یہ سوال سن کر دیا تھا کہ اسرائیلی فوج کا مقابلہ کرنے کے لیے آپ کی فوج کہاں ہے؟ باہر کیوں نہیں نکلتی۔ لبنان کے فوجی صدر نے کمال دانش مندی سے کہا تھا فوج بیرکس میں ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ باہر نکالیں گے تو اسرائیلی فوجیں انھیں جان سے مار دیں گی۔ یاد رہے، فوج سامنے نہیں آئی

تھی۔ حزب اللہ کی ملیشیا نے اسرائیلی فوج کے دانت کھٹے کرکے انھیں واپس جانے پر مجبور کردیا تھا، مگر وہ جاتے جاتے بھی ہر قصبے اور شہر میں فلسطینیوں کے گھروں کے آثار تک مٹا کر گئے تھے۔ بدقسمتی سے جلاوطن اور پناہ گزین فلسطینی لوگوں نے اس عذاب کا سامنا اُردن میں بھی کیا۔ لبنان میں بھی اور اب شام میں بشارالاسد کی فوجوں کے ہاتھوں پھر اسی سلوک سے دوچار ہیں۔

حماس کے سربراہ خالد مشعل کئی دہائیوں سے شام ہی میں قیام پذیر تھے۔ اب انھیں وہاں سے بھی ہجرت کرکے مصر آنا پڑا ہے۔ قاہرہ میں منعقدہ ایک اجلاس میں ہمارے پاکستان آنے کے چند ہفتوں بعد حماس کی قیادت نے انھیں ایک بار پھر اپنی سیاسی راہنمائی کیلئے منتخب کیا ہے۔ خالد مشعل، استاد احمد یٰسین کے تربیت یافتہ ہیں اور انھی کی ہدایت پر حماس نے الفتح سے قریب ہونے اور اختلافات کو ہوا نہ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ غزہ اور خان یونس سے ذرا پہلے کم سے کم تین بڑی دیواروں پر میں نے شیخ احمد یٰسین اور یاسر عرفات کی تصاویر دیکھیں جو بڑی مہارت سے پینٹ کی گئی تھیں۔ یہ کوئی چھوٹی بات نہ تھی۔ میں پارلیمنٹ کے سپیکر ڈاکٹر احمد البحر سے پوچھنے سے اپنے آپ کو باز نہ رکھ سکا تھا۔ انھوں نے ہلکی سی مسکراہٹ سے ایک تصویر دیکھ کر میرے یوں نتیجہ نکالنے کو سراہا اور بولے شاید چند ماہ تک مزید پیش رفت ہوجائے اور دنیا کو ایک اچھی خبر ملے۔ بعد میں غزہ کی یونیورسٹی کے دورے کے دوران ہم نے معذوروں کے ادارے ''ارادہ'' (Will) میں بھی لکڑی کے بنے ہوئے طغروں، فلسطینی جھنڈوں اور دوسرے مانومنٹس کے ساتھ لکڑی میں کھدی ہوئی شیخ احمد یٰسین اور یاسر عرفات کی اکٹھی تصاویر دیکھیں۔ یہ الفتح کے ساتھ ساتھ اپنے لوگوں کیلئے بھی دی جانے والی لائن تھی کہ اب باہمی مخالفت اور دشمنی کو آخری حد پر لے جانے کے بجائے واپسی کا سفر ہوگا۔ سیاسی راہنماؤں کی سو مجبوریاں ہوتی ہیں۔ یاسر عرفات کے بعد الفتح کی قیادت سنبھالنے والے محمود عباس نے اس سوچ کے ساتھ جونہی ہم آہنگ ہونا چاہا اسرائیل نے بہت سختی سے اس کو ویسٹ بنک حکومت کی ساری امداد بند کردینے کی دھمکی دے ڈالی۔ یہاں تک کہ محمود عباس کو اپنا بڑا موثر اور معتبر وزیر اعظم (سلام فیاض) بھی بدلنا پڑا ہے جو دنیا بھر سے فلسطینیوں کیلئے فنڈنگ اور امداد کا بہت ماہر مانا جاتا تھا۔ نیا وزیر اعظم (رمی حمداللہ) ایک مقامی پروفیسر ہے اور اقوام متحدہ سے لیکر دنیا کے دیگر ڈونر اداروں تک اس کی رسائی اور شناسائی نہ ہونے کے برابر ہے۔

روتے اور دعائیں دیتے رشتہ داروں سے ہم رخصت ہوئے تو آپریشن تھیٹر سے نکلنے والا عملہ انھیں تفصیلات بتا رہا تھا۔

آپریشن تھیٹر میں رُکتے سانس

آپریشن شروع ہوا تو ڈاکٹر انتظار کی مدد اور قریبی آبزرویشن کے لیے ہسپتال میں شعبہ آئی کے سربراہ اور دو آئی سرجن موجود تھے۔ ڈاکٹر صاحب جس نمبر کا اوزار مانگتے، ایک دم سے پریشانی کی لہر دوڑ جاتی، آئی

بال کے پیچھے کٹی ہوئی جھلی کو سینے کے لیے بہت سی باریک نیڈل اور دھاگے کی ضرورت تھی۔ جس مہارت سے وہ ٹانکے لگا رہے اور ساتھ ساتھ سکھا رہے تھے میرے لیے بے حد خوشگوار حیرت اور ایک طرح سے فخر کا باعث ہو رہا تھا۔ بٹ صاحب ان سے عمر میں بہت کم تھے مگر خداداد مہارت اور دانش سے بہرہ مند تھے۔ مقامی سرجن ذہنی طور پر تیار تھے کہ آنکھ میں جتنی شدید چوٹ آئی ہے آئی بال پھٹ چکا ہے اور جھلیوں اور وینز کا ناقابل تلافی نقصان ہونے کے بعد آنکھ کی صفائی ہی واحد حل ہے کہ بعد میں کسی موقع پر وہاں پتھر کی مصنوعی آنکھ لگادی جائے جو معصوم بچے کے چہرے پر آئی بدصورتی کو کسی طور کم کردے۔ رات کا ایک بجا تھا جب ڈاکٹر انتظار بٹ نے آخری ٹانکے لگائے۔ وہ آئی بال کے اندر آئل ڈالنے کے بعد دوبارہ سی کر آنکھ کے خالی حصے میں فکس کرتے ہی نشست سے اٹھے تو ایک ملکوتی سا احساس ان کے چہرے پر تھا۔ ہنرمند ہاتھوں نے ایک ناممکن کام کر دکھایا تھا۔ سارے معاونین اور ڈاکٹرز بے حد خوش اور مطمئن تھے۔ بے شک وہ ایک ناممکن آپریشن کو کامیاب بنانے کا حصہ بنے تھے۔

ڈاکٹر عمران صاحب، ڈاکٹر عبدالسلام ساتھ کھڑے ہیں ایک فلسطینی مریضہ بچی کو پیار کر رہے ہیں

جونہی آپریشن تھیٹر سے باہر نکلے۔ بچے کی روتی ماں اور متفکر باپ کے علاوہ بھائی اور چچا نے راستہ روک لیا۔ بٹ صاحب نے اپنی عربی میں انھیں مبارک باد دی۔ سپرنٹنڈنٹ نے انھیں کہا یہ پاکستانی ڈاکٹر ایک رحمت کا فرشتہ ہے۔ آج اللہ نے اسے مصر جانے سے اسی لیے روک دیا کہ ایک معصوم بچے کو عمر بھر کے لیے روگ اور بدصورتی سے بچانا مقصود تھا۔ ان کا شکریہ میں تو ادا نہیں کرسکتا۔ بٹ صاحب نے اسی عاجزی اور انکساری سے کہا'' ہمارے لیے بھی دعا کریں، امید ہے بچہ اپنی اصل آنکھ کی مدد سے ہی انشاء اللہ دیکھ سکے گا۔''

بند بازار کی واحد بند ہوتی دکان

روتے اور دعائیں دیتے رشتہ داروں سے ہم رخصت ہوئے تو آپریشن تھیٹر سے نکلنے والا عملہ انھیں تفصیلات بتا رہا تھا۔

ڈاکٹر یوسف نے کپڑے بدلتے ہی پوچھا۔ بھوک کا کیا عالم ہے؟ ہم دونوں مظلومیت کا نشان بن گئے۔ کیا کہتے، انھوں نے فوراً گاڑی نکالی، اور وہ خان یونس کی سڑکوں پر دوڑنے لگی۔ یہ کوئی اتنا بڑا شہر تو تھا نہیں کہ رات گئے کھلا ہوتا۔ نہ کسی مرکزی شاہراہ پر واقع رات بھر آباد اور جاگنے والا سپاٹ تھا۔ ایک بازار کے آخری کونے پہ ایک برگر اور شوارما شاپ والا اپنی دکان بڑھا رہا تھا۔ لڑکے برتن سمیٹ رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کر اس نے ایک مسکراہٹ کے ساتھ اپنی جگہ چھوڑ دی۔ ڈاکٹر یوسف کا اس نے بہت لحاظ اور محبت سے استقبال کرکے اندر بٹھایا، مہمانوں کا تعارف لے کر اگلے آدھے گھنٹے میں کئی طرح کے برگر اور شوارمے بنالایا۔ سائز کافی بڑے تھے۔ ذائقہ بہرحال عمدہ تھا، ممکن ہے بھوک نے ذائقہ بڑھا دیا ہو۔ ہم جلدی سیر ہوگئے اور کافی سامان بچ گیا۔ جو ساتھ پیک کرادیا گیا۔

خان یونس کی سیر تو ممکن نہیں ہے، اہم جگہوں کے بارے میں ضرور بتایئے۔ میری فرمائش سن کر وہ ہمیں قریب ہی واقع اس لائبریری کے سامنے لے گئے جو کبھی سینما گھر تھی۔ وہاں اتر کر فوٹو گراف لینے کی کوشش کی مگر گھپ اندھیرے میں کیمرے کی روشنی بیچاری محدود سی جگہ کو ہی روشن کر پائی۔ وہاں سے چلے تو ایک قلعہ دکھایا۔ پھر ایک بازار میں لے گئے۔ جہاں جگہ جگہ ہاتھ سے لکھے پوسٹر اور بینر لگے تھے۔ بتانے لگے کہ یہ ہمارا کلچر ہے جب کوئی شہید ہوجاتا ہے تو سبھی اپنے گھروں سے پوسٹر لکھ کر لاتے ہیں اور گلی کی دیواروں پر چسپاں کردیتے ہیں۔ اس پر دعائیں اور اپنی محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ شہید ہونے والے کے درجات کی بلندی اور قربانی کا تذکرہ ہوتا ہے۔

قصام ہماری عزت، آزادی اور خودمختاری کے محافظ ہیں، بہادری اور جاں فروشی کا اظہار اور نشان ہیں اور انہی بے غرض نوجوانوں پر انحصار کرکے باقی لوگ آرام دہ نیند کے مزے لے رہے ہیں۔

تین دن تک کھانا حماس کی طرف سے یا دوست احباب کی طرف سے آتا ہے۔ لوگ خود ہی ٹینٹ لگاتے اور دریاں بچھاتے یا کرسیاں لگادیتے ہیں۔ اس سے متاثرہ گھر والوں کو بہت تقویت ہوتی ہے۔

رات اڑھائی بجے ڈاکٹر صاحب کے گھر

ڈاکٹر صاحب سے ان کے گھر کا پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ میرا اپنا گھر ہے اور کچھ عرصہ قبل ہی میں نے بنایا ہے۔ اچانک ایک گلی میں انھوں نے گاڑی روکی اور ریموٹ کنٹرول دبایا۔ گیراج کا دروازہ خودکار طریقے سے کھلتا چلا گیا۔ گاڑی گھر کے اندر داخل ہوگئی، ایک باغ نما صحن کے ساتھ ہی ہم گاڑی سے اترے۔ ان کا خیال تھا کہ اہلیہ کو اٹھا کر چائے پی جائے۔ ہم نے بڑی منت ترلے سے اس حرکت سے روکا، بھلا یہ بھی چائے کا کوئی شریفانہ وقت تھا۔ گھر دوسرے فلور پر تھا۔ نیچے والا پورا فلور صرف پلرز تھے یوں سمجھیں جب چاہے اسے ایک چھوٹے سے جلسہ گاہ کی صورت دی جاسکتی ہے۔ بچوں کے سائیکل، موٹر سائیکل اور کھلونے وہاں پہ تھے۔ گھر کے پچھواڑے میں بادام، کنو، زیتون کے بے شمار پودے تھے اور ہر پودے کے نیچے کالے پائپ بتا رہے تھے کہ پانی کی کمی کے باعث باغبانی کے لیے پانی بھی خریدنا پڑتا ہے۔ ایک میٹر لگا ہوا تھا ساتھ ایک ٹینک تھا جس سے پانی لیکر پودوں کو لگایا جاتا ہے۔ وہاں زمین ریتلی تھی اس لیے پانی کی زیادہ کھپت کو روکنے کیلئے پائپ لگائے جاتے ہیں۔ پانی کسی پرائیویٹ ٹیوب ویل سے آتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب با ذوق آدمی ہیں۔ ہر قسم کے پھلدار پودے وہاں موجود تھے۔ تھوڑی سی جگہ کا بھرپور استعمال تھا۔ ایک ہم ہیں سیکڑوں کلو میٹر موٹروے کے دونوں اطراف زرعی زمین موجود ہے جس کے لیے پانی بھی موجود ہے مگر سوائے جھاڑ جھنکاڑ اگانے اور بعد میں اسے آگ لگانے کے اور کوئی سوچ نہیں آتی۔ جہاں لگائے گئے پھلدار درخت کروڑوں روپے کی آمدنی اور لاکھوں لوگوں کا رزق بن سکتے ہیں۔ کسی کو بہت ہی آئیڈیا سوجھتا ہے تو سفیدے کے بے فیض پودے لگوادیتا ہے جو زمین کے لیے نقصان دہ ہیں۔ بانجھ ایسے کہ کوئی پرندہ گھونسلا بنانا تو دور کی بات ہے اس کی

ٹہنی پر آکر بیٹھنا بھی پسند نہیں کرتا۔ جہاں کلر اٹھی زمین ہو، پانی سطح زمین پہ آنے کو مچلتا ہو یا شور ہو، وہاں تو اس کا لگایا جانا سمجھ میں آتا ہے۔ نہروں کے کنارے، سڑکوں کے کنارے اور اب موٹروے کے ساتھ ساتھ لگوانے اور کاشت کروانے والے بوجھ بجھکڑوں سے کوئی پوچھے کہ تم نے دنیا کی تاریخ کا مطالعہ کیوں نہ کیا۔ کاش برصغیر اور ایران کا احوال ہی پڑھا ہوتا۔ نوشیرواں کا عہد ہو یا یہاں شیر شاہ سوری کا، شاہراہوں کے کنارے پھلدار پودے ہی لگائے جاتے اور یہ بھی طے ہوتا تھا کہ پھل میں ایک حصہ پرندوں کا، ایک حصہ راہگیر مسافروں کا اور باقی حصہ لگانے والے مالک کاشتکاروں کا۔ نوشیرواں نے ایسے ہی کسی بزرگ بابے سے پوچھا تھا کہ بابا جی! آپ اس عمر میں پھلدار پودے لگا رہے ہیں جب کہ آپ جانتے ہیں کہ ان کا پھل آپ نہیں کھا سکو گے۔ شیخ سعدی نے کیا خوب جواب نقل کیا کہ بابا جی نے کہا کہ میرے دادا نے جو پھل دار پودے لگائے ان کا پھل میں نے کھایا۔ آج میں کاشت کروں گا تو ان کا پھل میرے پوتے اور نواسے کھائیں گے۔ ڈاکٹر صاحب کے گھر سے نکلے تو 3 بجنے والے تھے۔ میں اشتیاق سے گھروں اور ان کے صحنوں کو دیکھنے میں مصروف تھا۔ ہر گھر میں پھلدار پودے سر اٹھائے ہمیں دیکھ رہے تھے۔

ان چند گھنٹوں کی رفاقت نے ڈاکٹر صاحب سے محبت اور الفت کا ایک ان کہا رشتہ استوار کردیا۔ مین روڈ پر نکلنے لگے تو بٹ صاحب نے اچانک کہا ڈاکٹر صاحب یہ قصام کا بڑا ذکر سنا ہے۔ کیا یہ واقعی ہوتے ہیں۔ بڑا پراسرار سا تذکرہ سنا ہے ان کا۔ ڈاکٹر صاحب سے نیازی سے بولے آپ دن میں ذکر کرتے تو آپ کو بارڈر پر لے جاتا۔ یہاں سے چھ سات کلو میٹر دور ہے وہاں پہرے پر موجود قصام کو آپ سے ملوا بھی دیتے۔ اچانک انھوں نے ایک سڑک پر ناکہ لگائے کھڑے پولیس کے جوانوں کے پاس گاڑی روک دی۔ انھوں نے بڑی خوش دلی سے ایک دوسرے کا حال چال پوچھا۔ پھر ڈاکٹر صاحب نے ان سے اپنی تیز روانی والی عربی میں کچھ استفسار کیا اور گاڑی موڑ لی۔ کچھ دور جاکر انھوں نے آواز دی۔ چند لمحوں کے اندر کھڑ کھڑ کرتے فوجی یونیفارم میں ملبوس اسمارٹ اور خوب صورت لڑکوں نے ہمیں گھیر لیا۔ ڈاکٹر صاحب نے ہمارا تعارف کرایا۔ ان سے ملوایا کہ پاکستان سے آئے ہیں۔ بظاہر ناممکن سے لمحات تھے جو اچانک ہمارے سامنے مجسم ہوگئے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے۔

''قصام ہماری عزت، آزادی اور خودمختاری کے محافظ ہیں، بہادری اور جاں فروشی کا اظہار اور نشان ہیں اور انہی بے غرض نوجوانوں پر انحصار کرکے باقی لوگ آرام دہ نیند کے مزے لے رہے ہیں۔ جس قوم اور گروہ میں ایسے جواں مرد اور جاں فروش زیادہ ہوتے ہیں، وہی لمبی اور اچھی عمر پاتے ہیں۔''

غزہ سٹرپ سے واپسی

صبح ناشتے سے پہلے سعید صابر پروٹوکول افسر اور عبیداللہ فوٹو گرافر معہ گاڑی کے پہنچ گئے اور یوں ہمارے ٹوٹے رابطے پھر سے بحال ہوگئے۔ غزہ سے دونوں ڈاکٹر صاحبان کو بلواتے، ان کا سامان بندھواتے دن کے گیارہ بج گئے۔ جونہی گاڑی ان کو لیکر خان یونس ہسپتال کی پارکنگ میں پہنچی ہم سامان سمیت وہاں موجود تھے۔

مقامی اصحاب خاص طور پر ہسپتال سپرنٹنڈنٹ ڈاکٹر یوسف نے بڑی محبت سے رخصت کیا۔ آدھ

پون گھنٹے میں ہم رفح بارڈر پہنچ گئے۔ فلسطینی سائیڈ پر سارا کام چند لمحوں میں ہوگیا۔ ایک طرف سے عمارت میں داخل ہوئے اور دوسری طرف سے نکلے تو پاسپورٹس پر مہریں لگ چکی تھیں۔

سامنے بڑی بڑی کوچز کھڑی تھیں جو باری باری مصر کے حصے میں داخل ہورہی تھیں۔ ہمارا سامان اور ہمیں ایک کوچ میں ڈال کر میزبانوں نے گلے لگایا اور رخصت کردیا۔ خیال تھا اگلے دس پندرہ منٹ میں ہم مصر کے امیگریشن اور پاسپورٹ سیکشن میں ہوں گے مگر گاڑی کی باری اڑھائی گھنٹے بعد آئی۔ یہ وقت بوریت اور نیند کے چھوٹے چھوٹے جھونکوں اور جھٹکوں کے ساتھ گزرا۔ ہماری سیٹ کے ساتھ ایک فلسطینی اور اسکی غیر ملکی بیوی بیٹھی تھی۔ پتا چلا کہ برطانیہ سے تعلق ہے اور ان کی این جی او یہاں غیر موسمی سبزی اگانے کی تربیت دیتے ہیں اور ٹنل فارمنگ کے لیے درکار ضروری معلومات اور سہولتیں بہم پہنچانے آئے ہیں۔ خاتون مسلمان نہیں تھیں۔ کئی یورپی اور امریکی یورپی اپنے طور پہ چیرٹی (مدد) اور معلومات کے لیے این جی اوز بنا کر کام رہے ہیں۔ اتفاق سے ہماری بس عین اس جگہ کھڑی ہوگئی جہاں سے چند سال قبل فلسطینی عوام دیواریں گرا کر اور گیٹ توڑ کر مصر میں داخل ہوگئے تھے۔ اب ان کی مرمت ہوچکی تھی۔ دوران سفر کسی بھی وقت کچھ بھی ناگہانی طور پر ہوسکتا ہے جس کا کوئی تعلق منصوبہ بندی یا سوچے گئے (Assumed) حالات سے نہیں ہوتا، اب یہ کوچ والا مرحلہ ہی ربڑ ہوگیا، صبح 8 بجے ناشتہ کرنے سے اب تک کچھ کھایا نہیں گیا تھا۔ میں نے کوشش کرکے اپنا بیگ ڈھونڈا۔

اسکی جیبوں میں بسکٹس، چپس اور چاکلیٹس تھے۔ شوگر لیول کو سنبھالنے کے لیے اللہ کا نام لیکر پیکٹس باری باری کھلنے اور خالی ہونے لگے۔

کوچ نے جونہی مصری بارڈر کراس کیا، مزدور نما ٹرالی کھینچنے والوں نے گھیر لیا۔ ہم بلاوجہ ڈرے ہوئے تھے۔ ایک مزدور کے ہتھے چڑھ گئے حالانکہ کچھ دور بے شمار ٹرالیاں کھڑی تھیں۔ ایک تو میں اپنے لیے کھینچ لایا تھا۔ بہرحال سو پاؤنڈ کے نذرانے کے بعد ٹرالی اس کے حوالے کردی گئی۔ بلنڈنگ میں واش ہوئے تو وہاں تین چار سو لوگ پہلے ہی قطاروں میں بندھی ہوئی کرسیوں پہ بیٹھے اور جگہ جگہ کھڑے تھے۔ یہاں کام تقسیم کیے گئے۔ مجھے اور بٹ صاحب کو سامان کا پہرا دینا تھا۔ عمران غیور صاحب کو پاسپورٹ جمع کرانے تھے۔ صحاف صاحب نے نمازکی ادائی کے لیے جانا تھا۔ کافی دیر گزر گئی تو بٹ صاحب سے کہا آپ تھوڑی ہمت کریں اور اس مصری انٹیلی جنس آفیسر کے پاس جائیں جس کا آتے ہوئے ڈاکٹر خالد دیپ نے حوالہ دیا تھا اور اس کی وجہ سے سارے مراحل بہت برق رفتاری سے طے ہوگئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب سیدھے اس کے کمرے میں پہنچے اور کہا ہم واپس جارہے تھے سوچا آپ کے تعاون کا شکریہ ادا

> چھوٹی عمروں کے فوجی بکتر بند گاڑی پر اپنی ''سریاں'' نکالے، بندوقیں تانے یوں بیٹھے تھے کہ جیسے حملہ آور کہیں سڑک کنارے چھپے ہیں۔

کرتے جائیں، اب اس جملے کی شیرینی سے بچنا اتنا آسان نہیں ہے۔ بندہ دھڑام سے آن گرتا ہے۔ کہنے والے نے پورے اخلاص اور نیک نیتی سے کہا ہے تو بھی اور نیت میں مفاد کی خرابی نے جگہ بنا رکھی ہو تب بھی آفیسر نے فوری طور پر اپنے عملے کے ایک رکن کو کام پر لگایا۔ پتا چلا کہ جو ویزا ہم پاکستان سے لے کر آئے تھے وہ تو استعمال ہو چکا۔ اب یہاں نیا ویزا لینا پڑے گا۔ ڈیڑھ سو پاؤنڈ فی آدمی کی ٹکٹ لگی تو یہ مشکل مرحلہ آسان ہوگیا۔

سامان بہرحال نہ آتے ہوئے چیک ہوا نہ اب جاتے ہوئے۔ پاسپورٹس پر ضروری مہریں لگوا کر ہم سب جلدی میں باہر نکلے۔ عمارت سے گیٹ کے دروازے تک ٹرالی والے نے چھوڑا اور وہاں سے آگے ٹرالیوں والے مزدوروں، کار ڈرائیوروں، مزدوروں اور نوٹ بدلوانے والوں کے گروہ در گروہ حملہ کرنے کے لیے تیار کھڑے تھے۔ اسرائیلی نوٹ شینل گیٹ کے اندر تک کارآمد تھا۔ باہر پھر مصری پاؤنڈ کی حکمرانی ہے۔

جاتے ہوئے جب ہم مصری انٹیلی جنس آفیسر کے دفتر میں بیٹھے تھے تب برادر عبدالرحمٰن الردینی ہمارے ساتھ تھا۔ تعارف کے سارے مراحل سے بھی انھیں نے ہمیں گزارا۔ جو پاسپورٹس مختلف دفاتر اور افراد کے پاس مہریں لگوانے کے لیے گئے ہوئے تھے کہ اچانک دفتر میں تیز کھسر پھسر شروع ہوگئی۔ نوجوان آفیسر ٹیلی ویژن پر مصری صدر محمد مرسی کا ایک لائیو انٹرویو دیکھ رہا تھا جو الجزیرہ ٹی وی کا مشہور اینکر عامر جلیسی لے رہا تھا۔ یہ بہت ہی اہم انٹرویو تھا، مصری صدر کے امیج کو بنانے بگاڑنے اور تباہ کرنے کی قوت اس کے اندر پنہاں تھی۔ محمد مرسی نے عامر کے پوچھنے پر اسے ہر طرح کے سوال کرنے کی کھلی چھٹی اور اجازت دے ڈالی تھی جس کی توقع نہیں کی جارہی تھی۔ اسی دوران ایک عجیب وغریب واقعہ ہمارے ساتھ پیش آگیا جس کی توقع ہم بھی نہیں کررہے تھے۔

انٹیلی جنس آفیسر کا نائب، دو تین دفعہ جب اپنی کرسی سے اٹھ کر آیا اور باس کے کان میں کچھ کہنے لگا۔ اس کا لہجہ غصے اور ناراضی والا تھا۔ باس خاموش رہا مگر برادر الردینی نے فوراً اردو میں مجھ سے کہا وہ اپنے باس سے کہہ رہا ہے کہ مہمان آپ کی توہین کررہے ہیں۔ دیکھا تو سامنے بیٹھے ہوئے ایک بزرگ ڈاکٹر صاحب صوفے پر تقریباً نیم دراز تھے اور انھوں نے یوں پاؤں پر پاؤں رکھے ہوئے تھے جیسے آصف زرداری صاحب پیپلز پارٹی کی سنٹرل ایگزیکٹو کونسل میں پشاوری چپل پہن کر پاؤں پہ پاؤں رکھ کر بیٹھا کرتے تھے۔ تب مشہور تھا کہ پاؤں کا تلوا جس کی طرف کریں گے، ناہید خان جو تب بے نظیر کی سیکرٹری اور سارے معاملات کی انچارج ہوا کرتی تھیں، وزیراعظم کے طاقتور اور خودسر شوہر کے پاؤں کے اس اشارے کی روح کے مطابق ہی اس رکن سے مطلوبہ سلوک روا رکھنے کا اہتمام کرتیں اور کرواتیں۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ سعودی بادشاہ سے ملاقات کے دوران بھی پاکستانی وزیراعظم کے شوہر ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھے رہے جسے بہت بدتہذیبی گردانا جاتا ہے۔ یہ ان کی بھی بھرپور جوانی کا زمانہ تھا۔ کہیں برداشت کیا جاتا رہا اور کہیں سے سخت زبان میں ناپسندیدگی کا اظہار کیا گیا۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے گزارش کرکے فوراً پاؤں سے پاؤں اتروائے اور بتایا کہ سامنے یہ تذکرہ ہورہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے فوراً کہا ''او بھائی! میں تو صبح 4 بجے سے سفر کرتے کرتے

تھک چکا ہوں ۔میرے میں زرداری صاحب والی عادت نہیں ہے۔ بے ارادہ اور بے اختیاری میں پاؤں پر پاؤں آ گیا۔شکر ہے بدمزگی پیدا ہوئے بنا مسئلہ حل گیا۔الردعی نے کہا اس نائب نے اور بھی کئی لوگوں سے اس مبینہ بدتمیزی کا تذکرہ کیا تب ان باس نے کہا مجھے لگتا ہے ان کے کلچر میں پاؤں پر پاؤں رکھ کر بیٹھنے کو معیوب نہیں سمجھا جاتا ہوگا۔ کلچر کا فرق ہے ورنہ تو یہ بھلے لوگ ہیں، میری اِنسلٹ کیوں کریں گے۔ وہاں سے چائے پی کر اور پورا کام کروا کر جب ہم کمرے سے باہر نکلے تو خدا کا شکر ادا کیا کہ یہ مسئلہ حل ہوا۔ ورنہ وہاں تو سفارتی تعلّقات'' تک خراب ہونے پر آ گئے تھے۔ باہم طے کیا گیا کہ باقی دورے میں بہت احتیاط برتی جائے گی۔ احتیاط کا عملی مظاہرہ فلسطینی حصے میں جا کر اس وقت ہوا جب وی آئی پی لاؤنج میں بیٹھے قہوہ پی رہے تھے اچانک بٹ صاحب چلائے ''بزرگو! مرواؤ گے،'' دونوں بزرگ پاؤں پر پاؤں رکھ کر بیٹھے ہوئے تھے۔

اپنا اپنا سامان لیکر ہم پارکنگ ایریا میں آ گئے۔اب بٹ صاحب نے اپنی عربی کی مدد سے کسی عربی ڈرائیور کو قاہرہ چلنے کے لیے تیار کرنا تھا۔

یہ سفر جو ہم نے چار بار کیا، قریباً 3 ہزار پاؤنڈ فی چکر میں طے ہوتا رہا تھا۔ ابھی اسی کشمکش میں تھے کہ اپنے پرانے ڈرائیور سے رابطہ ہوگیا۔وہ عمارت کے اندر گاڑی سمیت موجود تھا۔ اب ہم چاروں دوبارہ اپنا اپنا سامان اٹھائے اندر پہنچے۔ گاڑی میں سامان رکھ چکے تو مقامی انٹیلی جنس آفیسر نے گاڑی کو بارڈر گیٹ کراس کرنے کی اجازت دینے سے صاف منع کردیا۔ یہ مسئلہ اپنی نوعیت کا حساس اور شدید پریشانی کا باعث تھا۔ مذاکرات ہوئے، ڈرائیور نے چیخ پکار کی۔ یہاں ڈرائیور چھوڑ عام آدمی بھی گفتگو میں اس قدر لاؤڈ (Loud) ہوتا ہے کہ سننے والا یہی سمجھتا ہے کہ لڑ رہا ہے۔

انٹیلی جنس آفیسر نے بتایا کہ سرکاری طور پر وفد کی حفاظت کا حکم آیا ہے۔ ایک بکتر بند گاڑی آپ کو العریش شہر تک چھوڑ کر آئے گی۔ آپ نے راستے میں نہ رکنا ہے نہ الگ ہونا ہے۔ یہاں سے ہم ایک کاروان بنا کر بھجوا رہے ہیں۔ صحرا میں ہوئے کچھ واقعات کے سبب یہ احتیاطی تدابیر کی گئی تھیں۔ کچھ دیر بعد قافلہ روانہ ہوا چھوٹی چھوٹی عمروں کے فوجی بکتر بند گاڑی پر اپنی ''سریاں'' نکالے، بندوقیں تانے یوں بیٹھے تھے کہ جیسے حملہ آور کہیں سڑک کنارے چھپے ہیں۔ خدا کا کرم یہ ہوا کہ ساحلی شہر العریش تک بالکل خیر خیریت سے پہنچ گئے۔

یہاں بکتر بند گاڑی رک گئی اور ہم اپنے رسک پر قاہرہ روانہ ہوگئے جہاں آنے والے دنوں میں ایک کانفرنس، صلاح الدین ایوبی کا قلعہ، حیران کر دینے والا اظہر پارک، دریائے نیل کے کنارے ہونے والے واقعات اور دنیا کے سب سے بڑے عجائب خانے کے رہائشی فرعون اور ان کی ممیاں ہماری منتظر تھیں۔ آخر وہاں کچھ تو ایسا ہے کہ لوگ مصر جانے کے لیے موقع ملتے ہی پابہ رکاب ہوجاتے ہیں۔ہم حیرت زدہ کرنے والی اسرار کی اس دنیا میں پھر تین دن کے لیے واپس پہنچ گئے تھے۔

(باقی آئندہ)

شکاریات

الاسکا کا بھالو

پہاڑوں کے بادشاہ کا سنسنی خیز ماجرا

وہ خوف زدہ ہوکر بھاگا نہیں بلکہ حملہ آور ہوگیا تھا صرف تین قدم کا فاصلہ تھا، برف اس کے خون سے سرخ ہورہی تھی اور وہ مسلسل بڑھا آرہا تھا

مترجم: صبا شفیق

میرا نام جم ہے اور میں ایک عرصہ سے الاسکا کے برفانی علاقے میں آنے والے شکاریوں کی مدد اور رہنمائی کا کام کر رہا ہوں۔ اپنے وسیع تجربے سے میں نے یہ سیکھا ہے کہ ہر شکار دوسرے شکار سے مختلف ہوتا ہے اور شکار کے دوران یہ سوچنا کہ جیسا آپ نے منصوبہ بندی کی ہے ویسا ہی ہوگا، سب آپ کی سوچ کے مطابق چلے گا، ایک بہت بڑی غلطی ہے ۔کیونکہ ہر شکار آپ کو حیران کرسکتا ہے اور آپ اپنی جان سے بھی ہاتھ دھو سکتے ہیں۔ ایسا ہی ایک شکار الاسکا کے بھورے بھالو کا ہے۔ اس بھالو کو تو میں کبھی بھی نہیں بھول سکتا جو اپنے پہاڑوں کا صحیح معنوں میں بادشاہ تھا اور ہمیں اپنے علاقے میں دیکھ کر وہ بزدلوں کی طرح پیٹھ دکھا کر بھاگا نہیں تھا بلکہ ہم پر حملہ آور ہوگیا تھا۔

جم بہت ماہر شکاری تھا اور ڈنمارک سے امریکا اور پھر الاسکا آیا تھا، خصوصاً الاسکا کے بھورے بھالو کے شکار کے لیے۔ میں جب اس سے ملا تو بے حد متاثر ہوا اور خوشی تو مجھے ہمیشہ ہی شکاریوں سے مل کر ہوتی تھی جو اپنے شوق کے لیے یہاں آتے تھے۔ ان کا جوش اور شوق ہمیشہ ہی دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ الاسکا میں شکار کرنا بے حد مشکل ہے۔ بہادر، ہمت والے، صبر والے اور موسم کی سختی کو سہنے والے ہی یہاں شکار کر سکتے ہیں، کیونکہ اس برفانی علاقے کا درجہ حرارت اکثر اوقات نقطۂ انجماد سے نیچے ہی رہتا ہے۔ مگر اب شکاریوں کے لیے دستیاب گرم خیموں اور چولہوں نے شکار میں کافی

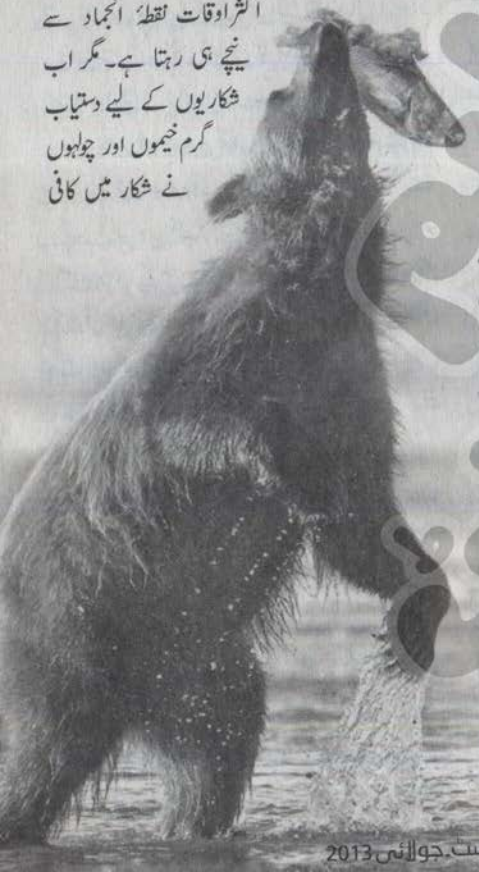

آسانیاں پیدا کر دی ہیں، ورنہ پہلے اکثر شکاری الاسکا میں رات گزارنے کے بجائے ناکام لوٹ جانا ہی بہتر سمجھتے تھے۔

میں علاقے سے اچھی طرح واقف تھا مگر پھر بھی میں یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ فلاں مقام پر بھالو ضرور ملے گا۔ سو میں، جیمر اور آٹو جو کہ ہمارا قلی اور باورچی تھا، الاسکا کے برفانی جنگل کی طرف بڑھے۔ آٹو ہمارا سامان اٹھانے کے ساتھ ساتھ مختلف جگہوں پر خیمہ لگانے اور کھانا بنانے کے لیے ہمارے ساتھ چل رہا تھا۔ ہم نے اپنا پہلا کیمپ جس جگہ لگایا وہاں دیودار کے درختوں اور منجمد جھیلوں کا سلسلہ 20 میل تک پھیلا ہوا تھا۔ پہاڑوں سے گھرا یہ مقام بے حد پُرسکون اور خوبصورت تھا۔ ہم نے خیمے لگائے اور دائیں طرف موجود ایک برفانی چٹانی سلسلے پر چڑھنے لگے۔ کچھ دیر تک چٹانوں پر چڑھنے کے بعد ہمیں بھالو کے تازہ قدموں کے نشان نظر آئے۔ ہم پُرجوش ہو گئے اور آگے بڑھنے لگے مگر کافی چڑھائی کے بعد بھی ہمیں کوئی بھالو نظر نہ آیا تو ہم نے خیموں میں واپسی کا ارادہ کیا۔ کیونکہ برفانی چوٹیوں سے گھری اس وادی میں اب شام اتر رہی تھی۔

الاسکا میں بہار کا غروب آفتاب کا منظر ایسا دلفریب ہوتا ہے کہ کوئی مصور وہاں ہو تو اس کا برش خود بہ خود تصویر بنا ڈالے اور کوئی شاعر وہاں ہو تو اس کے ذہن رسا سے شعر موزوں ہونے لگیں۔ ہلکی سنہری دھوپ تمام چوٹیوں کو سونے کا بنا دیتی ہے اور پھر دھیرے دھیرے کاسنی پردے میں ڈھل جاتی ہے۔ مئی میں سورج شام کو تقریباً 10 بجے غروب ہوتا ہے اور آدھی رات کے قریب پوری طرح تاریکی پھیل جاتی ہے۔ بہار کے موسم کی رات بھی یہاں بہت دلفریب ہوتی ہے۔ آسمان صاف رہتا ہے اور ان گنت تارے آسمان پر جگمگ جگمگ کرتے رہتے ہیں۔ شکار کے لیے اس سے بہترین صورت حال الاسکا میں اور کوئی نہیں ہو سکتی۔

شام ہو گئی تو ہم چوٹی سے اتر کر اپنے خیموں میں آ گئے آٹو نے ہمارے لیے لذیذ کھانا تیار کر رکھا تھا اور خیموں میں آرام دہ بستر بھی ہمارے منتظر تھے۔ مگر کھانے کے بعد ہم ایک دوسرے سے باتیں کرنے بیٹھے تو ایک دوسرے سے مزید واقفیت ہوئی۔ مجھے پتا چلا کہ جیمر ڈنمارک کے ایک شکاری رسالے کا مدیر ہے۔ خود بھی دنیا کے 33 سے زائد ممالک میں بے شمار مختلف جانوروں کا شکار کر چکا ہے۔ اس نے شکاریات پر کتابیں بھی لکھ رکھی تھیں۔ یہاں آنے والے شکاری ہمیشہ اپنی بہادری اور مہارت کی داستانیں سناتے ہیں۔ مگر جیمر واقعی ایک منجھا ہوا تجربہ کار شکاری تھا۔ وہ افریقہ میں ہاتھی اور جنگلی بھینسے کا شکار بھی کر چکا تھا۔ دو بار وہ شیر کے شکار کے لیے بھی افریقہ گیا تھا مگر قسمت نے اس کا ساتھ نہیں دیا اور اب وہ یہاں الاسکا کے بھورے بھالو کے شکار کے لیے آیا تھا۔ مجھے امید تھی کہ میں اسے درست رہنمائی اور معاونت فراہم کر کے کامیابی سے ہمکنار کراؤں گا واپسی پر اس کے پاس اپنی زندگی اور اپنے رسالے کے لیے بھورے بھالو کے شکار کی ایک ناقابل فراموش داستان ہوگی۔

بھورے بھالو کا شکار اکثر بہت مشکل ثابت ہوتا ہے۔ خصوصاً الاسکا کے بھالو تو اس قدر چالاک ہو چکے ہیں کہ وہ شکاری کو پہچان لیتے ہیں اور اس کا ارادہ پڑھ لیتے ہیں اور اکثر اوقات شکاری پر حملہ کر دیتے ہیں۔

اکثر اناڑی شکاری بھالو کو دیکھ کر گھبرا جاتے ہیں اور ضبط اور برداشت کا سبق بھول کر ٹھیک سے نشانہ باندھے بغیر بندوق چلا دیتے ہیں۔ ایسا نشانہ کبھی ٹھیک نہیں لگتا اور بھالو غضب ناک ہو کر شکاری پر چڑھ دوڑتا ہے۔ یہاں آنے والے کئی شکاری یہ غلطی کرتے ہیں اور پھر مجھے ہی بھالو کو گولی مار کر ان کی جان بچانی پڑتی ہے۔ مگر مجھے امید تھی جیمر جیسا ماہر شکاری پرسکون ہو کر شکار کرے گا اور کوئی غلطی نہیں کرے گا۔

اگلی صبح بھی موسم خاصا دلفریب تھا۔ برفانی چوٹیوں سے گھری اس وادی کے سکوت نے ہمیں مدہوش کر دیا تھا۔ آج ہمارا ارادہ چٹانوں کی پچھلی جانب جانے کا تھا جہاں کچھ غار تھے۔ ہمیں امید تھی کہ ہمیں وہاں کوئی بھالو ضرور ملے گا۔ اور کچھ ہی دیر بعد واقعی ہمیں ایک غار کے سامنے بھالو اپنے تازہ شکار سے پیٹ بھرتا نظر آیا۔ ہم نے دوربین لگا کر اسے قریب سے دیکھنا چاہا تو جانے کیسے اس نے ہماری آہٹ پا لی اور ایک دم غائب ہو گیا۔ ہم قریب ہی جھاڑیوں میں چھپ کر بھالو کے واپس آنے کا انتظار کرنے لگے۔ صبح سے دوپہر ہو گئی مگر بھالو واپس نہیں آیا۔ الاسکا میں بھالو اکثر پہاڑوں سے اتر کر نیچے وادی میں چلے جاتے ہیں۔ مگر اس کا شکار چونکہ یہاں موجود تھا اس لیے ہمیں امید تھی کہ وہ ضرور واپس آئے گا۔ گرمی بڑھ رہی تھی کیونکہ سورج سر پر آ گیا تھا۔ ہم شام تک وہیں بیٹھے رہے مگر بھالو لوٹ کر نہ آیا۔ اگلے دو دن بھی ہم اس جگہ جا کر جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھے رہے کہ شاید بھالو لوٹ آئے مگر وہ نہیں آیا۔ اس دوران ہم نے کئی نر اور مادہ برفانی سؤر دیکھے۔ چند چھوٹے برفانی بھورے ریچھ بھی اٹھکیلیاں کرتے اور برف سے پھسلتے ہوئے ہماری نظروں میں آئے۔ مگر جیمر کو چھوٹے بھالو کا شکار پسند نہیں تھا۔ اس کی تمنا ایک بڑے اور شاندار بھالو کو شکار کرنے کی تھی۔

اگلے روز میرا دوست ملر بھی ہمارا ساتھ دینے کے لیے آ گیا۔ اس نے کہا کہ ہمیں زیادہ بلندی پر جانا چاہیے۔ سو ہم نے اپنے خیمے سمیٹے اور برف پوش چوٹیوں کی آغوش میں جا پہنچے۔ یہاں پہنچتے پہنچتے ہمیں شام ہو گئی تھی۔ سو آٹو کیمپ لگانے لگا اور ہم اردگرد کا جائزہ لینے لگے۔ اچانک جیمر کی نظر اوپر پڑی۔ ایک بڑا بھورا بھالو ہمارے خیموں کے عین اوپر ڈھلوانوں سے نیچے اتر رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ہمارے خیموں کی طرف ہی آ رہا ہے۔ ہم پُرجوش ہو گئے کہ شکار خود ہماری طرف آ رہا ہے۔ یہ کافی بڑا بھالو تھا۔ ہم نے اپنی دوربینیں آنکھوں سے لگا لیں اور بھالو کا جائزہ لینے لگے۔ خیمے کی جانب اترتے اترتے اس نے اچانک راستہ بدلا اور مخالف سمت میں ایک چوٹی پر چڑھنے لگا۔ ہمیں تو یہ ایک ناممکن چڑھائی لگ رہی تھی مگر وہ ایک ماہر کوہ پیما کی طرح برف میں راستہ بناتا اوپر چڑھتا چلا جا رہا تھا۔ ہم آنکھوں میں حیرانی لیے اسے دیکھتے رہ گئے اور وہ چوٹی کے دوسری جانب پہاڑوں میں غائب ہو گیا۔ وہ الاسکا کا باسی تھا اور اس کا روزانہ کا معمول تھا برف زاروں پر چڑھنا اور اترنا مگر ہم پھر بھی اس کی مہارت کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکے۔

اگلی صبح ہم جلدی بیدار ہو گئے اور آٹو کے بنائے ہوئے لذیذ ناشتے کے بعد ہم نے ان غاروں کی طرف رختِ سفر باندھا جو ملر نے دیکھ رکھی تھیں۔ بہار کے اوائل کا یہ ٹھنڈا ٹھنڈا دن تھا مگر غار تک پہنچتے پہنچتے دن پورا چڑھ آیا اور درجۂ حرارت بڑھنے لگا۔ تھوڑی

دور چلنے کے بعد ہم نے ایک بھالو دیکھا جو بہت دور ایک چوٹی پر درخت سے پتے کھا رہا تھا۔ الاسکا کے یہ بھالو گوشت خور ہونے کے ساتھ ساتھ سبزی خور بھی ہوتے ہیں۔ شکار نہ ملے تو درختوں کے پتوں پر بھی گزارہ کر لیتے ہیں۔ وہ بھالو بھی شاید بھوکا تھا اور ہرن کی مانند ادھر سے ادھر چر رہا تھا۔ وہ ہم سے بہت دور تھا اس لیے اس کا نشانہ لینا ہی بے کار تھا۔ سو ہم نے غاروں کی جانب سفر جاری رکھا۔ جب ہم اس علاقے میں پہنچ گئے تو ہم نے اپنی رفتار دھیمی کر دی اور پھونک پھونک کر قدم رکھنے لگے اور پھر جب ہم ایک چٹان کی پچھلی جانب سے سامنے کی طرف آئے تو اس کے عین سامنے ایک غار کے دہانے پر ایک بھالو بیٹھا اپنے تازہ شکار سے شکم پُری کر رہا تھا۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ چٹان کے ساتھ ہی گھنی جھاڑیاں تھیں۔ ہم ان میں چھپ کر آگے بڑھنے لگے ہم گھٹنوں کے بل رینگ رہے تھے۔ مگر اچانک ہوا کا رخ تبدیل ہو گیا اور بھالو کی تیز ناک نے ہماری بُو پالی۔ وہ پلک جھپکنے میں شکار کو چھوڑ کر غار کے پچھلی جانب ایک بڑی برفانی ڈھلوان کے پیچھے غائب ہو گیا۔ یہ ایک بہت بڑا بھالو تھا۔ بالکل ویسا ہی جس کا شکار کرنے کی تمنا جیمز کو ڈنمارک سے الاسکا لائی تھی۔

ہم نے اسے ڈرا دیا تھا۔ مگر ہم جانتے تھے کہ وہ اپنے شکار پر دوبارہ واپس ضرور آئے گا۔ ہم نے غار کے اردگرد کے علاقے کا جائزہ لیا۔ غار کے شمال میں ایک بڑا میدان تھا جس میں کچھ فاصلے پر بید کے درختوں کے جھنڈ تھے۔ باقی طرف چٹانیں تھیں اور کہیں کہیں جھاڑیاں بھی تھیں۔ نیچے کی طرف جاتی ایک چٹان کے کناروں پر خاصی گھنی جھاڑیاں تھیں۔ بھالو کے لیے گھات لگا کر بیٹھنے کے لیے یہ جگہ بہترین تھی۔ یہ جگہ مناسب نشانے کی حد سے ذرا دور تھی مگر اس کا فائدہ یہ تھا کہ بھالو اگر بھاگ جاتا تو ہم بھاگتے بھالو پر ایک نہیں کئی بار گولی چلا سکتے تھے۔ کیونکہ یہ ایک ایسا مقام تھا کہ وہ اچانک نظروں سے اوجھل نہیں ہو سکتا تھا۔

ہم نے وہاں چھپ کر کچھ دیر بھالو کا انتظار کیا مگر جب شام ہونے لگی تو ہم اپنے خیموں کی طرف چل دیئے۔ آٹو نے آج پھر ہمارے لیے ایک شاندار اور مزیدار ڈنر تیار کر رکھا تھا۔ کھانے کے بعد میں نے جیمز اور ملر کے ساتھ مل کر اگلے دن کی منصوبہ بندی کی اور آج کی سرگرمیوں پر پوری طرح غور کیا اور پھر باہمی مشاورت سے ہم نے فیصلہ کیا کہ کل بھی ہم اسی جگہ گھات لگا کر بیٹھیں گے۔ کیونکہ وہاں سے ہم ایک بڑے علاقے پر نظر رکھ سکتے تھے۔

اگلی صبح ہم اپنی مطلوبہ جگہ پر پہنچے۔ بھالو کا کوئی نشان نہیں تھا اور شکار بھی ویسے ہی پڑا تھا۔ یعنی وہ رات کو بھی نہیں لوٹا تھا۔ آسمان صاف تھا، ہوا ہلکی تھی اور درجہ حرارت معتدل تھا۔ ہم تمام دن وہاں چھپ کر انتظار کرتے رہے، مگر بھالو نہیں آیا۔ ہمارا جوش ماند پڑنے لگا۔ پھر جیمز اٹھا اور چٹانوں پر چڑھ کر اردگرد کا جائزہ لینے لگا۔ اس نے تقریباً پندرہ بار اردگرد کا جائزہ لیا اور پھر تھک کر بیٹھ گیا۔ شام ہو رہی تھی جب بھالو ہمیں غار کی طرف آتا دکھائی دیا۔ جیمز نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پر رکھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ وہ کہنے لگا ''یہ یہاں پہاڑوں پر چڑھنے اترنے سے بے قابو نہیں ہوا بلکہ یہ تو اس بھورے بھالو کو دیکھ کر جوش سے بے قابو ہو گیا ہے۔'' میں مسکرایا دیا کیونکہ میں جانتا تھا کہ یہ سچ

ہے۔ جیمز ایک مضبوط اور تنومند جسم کا مالک شکاری تھا جس نے افریقہ میں ان گنت شکار کیے تھے۔ وہ اتنی جلد تھکنے والا نہیں تھا۔

ہم نے بھالو کا دوربین سے جائزہ لیا تو وہ غار کے دہانے پر بیٹھا اپنا شکار کھا رہا تھا۔ ہم نشانہ لینے لگے مگر جیمز کا کہنا تھا کہ ایک تو فاصلہ بہت ہے، دوسرا راستے میں گھنی جھاڑیاں حائل ہو رہی ہیں۔ سو ہم نے آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا اور منجمد برف پر رینگتے ہوئے جھاڑیوں کے اگلے جھنڈ کی طرف بڑھنے لگے۔ ہمارا خیال تھا کہ بھالو اپنا شکار کھانے میں مگن ہے۔ مگر ہماری توقع کے برعکس ہوا تھا۔ اس نے ہماری آہٹ یا بُو پالی تھی اور ہمارا ارادہ بھی بھانپ لیا تھا۔ جس قدر خاموشی سے ہم اس کی طرف بڑھ رہے تھے اسی قدر خاموشی سے وہ جھاڑیوں سے ہماری طرف بڑھنے لگا۔ ہم چونکہ برف پر گھٹنوں کے بل رینگ رہے تھے اس لیے اس بات سے بے خبر رہے کہ بھالو شکار کو چھوڑ کر ہمارے سر پر آپہنچا ہے۔ جھاڑیوں کا جھنڈ ہم سے صرف بیس قدم دور رہ گیا تھا جب ہم نے غرانے کی آواز نہایت قریب سے سنی۔ میں نے اور جیمز نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور اپنی رائفلیں تھام کر یکدم کھڑے ہو گئے اور جو ہم نے دیکھا وہ ناقابل یقین تھا۔ جیمز کی جگہ کوئی اناڑی شکاری ہوتا تو شاید اس کے اوسان ہی خطا ہو جاتے۔ ہم سے صرف بارہ قدم دور اپنی چاروں ٹانگوں پر بھاگتا ہوا بھالو ہم پر حملہ کرنے کو دوڑا آ رہا تھا۔ جیمز نے رائفل سیدھی کی اور جلدی سے گولی چلا دی مگر گولی نشانے پر نہیں لگی۔ ہم الٹے قدموں پیچھے کی طرف بھاگنے لگے مگر اس دوران میں، میں بھالو کا نشانہ لے چکا تھا۔ میں نے گولی چلا دی مگر وہ گولی بھی بالکل نشانے پر نہ لگی اور اس کا بازو زخمی کرتی نکل گئی۔ بھالو ایک لمحے کو رکا پھر غضب ناک ہو کر ہماری طرف جھپٹا۔ اس کے اور ہمارے درمیان صرف تین قدم کا فاصلہ تھا جب ملر کی گولی اس کی گردن پر لگی۔ گولی لگنے کے بعد وہ اچانک مڑا اور پہاڑی سے نیچے اترنا شروع کر دیا۔ وہ بے حد جاندار تھا، اب ضروری ہو گیا تھا کہ اس کے سر کا نشانہ لیا جائے۔ مگر وہ نہایت تیزی سے برف کی ڈھلوانوں سے اتر رہا تھا۔ اس کی گردن سے نکلتا خون برف کو رنگین کر رہا تھا۔ مگر وہ رک نہیں رہا تھا اور پھر جیمز نے بھاگتے ہوئے بھالو پر گولی چلا دی، گولی سیدھی اس کے سر میں لگی اور وہ دھم سے جھاڑیوں کے جھنڈ میں گر گیا۔ اس کی برق رفتاری کا یہ عالم تھا کہ وہ پلک جھپکنے میں ہم سے پندرہ فٹ دور چلا گیا تھا، جب جیمز کی گولی نے اس کو بے دم کر دیا۔ ہم نہایت احتیاط سے جھاڑیوں کے جھنڈ کی طرف بڑھنے لگے۔ وہ جھاڑیوں میں چت لیٹا تھا۔ اس کے سر اور گردن سے خون تیزی سے نکل رہا تھا۔ جیمز نے رائفل کی نال سے اسے ہلایا تو اس کی ایک طرف ڈھلکی گردن دیکھنے پر جیمز کو یقین ہوا کہ وہ واقعی مر چکا تھا۔

قریب سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ اس کی عمر تقریباً بیس سال تھی۔ اس کے پنجے اور کھال بے داغ تھی۔ البتہ دایاں جبڑا اور آنکھ شاید کسی شکار کے دوران یا کسی دوسرے بھالو سے لڑائی کے دوران خراب ہو چکے تھے۔ اس کا قد نو فٹ چار انچ تھا۔ وہ ایک نہایت شاندار بھالو تھا۔ جیمز بہت خوش تھا وہ جس ٹرافی کے لیے یہاں آیا تھا وہ اسے مل گئی تھی۔ ■■■

خواہشوں کے بے آباد قصبے

خواہشوں کے آگے بند نہ باندھنا بے سکونی کا باعث کیوں بنتا ہے

رخسانہ بشیر

اشفاق احمد نے ایک بار کہا تھا کہ ”ہمارے اور خواہش کے درمیان ایک عجیب طرح کا رشتہ ہے جسے بابا بدھا یہ کہتا ہے کہ جب تک خواہش اندر سے نہیں نکلے گی (چاہے اچھی ہی کیوں نہ ہو) اس وقت تک دل بے چین رہے گا۔ جب انسان خواہش کو ڈھیلا چھوڑ دے گا اور کہے گا کہ جو بھی راستہ ہے، جو بھی طے کیا گیا ہے میں اس کی طرف چلا جاؤں گا، چاہے ایسی خواہش ہی کیوں نہ ہو کہ میں ایک اچھا رائٹر یا پینٹر بن جاؤں یا میں ایک اچھا ”اچھا“ بن جاؤں۔ جب انسان خواہش کی شدت کو ڈھیلا چھوڑ کر بغیر کوئی اعلان کئے، بغیر خط کشیدہ کئے یا لائن کھینچے چلتا جائے تو پھر آسانی ملے گی۔ آپ نے کبھی سوچا..... کہ یہ خواہش ہے کیا؟ خواہشات کب زندگی کو کٹھن بنانے لگتی ہیں؟ خواہش کو ڈھیلا کیسے چھوڑا جاسکتا ہے؟؟؟ آئیے ان سوالوں کا جواب کھوجنے کی کوشش کرتے ہیں۔

صاحبو! جہاں دل ہے وہاں خواہش ہے، تمنا ہے، آرزو ہے، ارمان ہے۔

ہزاروں خواہشیں دل کے نہاں خانوں میں ہوتی ہیں

یہ بے آباد قصبے بھی کہاں ویران رہتے ہیں

آپ ساری دنیا گھوم لیں، کوئی شخص ایسا نہیں ملے گا جس کے دل کی بستی مختلف خواہشوں سے آباد نہ ہو۔ خواہشات انسان کو جینا سکھاتی ہیں، آگے بڑھنے کا ہنر عطا کرتی ہیں، آنکھوں میں اُمید بن کر جگمگاتی ہیں، ہونٹوں پر مسکراہٹ کے پھول کھلاتی ہیں، چہرے سے عزم بن کر جھلکتی ہیں۔ دلوں کو جوڑنا سکھاتی ہیں لیکن یہی خواہشات اگر پوری نہ ہوں تو انسان کو اندر سے توڑ پھوڑ ڈالتی ہیں۔ اور اگر حد سے تجاوز کر جائیں تو زندگی کو بے سکون کر دیتی ہیں۔

خواہشات کئی طرح کی ہوتی ہیں

پوری ہو جانے والی خواہش

ناممکن خواہش۔ ”جیسے انوکھا لاڈلا کھیلن کو مانگے چاند“

یا ”کیسی خواہش ہے کہ مٹھی میں سمندر ہوتا۔“

ادھوری رہ جانے والی خواہش۔ مثلاً آپ پی ایچ ڈی کرنا چاہتے تھے لیکن صرف ایم اے کر پائے۔

متبادل خواہش، آپ بنگلہ، مرسیڈیز خریدنا چاہتے ہیں لیکن بااسرِ مجبوری بڑنے منفی خواہش۔ دوسروں کو گرا کر آگے بڑھنے کی خواہش، دوسروں کو کسی نہ کسی صورت ضرر پہنچانے کی آرزو۔

مثبت خواہشیں۔ یہ زندگی کا حسن ہیں، ان کا تعلق اپنی ذات سے بھی ہوسکتا ہے اور دوسروں کی ذات سے بھی۔ اپنی خواہشات کی بدولت انسان زندگی میں آگے بڑھتا، کامیابیاں سمیٹتا اور دوسروں کو نفع پہنچاتا ہے۔

ہر انسان کی زندگی کی کوئی سب سے بڑی خواہش یا آرزو ہوتی ہے جو اسکی سوچ، ایمان کے درجے اور حالات و واقعات کے تحت ہوتی ہے۔ جیسے اعلیٰ تعلیم، بہترین ملاقات، اپنے اور بچوں کے بہترین مستقبل، آسائشات وتعیّشاتِ زندگی کے حصول، خدمتِ خلق، خاتمہ باالایمان یا جنت میں جانے کی خواہش۔ میرے خیال میں اچھی خواہش کی انتہا اللہ کا ہمہ وقت دیدار ہے جیسا کہ حضرت معروف کرخیؒ کو ان کے وصال کے بعد کسی نے خواب میں دیکھا کہ وہ مسلسل حق تعالیٰ کے دیدار میں مشغول ہیں کیونکہ وہ دنیا میں جو بھی نیک عمل کرتے تھے اس کے عوض رب تعالیٰ سے اس کا دیدار طلب کرتے تھے۔

شعور کی سیڑھی پر پہلا قدم رکھتے ہی خواہشوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو آخری سانس تک ساتھ چلتا ہے۔ انسان زندگی کے سفر میں جوں جوں آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ خواہشات کی بستی گنجان ہوتی جاتی ہے۔ ایک خواہش پوری ہوتی ہے تو فوراً اس کی جگہ دوسری خواہش لے لیتی ہے۔ انسان زندگی کا سفر آسان سے آسان تر اور بہتر سے بہترین تر بنانے کے لئے شب و روز محنت کرتا اور اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتا ہے۔ ابتدا میں کم از کم اس کی بنیادی ضروریات زندگی کے سفر میں جوں جوں آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ خواہشات کی بستی گنجان ہوتی جاتی ہے۔ ایک خواہش پوری ہوتی ہے تو فوراً اس کی جگہ دوسری خواہش لے لیتی ہے۔ انسان زندگی کا سفر آسان سے آسان تر اور بہتر سے بہترین تر بنانے کے لئے شب و روز محنت کرتا اور اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتا ہے۔ ابتداء میں وہ چاہتا ہے کہ کم از کم اس کی بنیادی ضروریات ہی پوری

ہو جائیں۔ جب اس کی یہ خواہش پوری ہو جاتی ہے تو وہ آسائشات اور پھر بتدریج تعیشات کے حصول کی خواہش دل میں پالنے لگتا ہے۔

کچھ لوگوں کی تمناؤں کا محور ساری زندگی ان کی اپنی ہی ذات رہتی ہے۔ ان کی ہر سوچ اور خواہش ''مَیں'' سے شروع ہو کر ''مَیں'' پر ہی ختم ہو جاتی ہے یہ عموماً دنیا دار لوگ ہوتے ہیں اور ان کے نزدیک اس زندگی سے آگے کسی اور زندگی کا تصور کم ہی پایا جاتا ہے۔ لیکن اسی معاشرے میں ایسے شاہ صاحب بھی ہیں جو ''اپنی خواہشات، آرزوؤں، آرام اور ضروریات کو دوسروں کی خواہشات، آرزوؤں آرام اور ضروریات پر قربان کر دیتے ہیں۔'' یہ وہی لوگ ہوتے ہیں جو دوسروں میں آسانیاں بانٹنے کی نہ صرف خواہش رکھتے ہیں بلکہ عمر بھر اس خواہش کی تکمیل کے لئے مصروفِ عمل رہتے ہیں۔

جہاں خواہش ہو وہاں حسرت نہ ہو، یہ ممکن ہی نہیں کیونکہ زندگی میں سب کچھ مل تو نہیں جاتا۔ بہت سی خواہشات ادھوری اور نا تمام رہ جاتی ہیں۔ اور کبھی یوں بھی ہوتا ھے کہ ہزار کوشش کے باوجود خواہش کو حسرت بننے سے نہیں روکا جاسکتا۔ کچھ خواہشوں کے مقدر میں حسرت بننا ہی لکھا ہوتا ہے۔ انسان عمر بھر کسی شے کی جستجو کرتا ھے، منزل سے چند قدم کے فاصلے پر ہوتا ہے کہ اچانک حالات ایسے رخ اختیار کرتے ہیں کہ ''ہنوز دلی دور است'' والا محاورہ شد و مد سے یاد آنے لگتا ہے۔

؎ قسمت کی خوبی دیکھئے ٹوٹی کہاں کمند
دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا

لیکن کچھ سر پھرے لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو منزل کے قریب پہنچ کر کسی اور سمت کے راہی بننے کی

خواہش کرتے ہیں تا کہ جستجو کا سفر جاری رہ سکے، منزل پالینے کا احساس انھیں سرشار کرنے کی بجائے یوں بے چین کرتا ہے کہ وہ بے اختیار کہہ اُٹھتے ہیں۔

؎ اے رہبرِ کامل چلنے کو تیار تو ہوں پر یا در ہے

کسی بھی شے کی خواہش کرنا بُرا نہیں لیکن خواہشات کا حد سے بڑھ جانا بے سکونی اور بے چینی کو جنم دیتا ہے نا آسودہ خواہشیں کچوکے لگاتی اور نا اُمیدی میں مبتلا کرتی ہیں۔ ایسے میں انسان کو زندگی سے، حالات سے اور لوگوں سے گلہ رہنے لگتا ہے اور منفی سوچیں اس کے ذہن کو یوں جکڑ لیتی ہیں کہ

؎ سب کو خوشیاں مل جاتی ہیں، میرا حصہ کھو جاتا ہے

آپ نے اکثر لوگوں کو کہتے سنا ہوگا کہ بن مانگے بہت کچھ ملا لیکن عجیب بات ہے کہ زندگی میں جب بھی کسی شے کی شدت سے آرزو کی وہ شے دور ہوتی چلی گئی..... یہ بات سچ ہے کہ جب ہم خواہشوں کے پیچھے اندھا دھند بھاگتے ہیں تو خواہشیں ہم سے آگے بھاگنے لگتی ہیں۔ جس چیز کو حاصل کرنے کے لئے ہم بہت زور لگاتے ہیں وہ چیز ہمیں اپنے ہاتھوں سے نکلتی دکھائی دیتی ہے اور اکثر اوقات ہمیں نارسائی کا دکھ سہنا پڑتا ہے۔ آپ نے کبھی غور کیا اس میں ایک بہت بڑا نکتہ پوشیدہ ہوتا ہے۔ جی ہاں! ہم اپنی خواہشات کو ڈھیلا نہیں چھوڑتے..... اس کو یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ ایک ہوتی ہے رب کی چاہت اور ایک ہے بندہ کی چاہت۔ جب انسان اپنی چاہت اور خواہش کے پیچھے بغیر کوئی سمجھوتہ کئے سرپٹ بھاگتا ہے، اسے رب تعالیٰ کے حوالے نہیں کرتا، اپنے معاملات رب کو نہیں سونپتا۔ اپنی ہر کوشش اور خواہش کا نتیجہ اپنی مرضی کے مطابق دیکھنا چاہتا ہے، رب تعالیٰ پر اس طرح بھروسا نہیں کرتا جس طرح کرنے کا حق ہے۔ بس اپنی چاہت اور آرزو کے گھوڑے کو بے لگام چھوڑ دیتا ہے تو پھر رب تعالیٰ اُسے خواہش کے اس سفر میں تھکا دیتا ہے اور بالآخر ہوتا وہی ہے جو رب کی چاہت ہوتی ہے۔

لیکن جب بندہ اپنی مرضی اور خواہش پر رب کی مرضی اور خواہش کو ترجیح دینے لگتا ہے، اپنی خواہشات کو ڈھیلا چھوڑ دیتا ہے تو پھر اس کی وہ تمنائیں بھی پوری ہونے لگتی ہیں جو دل کے نہاں کونوں میں بُکل مار کر بیٹھی ہوتی ہیں اور ان خواہشوں کو بھی تکمیل کا مژدہ مل جاتا ہے جو بے عنوان رہ جانے کے خوف سے کہیں ہمارے اندر سسک رہی ہوتی ہیں۔

؎ اس خوف سے کہ میرا کہیں راز کھل نہ جائے
میں دل کی کھڑکیوں کے پردے گرا کے رویا

خواہشات اور وسائل میں توازن نہ رہے تو زندگی غیر متوازن ہونے لگتی ہے۔ خواہشات اور حاصل میں جتنا زیادہ Gap ہوگا انسان اسی قدر مضطرب اور ڈپریس رہنے لگے گا۔ اضطراب ہے کیا.....؟ واصف علی واصف صاحب نے فرمایا تھا کہ ''حاصل اور خواہش کے درمیان فرق کا نام اضطراب ہے۔'' اس اضطراب سے بچنے کا ایک ہی فارمولا ہے کہ خواہشوں کا دائرہ محدود کر کے حاصل اور خواہش کے درمیان فرق کو کم کر لیا جائے۔

کچھ لوگ جب یہ راز جان لیتے ہیں تو بہت سی خواہشات سے منہ موڑ کر خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیتے ہیں۔ رب کی مرضی کو اپنی مرضی بنا لیتے ہیں، ضروریاتِ زندگی کو Barest Minimum پر لے آتے ہیں لیکن پھر ایک روز یوں ہوتا ہے کہ ان کی پرسکون زندگی کی جھیل میں کسی خواہش کا پتھر اسی زور سے گرتا اور شدت سے ہلچل مچاتا ہے کہ ان کا رؤاں رؤاں ''بہ نوکِ خارِ رقصم'' کی گردان کرنے لگتا ہے۔

؎ ''اک پل کسی خواہش کی زیارت کو اٹھے تھے
اندر کے قلندر نے بڑی دیر نچایا

کچھ خواہشات اتنی زور آور ہوتی ھیں کہ انسان کو جتن کرنے کے باوجود ان کی قید سے آزاد نہیں ہو پاتا۔ حتیٰ کہ ان کی تکمیل کے لئے ہر جائز و ناجائز حربہ اختیار کرتا ہے اور اگر اس کے باوجود اس کی خواہشات نا آسودہ رہ جائیں تو کبھی وہ ذہنی مریض بن جاتا ہے تو کبھی جرم کے راستے پر چل نکلتا ہے..... خواہش کی شدت حد سے تجاوز کر جائے تو حرص بن جاتی ہے۔ اور حرص انسان کی شخصیت کو بدبودار اور بدصورت بنا دیتی ہے۔

؎ حرص و ہوا دے ہتھوں بندہ
اگے ای کِنا کو ہجا اے
کل مَیں بیٹھا سوچ رئیا ساں
ہور وی کِنا کو ہجا ہندا
کفن نوں جے کر بوہجا ہندا

خیر آپ سوچ رہے ہوں گے کہ آخر حل کیا ہے.....؟ خواہشات کے ہوتے ہوئے حرص، حسرت، نارسائی، اضطراب اور بے سکونی سے کیسے بچا جا سکتا ہے؟ اگر ذرا غور کریں تو اس کا جواب ہمیں خود اپنے اندر اور اپنے ہی گردوپیش کے مشاہدے سے مل جائے گا

1۔ بابا بدھا کے مطابق ہم خواہشوں کو ڈھیلا چھوڑ دیں تو زندگی خوبصورت ہوتی چلی جائے گی۔

؎ خواہشوں کو خوبصورت شکل دینے کے لئے
خواہشوں کی قید سے آزاد ہونا چاہیے

2۔ ہم خواہشات کو محدود کر لیں۔ بڑے بڑے

خواب دیکھنے کی بجائے حقیقت پسندی کا مظاہرہ کریں۔ چادر کے مطابق پاؤں پھیلائیں اور حضرت علیؓ کا یہ فرمان یاد رکھیں کہ ''اگر خواہشات کو کم رکھو گے تو راحت پاؤ گے۔

3۔ خواہشات کو ساتھ رکھیں لیکن خود پر حاوی نہ ہونے دیں کیونکہ جب تک خواہشات ہماری غلام رہتی ہیں ہم آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں لیکن جب ہم انکے غلام ہوجاتے ہیں تو زندگی بے سکون ہونے لگتی ہے۔

4۔ ظاہری چمک دمک سے متاثر ہوکر خواہشات نہ پالیں

؎ اس دل کا بھی ہوتا ہے کبھی بچوں کا سا عالم
گر زہر بھی خوش رنگ ہو، پینے کو مچل جائے

ہمیشہ یاد رکھیں کہ کچھ خواہشات کا پورا نہ ہونا ہی ہمارے فائدہ میں ہوتا ہے۔

5۔ مقصد، حیات کا تعین کرلیں اور خواہشات کی ترجیحات طے کرلیں۔ اگر انسان اللہ کو اپنی ترجیحِ اول بنالے تو خواہشات کا دائرہ خود بخود سکڑنا شروع ہوجاتا ہے۔

6۔ خواہش اور حاصل میں فرق کم کرنے کے لئے بھرپور جدوجہد کریں اور پھر جو اور جتنا بھی حاصل ہو اس پر اللہ کا شکر ادا کریں۔

7۔ اگر زندگی کی کوئی بہت بڑی آرزو کسی وجہ سے پوری نہ ہوسکی ہو اور زندگی میں ہیجان اور محرومی کے دکھ کو سوا کر رہی ہو تو کوشش کرکے چھوٹی چھوٹی ممکن خواہشیں کرنا سیکھیے۔ جب وہ جلدی جلدی پوری ہوتی نظر آئے گی تو ان کی خوشی تشنہ خواہش کا دکھ کم کردے گی۔

8۔ سادہ طرزِ حیات اپنائیں

؎ بند کرکے خواہشوں کا ایک دروازہ میں

ہم نے اپنی زندگی کو کتنا سادہ کرلیا

9۔ اگر دل کی بستی میں کوئی ایسی خواہش ڈیرہ لگالے جو وہاں سے نکلنے کو تیار ہی نہ ہو، کوئی دلیل ماننے پر آمادہ نہ ہو اور اس خواہش کے پورا ہوئے بغیر آپکو اپنا منظرِ حیات پت جھڑ میں لپٹا دکھائی دینے لگے، سانس رکتی محسوس ہونے لگے تو دو کام کیجیے گا۔ (A) ناممکن خواہش کو کسی ممکن خواہش سے بدل کر اپنا دھیان ہٹا لیجیے۔ (B) ایک لمحے کو ٹھہر کر زندگی کے عارضی پن کی حقیقت سمجھنے کے بعد خود کو سمجھائیے گا کہ مجھے اس خواہش کو پانے کی ضد نہیں کرنی۔ مجھے ہر خواہش کی لگام اللہ کے ہاتھ میں دینی ہے، اس یقین اور بھروسے کے ساتھ کہ اللہ سے بڑھ کر میرا خیر خواہ کوئی نہیں ہے اور وہ یقیناً میرے لیے بہتر کرے گا۔ اور یہ تو آپ سب جانتے ہی ہیں کہ جو کرتا ہے اللہ کرتا ہے اور اللہ جو کرتا ہے صحیح کرتا ہے۔

10۔ یاد رکھیے خواہشات کو کم تو کیا جاسکتا ہے لیکن زندگی سے نکالا نہیں جاسکتا۔ خواہشوں کا بے آباد قصبہ کبھی ویران نہیں ہوتا۔ لیکن اس قصبے میں سکون سے رہنے کے لئے ضروری ہے کہ خواہشات کا قبلہ درست کرکے ان کو صحیح سمت میں Channelize کرلیا جائے۔ کیونکہ خواہشات کا لامتناہی سلسلہ قبر میں جاکر ہی ختم ہوتا ہے جیسا کہ آپ ﷺ نے چودہ سو سال قبل فرمادیا تھا کہ

''اگر ابنِ آدم کو دو وادیاں سونے اور چاندی کی مل جائیں تو وہ تیسری وادی کی خواہش کرے گا..... بات یہ ہے کہ ابنِ آدم کا پیٹ صرف مٹی ہی بھر سکتی ہے۔

■■■

''تدبیر''

جو حیرت انگیز طور پر کام کرگئی

بشیر احمد بھٹی

ایک دور تھا جب مہمان داری اور مہمان نوازی کا بڑا اہتمام ہوتا تھا، مہمان کی قدر کی جاتی تھی۔ میزبانی کے فرائض بڑی دلجوئی سے ادا کئے جاتے تھے۔ اسے خیر و برکت کا باعث سمجھا جاتا تھا۔ مہمان کی عزت افزائی کے لئے کھانے پینے کا خصوصی انتظام کیا جاتا۔ مہمان بھی خوب ڈٹ کر کھانے سے انصاف کرتے تھے۔ اس کے باوجود میزبان اصرار کرکے میزبانی کے حقوق ادا کرتے تھے۔ مہمانوں کو مزید کھانے پر اکسایا جاتا تھا۔ وقت کیا بدلا، روایتیں ہی بدل گئیں۔ آج اچھی روایتوں کا فقدان ہے۔

انسانی ضرورتیں منہ کھولے کھڑی ہیں۔ گھر میں آسائش کی تمام اشیاء موجود ہیں پھر بھی وجہ بے وجہ مہنگائی کا رونا رویا جاتا ہے۔ موٹر سائیکل اور کار سے لے کر ٹی وی، ریفریجریٹر تک موجود ہیں جن کی وجہ سے اخراجات بڑھ گئے ہیں۔ اس لیے مہنگائی کا عفریت وسائل کو نگل رہا ہے۔ شاید اس لیے اب مہمان کو وبالِ جان جانا جاتا ہے۔ پہلے یہ مثال بھی مشہور تھی کہ مہمان اپنے نصیب کا رزق ہمراہ لاتا ہے۔ سبھی اس پر یقین بھی رکھتے تھے۔ ہماری بستی کی ایک فیملی کسی کے ہاں مہمان جا ٹھہری۔ میاں بیوی کے علاوہ اُن کے چار عدد نونہال

بھی ساتھ تھے۔ ایک ہفتے تک وہ مہمان داری کے مزے لیتے رہے۔ گھر کا سارا نظام بچوں نے شرارتوں سے تلپٹ کر دیا۔ ایک صبح جب سب گھر والے مہمانوں کے ہمراہ ناشتہ کر رہے تھے تو میزبان یہ سمجھے کہ شاید اس ناشتے کے بعد گلو خلاصی ہو جائے۔ مہمان صاحب بمع فیملی جانے کا قصد کریں گے۔ مگر ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد اس گھرانے کا سربراہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ مہمان فیملی کا سربراہ قریب ہی بیٹھا تھا۔ بچے کھیل کود میں مصروف ہو گئے۔ خواتین زنان خانے میں محوِ گفتگو ہوئیں۔

میزبان نے مہمان سے پوچھا۔ اچانک ہمارے ہاں آنے کا پروگرام کس طرح بنا۔'' مہمان بڑے فخر سے بولا۔'' بس جی کیا بتائیں۔ یہ سب دانے پانی کا چکر ہے۔ جس کا دانہ پانی جہاں مقسوم ہے۔ اس نے وہ کھانا ہے۔''

میزبان یہ سُن کر سٹپٹا گیا۔ دور اندیش آدمی تھا۔ فوراً سمجھ گیا۔ موصوف کے جانے کے ارادے نظر نہیں آ رہے۔

''ہاں یہ تو ہے۔'' میزبان گلوگیر آواز میں بولا۔

''ایک اہم بات تو آپ کو بتانا بھول گیا۔'' مہمان بولا۔

میزبان کے کان کھڑے ہوئے۔ اشتیاق بھی پیدا ہوا کہ وہ اہم بات کیا ہو سکتی ہے۔ فٹ سوال داغ دیا۔'' وہ اہم بات کیا تھی جناب!''

مہمان نے صوفے پر پہلو بدلا۔ پھر اہم بات بتانے لگا۔'' ایک صبح کی بات ہے۔ میری زوجہ نے ایک خاص نظارہ دیکھا؟'' اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

میزبان سسپنس میں مبتلا ہو گیا۔ کہ وہ خاص نظارہ کیا ہو سکتا ہے؟

مہمان نے سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے بیان جاری کیا۔'' میری بیوی نے دیکھا کہ میرے جوتے پر جوتا چڑھا ہوا ہے۔ اس نے میری توجہ اس جانب مبذول کرائی تو میں بھی حیران ہوا۔ ابا حضور فرماتے تھے کہ جب جوتے پہ جوتا چڑھ جائے تو سمجھو سفر کرنا ہے۔ بس جی پھر کیا بتاؤں یہ سفر کر کے ہم آپ تک آ پہنچے۔ ابا حضور کا فرمان درست ثابت ہوا۔ پرانی وضع کے لوگ تھے۔ اُن کی باتیں پتھر پر لکیر ثابت ہوتی تھیں۔ اُن کی مثالوں کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ بڑے سچے اور کھرے لوگ تھے۔

میزبان نے پیشانی کو مسلا پھر سر کھجاتے ہوئے بولے۔'' بالکل درست فرمایا۔ پرانے لوگوں کی مثالیں واقعی پتھر پر لکیر ہوتی تھیں۔ وہ اس لکیر کے فقیر ہوتے تھے۔ اچھا مجھے اجازت دیجیے۔ میں ذرا بازار سے ہو آؤں۔ آپ قیلولہ فرمائیے۔ تا کہ کھانا ہضم ہو جائے۔'' اتنا کہہ کر میزبان اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ مہمان صاحب سامنے بیڈ پر لیٹ گئے۔

رات کا کھانا سب نے مل کر کھایا۔ اب میزبان صاحب سوچنے لگے کہ ایسی کیا تدبیر کی جائے کہ مہمان صاحب بمع فیملی عزت و آبرو کے ساتھ رخصت ہوں۔ وہ رات بخیر و خوبی گزری۔

دوسری صبح کا سورج آب و تاب سے طلوع ہوا۔ اچانک میزبان صاحب مہمان کے کمرے میں داخل ہوئے۔ انھوں نے اپنی ایک عمدہ اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کے لئے سبھی اہلِ خانہ کو ساتھ لینے کا سوچا

اور میزبان نے اونچی آواز سے تمام گھر والوں کو مہمان کے کمرے میں بلا لیا۔

مہمان کے بیوی بچے بھی دوڑے چلے آئے۔ سب یک زبان ہو کر پوچھنے لگے۔ کیا ہوا۔''

تب میزبان نے سب کی توجہ ایک اہم نظارے کی طرف مبذول کرائی۔ سب اس نظارے کی طرف متوجہ ہوئے۔ سب نے دیکھا کہ مہمان کا جوتا اس کے دوسرے جوتے پہ سوار ہے۔ سب انگشت بدنداں ہوئے۔ مہمان صاحب بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ اُن کی نگاہ بھی اپنے جوتے پڑ گئی۔ جوتے پہ جوتا چڑھا ہوا تھا۔ اس منظر کو جھٹلانا ممکن نہ تھا۔

''اوہ..... ہو۔ لگتا ہے بھئی پھر آپ کی قسمت میں کوئی نیا سفر لکھا ہے۔ آپ کے جوتے تو یہی بتا رہے ہیں۔'' میزبان بولا۔

مہمان صاحب یہ مژدہ سن کر سٹپٹا ہی گئے۔

خجالت سے بولے۔ بالکل جناب! جوتے تو یہی بتا رہے ہیں کہ ہمیں اب کہیں اور کا نہیں گھر واپسی کا سفر درپیش ہے۔''

چنانچہ تمام لوگ ناشتے کے لئے دسترخوان پر آ گئے۔ ناشتہ شروع ہوا۔ ناشتے کے بعد مہمان صاحب واپس جانے کے لئے تیار ہوئے۔ دن کے دس بجے انھوں نے تیاری مکمل کی اور میزبان کی اجازت سے ان کے گھر سے رخصت ہوئے۔

مہمان چلے گئے تو میزبان کی بیوی بولی۔'' یہ گھوڑے جوتے بھی عجیب ہوتے ہیں، جوتے پر جوتا چڑھا اور سفر شروع۔'' پھر وہ گھر کے اُجڑے ماحول کو درست کرنے میں لگ گئی۔

میزبان صاحب بھی کام پر جانے کی تیاری کرنے لگے۔

بیوی بولی۔'' پرانے لوگوں کی باتیں بھی کیا خوب ہوتی تھیں۔ مہمان کے باپ کی بات دوسری بار سچ ہو گئی۔ جوتے پہ جوتا چڑھا اور بیچاروں کو ایک اور سفر پر روانہ ہونا پڑا۔''

میزبان بولا۔'' بس اب رہنے بھی دو بزرگوں کا فلسفہ۔'' یہ صرف کہنے کی باتیں ہیں۔ تمھیں کیا پتا مجھے جوتے پر جوتا چڑھانے کے لئے کتنی محنت کرنی پڑی۔ کئی بار کمرے تک آیا، کبھی وہ جاگ رہا ہوتا اور کبھی کچی نیند میں بڑبڑا رہا ہوتا۔ صبر آزما انتظار کے بعد جا کر یہ سنہری موقع ملا تمھیں بزرگوں کے فلسفے کی پڑ گئی۔ یہ

نہیں دیکھا کھانا پکاتے پکاتے ہمارے ہاتھوں میں گٹے پڑ گئے تھے۔''

بیوی یہ سن کر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''آپ بھی ناں؟''

''پورا بھی بولو ناں'' میزبان نے عرصے بعد اپنی بیوی کو یوں کھل کر کھل کھلاتے دیکھا تھا.....

''تدبیر کام کر گئی۔ ورنہ ہم کام سے گئے تھے بیوی نے اپنے سرتاج کا ہاتھ تھام لیا اور بولی'' سیانے ایک بات اور بھی تو کہتے ہیں کہ مہمانی تین دن کی۔ آنے والے اس کا بھی خیال رکھ لیتے تو میرے سرتاج کو یوں جوتے پر جوتا چڑھانے کی مشقت تو نہ کرنا پڑتی''۔

پھر اس نے خاوند کی چٹکی لی اور بولی ہے تو وہ بھی آپ ہی کے خاندان سے، سمجھ تو گیا ہو گا کہ یوں اپنے آپ اتنے اہتمام سے جوتے پر جوتا کیسے اور کب چڑھا ہے!''

■■■

جنرل جیلانی نے فوجی عدالت کو لائبریری میں بدل دیا

قائداعظم لائبریری

''بہترین پبلک سروس'' کا ایوارڈ پانے والے چیف لائبریرین عابد گل سے ایک ملاقات

ایک لاکھ بیس ہزار سے زائد کتابوں اور پُرسکون ماحول نے اسے سی ایس ایس کرنے والوں کی جنت بنا دیا ہے

حنا انور

پاکستان میں اگر جدید سہولیات سے لیس، خوبصورت، جدید اور پرسکون لائبریری کا ذکر کیا جائے تو قائداعظم لائبریری کا نام سرفہرست آئے گا۔ یہ لائبریری لاہور کے دل میں واقع باغِ جناح میں قائم ہے۔ لائبریری میں اُردو، عربی، فارسی اور انگریزی کتابوں کے سیکڑوں اور ہزاروں مجموعہ جات موجود ہیں۔ نہ صرف تاریخ اور روایتی کتابیں بلکہ بزنس ایڈمنسٹریشن، ٹیکنالوجی، آرٹ اور کمپیوٹیکیشن کا بھی بڑا ذخیرہ موجود ہے بلکہ ہر سال 3000 کتابوں کا سالانہ اضافہ بھی کیا جاتا ہے۔

گورنر پنجاب جنرل جیلانی کے حکم پر باغ جناح لاہور میں ایک ماڈل لائبریری قائم کرنے کے لیے 17 مئی 1981ء کو چیف سیکرٹری پنجاب کی زیر صدارت ایک کمیٹی بنائی گئی۔ پرانے جم خانہ کی عمارت کو لائبریری میں تبدیل کرنے کے لیے تعمیر کا کام شروع کر دیا گیا۔ جنرل غلام جیلانی نے اس میں ذاتی دلچسپی کا اظہار کیا اور 24 اکتوبر 1981ء کو جنرل ضیاء الحق نے باغ جناح کا دورہ کیا اور لائبریری کے منصوبے کی منظوری دے دی۔ 25 دسمبر 1984ء کو لائبریری کا صدر پاکستان نے افتتاح کیا گیا اور اسے قائداعظم لائبریری کے نام سے موسوم کردیا گیا۔

لائبریری کو مختلف سیکشن میں تقسیم کیا گیا ہے۔ حوالہ جاتی سیکشن، اورینٹل سیکشن، لیڈیز سیکشن اور سمعی و بصری ایڈ سیکشن۔ اس کے علاوہ لائبریری میں ایک خوبصورت آڈیٹوریم بھی بنایا گیا ہے جہاں مختلف قسم کی کانفرنس، سیمنار اور ورکشاپ کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

ایک اور خوبصورت بات یہ ہے کہ لائبریری کا فرنیچر نیشنل کالج آف آرٹس لاہور کی طرف سے ڈیزائن کیا گیا ہے۔

محمد عابد گل چیف لائبریرین قائداعظم لائبریری میں 1982ء سے کام کر رہے ہیں۔ ماسٹرز کرنے کے بعد پبلک سروس کمیشن میں ان کی سلیکشن ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ آغاز سے ہی میں اس ادارے سے منسلک ہوں، بطور اسسٹنٹ لائبریرین، سینئر لائبریرین اور اب میں چیف لائبریرین کے طور پر کام کر رہا ہوں۔ انہیں پچھلے دنوں حکومت پنجاب کی جانب سے Best Public Service Award سے بھی نوازا گیا ہے۔

اس ایوارڈ کو Outstanding Performance of Civil Servant کہا جاتا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ ''اس کے باوجود مجھے یہ ایوارڈ دیا گیا میں ایک روایتی سول سرونٹ نہیں ہوں بلکہ ایک پروفیشنل آدمی ہوں اور میں بطور لائبریرین کام کرتا ہوں، مگر اس ادارے کے کام، معیار اور پبلک سروس میں اعلیٰ کارکردگی کے مسلسل مظاہرے کے باعث مجھے اس ایوارڈ کے قابل سمجھا گیا۔ ایک لحاظ سے تو یہ سارے لائبریرین کیلئے عزت اور وقار کا حامل ہے۔''

یہ لائبریری پاکستان کی واحد لائبریری ہے جو ریسرچ اینڈ ریفرنس کے طور پر کام کر رہی ہے۔ یاد رہے کہ یہ ایک پبلک لائبریری نہیں ہے جب کہ لوگوں میں اس کا تاثر پبلک لائبریری ہی کا ہے بلکہ یہ ریسرچ کو پروموٹ کرتی ہے۔ ہمارے پاس جو اس وقت ممبرشپ ہے اس میں 92 فیصد ممبران Phd ہیں جب کہ 800 سے زائد ممبران M.phil کے اسٹوڈنٹ ہیں۔ ہم ان سے متعلقہ جتنا بھی لٹریچر ہو سکتا ہے ان کو مہیا کرتے ہیں۔ ہمارے پاس 350 کے قریب میگزین آتے ہیں جس میں تقریباً 35 روزنامے ہیں، 5 غیر ملکی روزنامے شامل ہیں۔ لوگوں کے ذہن میں ایک غلطی فہمی پائی جاتی ہے۔ ایک گھر میں بیٹھا ہوا شخص Digital Sources تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ Google پر ملین کی تعداد میں آن لائن کتابیں موجود ہیں۔ اس کو علیحدہ Maintain کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے بلکہ اصل کام یہ ہے کہ لوگوں کو Sources اور Database تک رسائی کے متعلقہ صحیح معلومات فراہم کرنا ہے۔ جب کہ ہمارے پاس ساڑھے چودہ ہزار آف لائن کتابیں موجود ہیں۔ اب چونکہ کاپی رائٹ کا مسئلہ ہوتا ہے اس لیے ہم انھیں ویب پر نہیں ڈال سکتے۔ جب کہ ممبران یہاں بیٹھ کر ان کو Access کر سکتے ہیں۔ نوجوانوں کے حوالے سے خاص طور پر دو شعبہ جات ایسے ہیں جن میں، میں سمجھتا ہوں ہم نے بہت کام کیا ہے۔ ایک ہے CSS اور دوسرا ریسرچ۔ CSS کے حوالے سے ہم نے حال ہی میں ایک پورا سیکشن تیار کیا ہے جسے CSS Collection کہتے ہیں اور اس میں جو سلیبس کی مجوزہ کتابیں اور ان کی سپورٹنگ کتابیں وہ سب ہم نے رکھی ہیں۔ اس میں ہم

نے CSS کے حوالے سے ایک اور منفرد کام کیا ہے وہ یہ ہے کہ ایک ہم آن لائن اخبارات اور دیگر میگزین کے Press clipings بناتے ہیں، مختلف موضوعات پر۔ کسی بھی مخصوص موضوع پر جو کچھ بھی اخبارات و میگزین میں آتا ہے ہم اس کی کلپنگ کر کے ایک فولڈر میں رکھتے جاتے ہیں۔ یہ ڈیجیٹل اور پرنٹ دونوں صورتوں میں ہمارے پاس موجود ہے اور اسٹوڈنٹس اس سے مستفید ہو رہے ہیں۔ مثال کے طور پر دہشت گردی کے حوالے سے جو بھی مضامین اخبارات میں چھپے ہوں وہ آپ کو ایک ہی جگہ سے مل جائیں گے۔ اسی طرح کتابوں کے حوالے سے بھی ہم نے کافی پیش رفت کی ہے باہر سے بھی بہت ساری کتابیں منگوائی ہیں۔ اور ایم فل، پی ایچ ڈی کے حوالے سے بھی ہمارے پاس اچھی کولیکشن موجود ہے۔ ہم خاص طور پر نئی کتابیں خریدنے کو ترجیح دیتے ہیں اس سال بھی ہم نے جو کتب خریدی ہیں ان میں سے کوئی بھی کتاب ایسی نہیں جو سال 2012ء یا 2013ء سے پہلے طبع ہوئی ہو۔ ہم نے لیب ٹاپ کے لیے بھی پرپوزل بھجوا دیا ہے، یہ ممبرز کے لیے ہوں گے نہ کہ اسٹاف کے لیے۔

82ء میں جب ہم نے اس لائبریری کے پراجیکٹ کا آغاز کیا تو اس وقت یہاں آرمی کورٹ تھی گورنر جیلانی نے ہی اس پراجیکٹ کو آگے بڑھایا اور اسے لائبریری میں تبدیل کر دیا۔ ان کے بعد ان کے نام سے غلام جیلانی ریسرچ اسکالر روم قائم کیا گیا ہے۔ وہ روزانہ شام کو گورنر ہاؤس سے پیدل یہاں پہنچ کر ایک ایک سیکشن کیلئے ہدایات دیتے۔

اور سنٹرل سیکشن میں وہ تمام کتابیں ہیں جو لوگوں نے Donate کی ہیں۔ ایک پورے سیکشن میں کتابوں پر MI Code تھا۔ پوچھنے پر بتایا کہ یہ شیخ منظور الٰہی کی عطیہ کی گئی کتابوں پر مشتمل ہے۔ اس طرح QJ، کراچی کے ایک مشہور آدمی ہیں قمر جعفری یہ ان کی کتابوں پر مشتمل سیکشن ہے۔ اسی طرح مساوات کے ایڈیٹر صفدر میر کی عطیہ کردہ کتابوں کا بھرپور کولیکشن دیکھا۔ جو سات ہزار کتابوں پر مشتمل تھا۔

مستقبل کے منصوبوں کے بارے میں بات کرتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ ہمارا ایک پراجیکٹ بولر انرجی کے حوالے سے چل رہا ہے۔ اللہ نے چاہا تو اس مالی سال میں ہم اسے مکمل کر لیں گے۔ اس سلسلے میں حکومت کی جانب سے ہمیں 8 ملین کی ایڈ ملی ہے۔ اس کے علاوہ CSS اور کمپیوٹر

> جناح لائبریری کو ایک بورڈ آف گورنر چلاتا ہے۔ اس میں حکومت پنجاب کے اعلیٰ حکام شامل ہیں۔ چیف سیکرٹری اس کے چیئرمین ہیں، سیکرٹری انفارمیشن، سیکرٹری اسکول، سیکرٹری ہائر ایجوکیشن، سیکرٹری فنانس یہ سب اس میں شامل ہیں۔ اور اس کے علاوہ دیگر سینئر علمی و ادبی قسم کے لوگ اس بورڈ کا حصہ ہیں۔ پنجاب حکومت اس کو گرانٹ دیتی ہے۔ اس وقت یہاں کل کتابوں کی تعداد یک لاکھ بیس ہزار کے قریب ہے جب کہ سالانہ پانچ کروڑ ہمیں گرانٹ ملتی ہے۔ حال ہی میں مشرقی و مغربی بیس منٹ تیار کی ہیں۔ ایک انگریزی سائیڈ ہے دوسری اردو سائیڈ ہے۔ بیسمنٹ میں خاصی شاندار کنسٹرکشن کی گئی ہے۔ چکیلے پتھروں سے فرش جہاں چمک رہا تھا وہاں ہال کے وسط میں پیچ کھاتی دلکش لکڑی کے ڈیزائن والی روش نے بھی حیران کرتی ہے۔

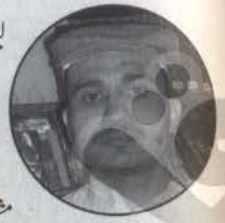

لیب ہم چاہتے ہیں کہ سولر پر ہو جائے کیونکہ لوڈشیڈنگ کے باعث پڑھنے والوں کو کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ شام کو خاص طور پر بہت مسائل ہو جاتے ہیں۔ لائبریری میں ہماری ملاقات چند ہونہار طلبہ و طالبات سے بھی ہوئی ان کے تاثرات بھی ذیل میں دیئے جا رہے ہیں۔

محمد ثاقب (پی ایم ایس)

یہاں صبح آتے ہیں پورا دن جتنی پڑھائی ہو سکے کرتے ہیں اور شام کو گھر چلے جاتے ہیں۔ یہاں پر پڑھائی کا مواد بھی اتنا ہے کہ کہیں اور جانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔

ابھی انھوں نے کافی Online Data بھی کر دیا ہے اور اس پر مزید کام بھی کر رہے ہیں۔ یہاں جو سب سے بڑا فائدہ ہے وہ یہ ہے کہ International Journals اور دیگر Database تک رسائی ممکن ہے۔ ہم بھی جب جب ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ ان کو Access کرتے ہیں۔ کیونکہ آپ جانتی ہیں کہ مقابلے کے امتحان میں صرف کتابیں ہی کافی نہیں ہوتیں۔ کہیں سے بھی وہ Question ڈال سکتے ہیں۔ اس لیے آپ کو Update رہنے کے لیے مختلف International Journals، Periodicals اور میگزین Consult کرنا پڑتے ہیں۔

فاکیہ (سی ایس ایس)

یہاں پر میری ضرورت کا تمام مواد آسانی سے مل جاتا ہے۔ جو نوٹس بنانے میں بہت مددگار ثابت ہوتا ہے۔ میرا یہی ماننا ہے کہ شاید ہی پورے پاکستان میں اس سے اچھی اور بہترین لائبریری کوئی اور موجود ہو۔ اس کے علاوہ یہاں آپ کو اور بھی سی ایس ایس کرنے والوں سے رابطہ کرنے کا موقع ملتا ہے سینئر جونیئر آپس میں ملتے ہیں اور دیگر موضوعات زیادہ وضاحت سے سمجھ میں آتے ہیں۔

محمد شہزاد (سی ایس ایس)

میں یہاں روزانہ 8 سے 9 گھنٹے اسٹڈی کرتا ہوں۔ یہاں کا ماحول بہت پرسکون ہے جو کسی اور جگہ اسٹوڈنٹس کو میسر نہیں آتا۔ خاص طور پر یہاں انٹرنیشنل جرنلز تک جو رسائی ممکن ہے جو مقابلے کے امتحانوں کی تیاری کیلئے بہت موثر ثابت ہوتی ہے میرے لیے۔

الیاس محمد فاسکری (CSS Fellow)

ہمیں کہیں اور جانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی خاص طور پر یہاں کا ماحول بے حد پرسکون ہے۔ لائبریری میں بہت ترقی ہوئی ہے، نئے سیکشن بھی بنے ہیں۔

میگزین اور اخبارات ہر قسم کے یہاں موجود ہیں۔ نہ صرف کتابیں بلکہ یہ بھی لیے بہت سود مند ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ بہت سی چیزیں مارکیٹ میں نہیں ملتی وہ بھی یہاں سے مل جاتی ہیں۔ جیسے انٹرنیشنل میگزین، اداروں کی سالانہ تجزیاتی رپورٹس وغیرہ۔ ■■■

نور نگر

محمد نورالحسن

میں نے اسے پہلی بار ایک گرم سے Doormat پر لیٹے دیکھا، وہ نیم خوابیدہ ادھ کھلی آنکھوں سے ہر آنے جانے والوں کو تولتا مولتا رہتا۔ Door Mat کا قدموں، گرد اور زمین سے بڑا گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ Door Mat زمین پر رہتا ہے قدموں کو چومتا ہے اور خوشی خوشی گرد آلود رہتا ہے۔ سو ہر آنے جانے والا اس Door Mat سے ہو کر اخبار کے استقبالیہ دفتر یعنی Reception میں داخل ہوتا، اور ہر داخل ہونے والا اس پر بھی نظر ڈالتا جو بڑے آرام اور اطمینان سے ٹانگیں پسارے Door Mat کے کنارے پر لیٹا ہوتا۔ میں نے اسے پہلی بار رات کے پچھلے پہر دیکھا۔ پھر جب بھی آنا ہوا اسے یا تو Door Mat کے قریب پایا یا دفتر کے ارد گرد چلتے پھرتے دیکھا۔ ایک دو بار یہ سوچا کہ اگر کوئی جلدی میں دروازہ کھول کر باہر نکلے اور بے خیالی میں یہ پیروں کی زد میں آجائے تو پھر کیا ہوگا۔ لیکن ایسا کبھی نہ ہوا۔ پہلی بار اسے دیکھنے پر یہ خیال آیا کہ شاید تھک ہار کر ستا کر یہاں پڑ جاتا ہے۔ لیکن سوال یہ تھا کہ اس در سے اس کا کیا تعلق؟

بھوری رنگت، سیاہ آنکھیں اور دھیما سا دھیرج والا تھا وہ۔ hey boby... boby boy come on getup رانا صاحب نے جب یہ آواز لگائی تو وہ اٹھا اور آہستہ آہستہ رانا صاحب کے ساتھ قدم اٹھانے لگا رانا صاحب اسے بڑے پیار اور مان سے پچکار رہے تھے اور وہ بھی ان کو گاڑی تک چھوڑنے آرہا تھا۔

یہ منظر دیکھ کر مجھے اس کا ایک عزیز یاد آگیا جو ایک اور مقام پر ڈیوٹی دے رہا تھا۔ وہ نہ تو Boby کی طرح دھیرج والا تھا اور نہ خاموش وہ جلدی میں بھی تھا اور اس کا کام Clearance تھا۔ منگلہ ڈیم کے ساتھ ایک چھوٹا سا جنگل ہے جہاں مین سڑک سے اتر کر آپ کو کچے میں گاڑی اتارنا ہوتی ہے۔ بڑے بڑے پتھروں پر سے گزر کر آپ ایک چھوٹے سے خالی میدان تک پہنچتے ہیں جس سے تقریباً ڈھائی سو گز دور سائیں نذیرؒ مدفون ہیں۔ محمد علی سانول کی رہنمائی اور برکت سے ہماری وہاں حاضری ہوئی۔ ایبٹ آباد سے لاہور واپسی پر وہاں رکنا ہوا۔ سب مل کر سات سے آٹھ افراد تھے۔ جب ہم وین سے نیچے اترے تو ایک کتا یعنی Boby کا ہم قبیلہ اور عزیز ہماری طرف بڑھا، اس نے ایک ایک فرد کے پیروں کو سونگھا جیسے چیکنگ کر رہا ہو، پھر یہ سب کرنے

کے بعد وہ ہمارے آگے آگے چلنے لگا جیسے راہنمائی کر رہا ہو۔ ہم سب مزار کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہ ہم سب سے آگے تھا۔ ادب کا تقاضا دیکھئے کہ اس کے پیر کا کوئی بھی حصہ نہ تو اس در سے مس ہوا اور نہ ہی اس نے اندر داخل ہونے کی جسارت کی۔ ہمیں وہاں چھوڑ کر وہ درختوں کی جانب بھونکتا ہوا نکل گیا جیسے اشارہ دے رہا ہو کہ I have done my job۔

سلام و دُعا سے فراغت میں تقریباً بیس سے پچیس منٹ لگے تو علی نے کہا کہ نور بھائی اب دیکھئے گا۔ باہر نکلے تو وہ پھر وہیں موجود تھا۔ اس نے ہمیں وین تک چھوڑا اور وین سٹارٹ ہونے کے ساتھ بلند بانگ آواز میں ہماری واپسی کا اعلان کرنے لگا۔ یہ رات کا پچھلا پہر تھا۔ اس بات کو تقریباً سات برس سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا لیکن میں اسے نہیں بھولا۔

کبھی کبھی سوچتا ہوں جانے کس کس در سے دُر دُر ہو تو کوئی ایک در کا ہو جاتا ہے اور جو ایک در کا ہو جائے وہ دُر دُر سے بچا رہتا ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ بلا، وفا، قضا کا کتے سے بہت گہرا تعلق ہوتا ہے۔ کتا وہ کچھ دیکھ سکتا ہے جو انسانی آنکھ دیکھ نہیں پاتی۔ وہ نادیدہ بلاؤں اور آفات کو بھگانے کے لیے رات کو بہت دیر تک کسی سواری کے ساتھ دوڑ لگاتا ہے حتیٰ کہ گاڑی میں بیٹھا شخص یہ بھی کہہ دیتا ہے کہ ''یار ایہدی تے مت ای ماری گئی اے، پتا نئیں ایہنوں کی نظر آرہیا اے۔'' جس کی جو ڈیوٹی لگی ہو اس کو وہ نبھانی ہوتی ہے۔ تمام مخلوقات، غرضیکہ چرند، پرند، جمادات و نباتات سب نے اپنے رب کے حکم سے آدم کو سجدہ کیا اور آج تک حکم نبھا رہے ہیں۔ جانے آدم کس کا حکم نبھا رہا ہے۔

خیر جب ایک بزرگ سے اس بھاگ دوڑ کی وجہ دریافت کی تو انہوں نے فرمایا آپ کو ان کتوں کا شکر گزار ہونا چاہیے، وہ آپ کو مختلف آفات و بلیات سے خبردار کرتے ہیں اور انہیں بھگا دیتے ہیں۔ جب میں نے اس بات پر بے یقینی ظاہر کی تو کہنے لگے اگر آپ کسی علم پر دسترس نہ رکھتے ہوں تو ضروری نہیں کہ وہ علم رب نے کسی اور کو عطا نہ کیا ہو۔ وہ بڑا بے نیاز ہے کتے، کبوتر اور کوے کے کارنامے آپ کیا جانیں، ان میں کتے کے علاوہ بھی دیگر بہت سی قیمتی قدریں مشترک ہیں۔

اب دیکھ لیں بظاہر اتنی سائنسی اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے باوجود بڑے بڑے سربراہ مملکت کتوں کے محتاج ہیں۔ انتہائی حساس Detectors بھی وہ کام نہیں کر پاتے جن پر Sniff Dogs کو دسترس حاصل ہے۔ اب بات وفا کی کریں تو کہتے ہیں کہ کتا سب سے وفادار جانور ہے جو اپنے مالک کے لیے جان لے بھی سکتا ہے اور جان دے بھی سکتا ہے۔ دنیا کی تاریخ میں بے شمار ایسے واقعات ہیں جن کو آج بھی بڑی حیرت اور فخر سے سنایا جاتا ہے کہ کتے نے مالک کی جان بچالی، کتا مالک پر قربان ہوگیا، بچے کی جان بچالی وغیرہ وغیرہ۔

بات Boby کی ہو رہی تھی Boby کی عمر غالباً 5 سے 6 ماہ تھی اور اخبار کے دفتر کے باہر بچھا Door Mat اس کا گھر تھا میرا اپنے بڑے اور پیارے بھائی سے ملاقات کے لیے اکثر یہاں آنا ہوتا۔ Boby اکثر وہاں منڈلاتا رہتا۔ ایک رات جب وہاں آنا ہوا تو Boby کہیں نظر نہ آیا۔ استقبالیہ پر موجود گارڈ بٹ صاحب سے پوچھا ''تہاڈا لاڈلا Boby نظر نہیں آرہیا'' تو جواب میں کہنے لگے اسے تو قریبی Appartments کے گارڈ نے گولیوں کے برسٹ مار

کر ہلاک کر دیا ہے۔ میں نے پوچھا کیوں؟ تو کہنے لگے ان کا خیال تھا Boby ایک آوارہ کتا ہے۔ اسے کئی بار منع کیا کہ Appartments کی طرف نہ آئے، وہاں رہنے والوں نے جو اچھی نسل کے پالتو کتے پال رکھے ہیں ان سے راہ و رسم نہ بڑھائے لیکن یہ باز ہی نہیں آتا تھا۔ سو مالک ہم پر ناراض ہوتے تھے۔ ان Appartments میں انسان بھی Security Clearance کے بعد داخل ہوتے ہیں تو کتے کی یہ جرات کہ اس طرح آتا جاتا رہے اور ہمارے قیمتی پالتو کتوں کا ماحول خراب کرے۔ سو ہم نے اسے گولیوں سے بھون دیا۔ اور کیا کرتے ایک کتے کے پیچھے روز روز جھڑکیاں اور گالیاں تو نہیں کھا سکتے۔ یہ سب بتاتے ہوئے بٹ صاحب کے سرخ و سفید چہرے پر اداسی نمایاں تھی۔ رانا صاحب، مشفق صاحب، افضال بٹ صاحب اور میں بٹ صاحب کی باتیں سن رہے تھے اور خاموش سر جھکائے کھڑے تھے۔ کتا تو پتھر مارنے سے بھی بھاگ جاتا ہے گولیاں مارنے کی کیا ضرورت تھی۔ دفتر کے باہر بچھا Door Mat بھی اداس تھا اور فضا بھی۔ پھر یہ خیال آیا کہ ایک کتا ہی تھا نا تو کیا ہوا! دنیا میں تو انسانی جان ارزاں ہے اور ہم ایک کتے کے متعلق فکر مند ہو رہے ہیں، پھر عارف لوہار صاحب کی گائی ہوئی جگنی کے بول سنائی دینے لگے کہ

ہم اپنے دشمنوں سے نفرت کا اظہار کرنے کے لیے منہ بھر کر یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ فلاں فلاں کتے کی موت مرگیا! لیکن اب کے موجودہ حالات دیکھو تو لگتا ہے کہ Boby انسان کی موت مارا گیا ہے۔ میرا بس اتنا خیال تھا کہ انسان کو انسان کی اور کتے کو کتے کی ہی موت مرنا چاہیے۔

''کتے دے گل پٹا ہووے تے وٹا کوئی نہ مارے
اوئے میریا جگنی وے''

لیکن Boby اور اس کے منگلا؟ میں موجود عزیز اور ہم قبیلہ کے گلے میں نظر نہ آنے والے ''محبت کے پٹے تھے'' لیکن یہ محبت کے پٹے سب کو دکھائی نہیں دیتے۔ کسی کے گلے میں پڑا ہوا محبت کا پٹہ کوئی محبت کرنے والا ہی دیکھ سکتا ہے۔

ہم تو جانوروں کی بولی سمجھ نہیں پاتے لیکن Boby کے ہم قبیلہ کبھی کبھی غصے میں اپنے بھائیوں اور رشتہ داروں کو جانے کس کا بچہ کہہ کر بلاتے ہوں گے۔ ہمارے ہاں تو کسی کو کتے کا بچہ کہنا گالی سمجھا جاتا ہے اور بابا بلھے شاہ کتوں کے بارے میں کہتے ہیں۔

''اٹھ بلھیا چل خیر منا لے نئی تے بازی لے گئے
کتے، تینتھیں اُتے۔''

☆☆☆

کڑی دھوپ کا سفر

نبیلہ ثقلین

بخار نہ ہونے پر ایک دن والدہ نے نہلا کر جھولے میں سلا دیا۔ یہ سوچ کر کہ گرمی ہے پنکھا چلا دیا۔ بخار دوبارہ ہوگیا اور اس کے ساتھ ہی ایک ٹانگ اور چہرے کے علاوہ پورا جسم مفلوج ہوگیا، یہاں تک کہ معمولی حرکت کے بھی قابل نہ رہا۔ سال ڈیڑھ سال تک ڈاکٹر انور کنور سے علاج اور والدین کی ان تھک محنت نے اسے اس قابل کر دیا کہ مفلوج حصوں میں حرکت ہونے لگی۔ مزید ایک سال چار پائی پر رہنے کے بعد دوبارہ چلنا شروع کیا۔ دو قدم چلنے کے بعد گر جاتی، لنگڑاپن، زبان میں شدید تتلاہٹ اور بے انتہا کمزوری دیکھ کر ماں چھپ چھپ کر روتی۔ ہاں بیٹی کے سامنے مضبوط چٹان کی طرح رہتی۔ محبت سے، سختی سے، تندی سے حوصلہ دیے جاتی۔ لوگوں کے لفظوں سے گھائل ہونے کے بعد دکھ سے پڑنے رہنے کے بجائے ہمت سے کام لینے کا حوصلہ پیدا کرتی۔

وہ بتاتی ہیں کہ ''میرے والد دھیمے، شفیق لہجے میں، چہرے پر مسکراہٹ لیے اس کی حوصلہ افزائی کرتے اور عملاً اس کا خیال رکھتے۔ ہاتھوں میں قلم پکڑنا سکھانے سے لیکر آج تک ہر لمحہ وہ سایہ کی طرح میرے ساتھ ہوتے ہیں۔ کم وسیلہ اور کم پڑھے لکھے ہونے کے باوجود انھوں نے مجھے ناکارہ وجود نہیں سمجھا۔ گھر میں ایک طرف ڈالنے کی بجائے انھوں نے میری تعلیم و تربیت اور پڑھائی لکھائی پر دوسرے بہن بھائیوں کی طرح پوری توجہ دی۔''

دادا اور دادی نے نماز، قرآن پاک پڑھنے اور اللہ سے

وہ گرنے کے بعد بہت رو رہی تھی۔ دیکھنے والوں کی ترس بھری نظریں اس کی طرف اُٹھیں لیکن اس سے پہلے کہ کوئی ہمدردی سے اسے اُٹھاتا ایک آواز سنائی دی ''کیا پہلی دفعہ گری ہے جو روتی ہے، یہ سدا کا دکھ ہے، تجھے اس کے ساتھ جینا ہے۔'' اس آواز کے ساتھ ہی وہ روتی لڑکی ترس بھرے ہاتھوں کا سہارا ملنے سے پہلے ہی چپ ہوچکی تھی۔ شاید دس بارہ سال کی اس کم سن اور کمزور لڑکی نے جان لیا تھا کہ ماں جیسی رحیم ہستی کے یہ الفاظ اس کی زندگی کی تیاری کے لیے کس قدر ضروری ہیں۔ اب اس بات کو 30 سال ہونے کو آئے، اس لڑکی نے مدد کے لئے کسی کی طرف نہیں دیکھا۔ چار فٹ قد اور 20 کلو وزن کی حامل ہے یہ لڑکی عام شخص کے انگوٹھے جیسی کلائیوں اور ٹیڑھی انگلیوں کے ساتھ زندگی کا سامنا پوری بہادری سے کرتی آرہی ہے۔

اپنی زندگی کے 30 سالوں کی کہانی سناتے ہوئے وہ لفظ لفظ پر کھو جاتی ہے۔ کبھی مسرتیں اس کے چہرے کا احاطہ کرتیں ہیں تو کبھی کرب یہاں سے وہاں تک ڈیرے جما لیتا ہے۔ کسی انسان دوست کا ذکر کرتے آنکھیں اور لہجہ بھیگ بھیگ جاتے ہیں۔

وہ ڈیڑھ سال تک گھر بھر میں پہلی اور خوبصورت اولاد ہونے کے ناطے ماں باپ اور دادا دادی کی بہت لاڈلی تھی۔ گرمیوں کے دن تھے خسرہ حملہ آور ہوا کبھی بخار ہوتا کبھی نہ ہوتا۔

محبت کرنے کا ہنر بخشا اور تصور دیا کہ اللہ سے مضبوط رشتہ قائم ہو جائے تو تکالیف آسان ہو جاتی ہیں۔

اٹھ غافلا پڑھ لے نماز   ویلا بیت جاندا اے

کے جادو اثر الفاظ کے ساتھ دادا صبح جگاتے تو زندگی تمام تر تکالیف کے باوجود امانت خداوندی محسوس ہوتی۔ ایسے میں مولانا اشرف علی تھانوی کی "10 عمال قرآنی"، زاد راہ بنتی۔ بہن بھائیوں اور دوستوں کی محبتوں نے جینے کا حوصلہ بخشا۔ حفیظ اور حمیدہ جیسی مخلص بہنوں کو اگر زندگی سے نکال دیا جائے تو نائلہ شاید وہ کبھی نہ بن پاتی جو اب ہے۔

"گڑیا تمہارے پاس دماغ بہت بڑی نعمت ہے جب تم کامیاب ہو جاؤں گی تو تمہارے جسمانی نقائص بہت پیچھے رہ جائیں گے۔"

اور پھر انھوں نے اپنی زندگی کا مشن بنالیا کہ کیا بہن کو کامیاب انسان بنانا ہے اس کی زندگی میں صفیہ ایک ٹھنڈی ہوا کے جھونکے جیسی تھی۔ انھوں نے قرآن پاک پڑھایا، تعلیم میں مدد کی اور جب اخراجات کے لیے کچھ مزید سیلوں کی ضرورت محسوس ہوئی تو خاموشی کے ساتھ اپنے پاس پڑھنے والے بچوں میں سے چند کو ٹیوشن کے لیے نائلہ کے پاس بھجوادیا۔ اس کم سن عمر میں صفیہ کا اتنا بڑا دل دیکھ کر نائلہ نے اس جیسی ٹیچر بننے کا فیصلہ کرلیا۔

واپڈا گرلز ہائی سکول چشمہ سے میٹرک کرنے کے بعد میانوالی گرلز کالج کا گھنٹہ بھر کا بس کا سفر ایک امتحان کی طرح ہی تھا۔ اللہ نے اس توقع پر ناتواں لڑکی کے لئے میری رفعت نواز جیسی انسان کو صحت اور قوت کا نشان بنا رہا۔ بی۔اے مکمل ہوگیا۔ اب ایک اور امتحان سامنے تھا۔ وہ جو دو قدم چلنے کے بعد تیسرا قدم اٹھاتے ہوئے گر جاتی تھی اس نے فیصل آباد سے ریگولر لی۔ ایڈ کرنے کی ٹھان لی۔ والدین شدید پریشان تھے۔ ایک طرف مستقبل کی آس انھیں ایسا کرنے کا حوصلہ دیتی تو دوسری طرف بیٹی کی ناتوانی اور معذوری ہمیں پست کر دیتی۔ لیکن اللہ کا کرم شامل حال ہوا اور وہاں زہادہ، آمنہ، شائستہ، کوثر اور لبنیٰ جیسی دوستوں ملیں جو نائلہ کی مضبوط یاور سہارا بن گئیں۔ یہاں تک کہ ہوسٹل کی لڑکیاں، زاہدہ اور شائستہ کو اس کی ماں کہہ چھیڑتیں۔

بی ایڈ کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔اے اکنامکس بھی کرلیا۔ اس دوران 2005 میں پاکستان بطور لیکچرار اٹامک انرجی کمیشن نائلہ گرلز کالج چشمہ میں پہلی ہی کوشش گزیٹڈ پوسٹ پر تقرری ہوگئی۔ وہ دن میرے ماں باپ بہن بھائیوں، اساتذہ، دوستوں اور اپنوں سے بڑھ کر حوصلے دینے والوں کے لئے بہت خوشی لیے ہوئے تھا۔ آٹھ سال ہونے کو آئے وہ لڑکی گرلز کالج چشمہ میں پڑھا رہی ہے ان گزرے سالوں میں پرنسپل میڈم رفعت گیلانی اور ساتھی اساتذہ نے اسے نہ صرف بہت محبت دی، بلکہ برابر کی عزت دی خیال رکھا۔ ہر طرح کا تعاون کیا اس نے اپنے علم کو نکھارا، نہ۔۔۔۔۔۔۔ بہت پیار کرتی ہے کہ دل میں اس کا احترام کرتی۔ میں 30 سال گزارتے نائلہ خلا میں گھورتے ہوئے سوچتی ہے کہ انھوں نے مثبت رویوں کے ساتھ ساتھ کچھ لوگ کہا کرتے تھے میرے رویے بھی اس ہمت کا باعث بنے ہیں۔

نائلہ سے میڈم نائلہ اختر کا سفر طے کروانے اور مثبت سوچ دینے میں بگ برادر ڈاکٹر خالد جمیل، جناب وقاص احمد چیئرمین سیسی ٹولائف اور ڈاکٹر فخر کا بھی ہاتھ ہے۔ کیونکہ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ جن کہ دیکھ کر لوگوں کو اللہ یاد آجائے وہ دنیا کا خوش نصیب ترین انسان ہے۔ میں اللہ کی مشکور ہوں کہ اس نے مجھے دنیا کے خوش نصیبوں میں سے بنایا وہ معذور افراد کے جسمانی علاج کے ساتھ ساتھ روحانی تربیت نیت بھی بے حد ضروری ہے تاکہ وہ لوگوں کے منفی رویوں کے منفی رویوں سے مثبت پیغام لے سکیں۔

اپنی ہمت خود بندھ سکیں۔

☆☆☆

صحت نہیں وزن کم کریں

نوشین ناز

- یاد رکھیے! ہر کھانے والی چیز آپ کے لیے نہیں بنی
- یہ 28 احتیاطیں آپ کی زندگی کو آسان کر سکتی ہیں
- دعوتوں میں پکے ہوئے "میٹھے" کی بجائے میٹھے پھل کھانا بہتر ہے
- مایونیز کھانا چھوڑ ہی دیں تو بہتر ہے
- فروٹ چاٹ پہ لال شربت ہرگز نہ ڈالیں
- شیرے سے بھرے ہوئے مربے آپ کو مشکل میں ڈال دیں گے

زندگی بہت سادہ ہے اور یہی خوب صورتی اس کی خوب صورتی ہے۔ اسے سادگی سے ہی گزارنا چاہیے تب ہی یہ صحت مند رہتی ہے۔ صحت مند زندگی گزارنے کے لیے کچھ سادہ سے اصول یاد رکھیں جو وزن کم کریں گے صحت نہیں۔

1۔ فرائی کی ہوئی چیزیں کھانے سے پہلے کاغذ یا ٹشو پیپر پر رکھیں تاکہ فالتو چکنائی اس میں جذب جائے۔

2۔ انڈہ چکنائی میں نہ بنائیں، نان اسٹک پین میں بنائیں۔

3۔ پراٹھا کھانے کو دل چاہے تو اندر گھی نہ لگائیں۔

4۔ پی نٹ بٹر سے پرہیز کریں۔ اس کے اندر نہ صرف بہت سی کیلوریز ہیں بلکہ چکنائی بھی کافی مقدار میں ہوتی ہے۔

5۔ ٹوسٹ پر شوگر فری مارملیڈ لگا کے کھانے کو معمول بنائیے۔

6۔ پنیر کے ٹکڑے بہت باریک بنائیں تاکہ شوق بھی پورا ہو جائے اور ضرورت بھی۔

7۔ دودھ سے ملائی ضرور اتارا کریں (خود کھانے کے لیے نہیں)

8۔ فروٹ چاٹ پر چینی کا شربت ہرگز نہ ڈالیں

بلکہ کینولا یا مالٹے کا جوس استعمال کریں۔

9۔کسی دعوت میں جائیں تو پکے ہوئے ''میٹھے'' (سویٹ ڈش) کے بجائے تازہ پھل استعمال کریں۔

10۔گوشت سے ساری چربی اتار کر تیار کریں یا کروائیں۔

11۔کھانے میں مچھلی اور مرغی کا استعمال زیادہ کریں۔

12۔کم کیلوریز والی مایونیز استعمال کریں بلکہ اگر مایونیز کا استعمال ترک کردیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔

13۔ بسکٹ اور کیک پیسٹری یعنی بیکری کی ساری اشیا سے ہاتھ کھینچ لیں۔

14۔سادہ سوپ پیا کریں۔ کریمی سوپ نہ پئیں۔

15۔مربے وغیرہ نہ کھائیں (کھانا ضروری ہو تو دھوکر)۔ یہ مٹھاس کے شیرے سے بھرے ہوتے ہیں۔ آپ کو بڑی مشکل میں ڈال دیں گے۔

16۔کبھی کبھار ڈائیٹ کوک لے سکتے ہیں لیکن اسے روٹین نہ بنائیں۔

17۔اگر کبھی کبھار کیک کھانے کو دل چاہے تو آئسنگ اور کریم اتار کر کھائیں۔

18۔ایسے لوگوں سے دوستی رکھیں جنھیں اسمارٹ رہنا پسند ہو۔ ہر مہینے آپس میں ٹارگٹ کر کے کچھ وزن گرائیں۔

19۔زیادہ ڈھیلے کپڑے نہ استعمال کریں۔

20۔ہمیشہ چھوٹی پلیٹ کا استعمال کریں۔

21۔روسٹ کی بجائے بیک (Bake) کیے ہوئے کھانے کھائیں۔

22۔اس حقیقت کو تسلیم کرلیں کہ آپ کا وزن زیادہ کھانے سے بڑھا ہے۔

23۔ٹی وی کے سامنے بیٹھ کر کھانا نہ کھائیں کیونکہ اس طرح کھانا زیادہ کھایا جاتا ہے۔

24۔روزانہ باقاعدگی سے کم از کم 45 منٹ تیز واک کریں۔

25۔گھر میں سیڑھیاں ہوں تو زیادہ استعمال کریں۔

26۔ٹہلنا، تیرنا، سائیکل چلانا بھی وزن کم کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ اچھی صحت میں معاونت کرتے ہیں۔

27۔سب سے بڑی بات نماز باقاعدگی سے پڑھیں۔ مکمل رکوع وسجود کریں۔ وزن آپ کا ہمیشہ اعتدال میں رہے گا۔

28۔ایسی قدرتی غذائیں استعمال کریں جو آرگینک ہوں، جن میں کاربوہائیڈریٹس زیادہ ہوں۔ یہ گندم اور مکئی کے دلیے، بارلے (جو) دودھ اور پھلوں سے ملتے ہیں۔

گوشت:

کلیجی، مرغی کا سوپ، مچھلی اور دوسرے سرخ گوشت، ان میں وٹامن اے، بی12، ڈی اور ای کے علاوہ تھیامن، فولیٹ، فولاد اور جست موجود ہے۔ کلیجی ایسی پروٹین ہے جو مہنگی نہیں اور بآسانی دستیاب بھی ہے۔ مچھلی میں ضروری فیٹی ایسڈز کے علاوہ کیلشیم کی وافر مقدار پائی جاتی ہے۔

سبزیاں:

پالک، گوبھی اور ہر وہ سبزی جس کے ساتھ سبز پتے ہوں اس قدر مہنگی نہیں ہیں کہ قوت خرید سے باہر ہوں۔ ان میں بیٹا کیروٹین، وٹامن ای، بی6 اور فولیٹ موجود ہیں۔

اس کے علاوہ کیلشیم اور میگنیشم بے حد مفید اجزا شامل ہیں۔ جڑوں والی سبزیاں آلو، شلجم، گاجر، مولی میں بیک وقت وٹامن سی، کاربوہائیڈریٹس اور فائبر شامل ہیں۔

ڈیری مصنوعات:

ڈیری مصنوعات میں دودھ، دہی، پنیر مکمل پروٹین

بھی ہیں اور کیلشیم کے علاوہ وٹامن اے، بی12، فولیٹ، ریبوفلاوین اور نیاسین شامل ہیں۔ اگر کسی کو بلڈ پریشر زیادہ ہو تو ان غذاؤں کو ڈاکٹر کے مشورے سے استعمال کرنا چاہیے۔ ورنہ زیادہ نقصان کا باعث بن سکتی ہیں۔ میں اس لیے بار بار یاد دلاتی ہوں کہ ہر کھانے والی ہر چیز پر خواہش مند اور بھوکے پیٹ کے لیے نہیں ہوتی۔ اپنے ڈاکٹر اور ماہر غذائیات سے پوچھ لینا چاہیے۔

سٹرس فروٹس میں اسٹرابیری، مالٹے، سنگترے وٹامن سی کا بہترین ذریعہ ہیں۔ ناشپاتی اور سیب میں ریشہ (فائبر) موجود ہے جو خون میں کولیسٹرول کی سطح کو کم کرتا ہے۔

کیلے میں پوٹاشیم اور کاربوہائیڈریٹس دونوں اجزا موجود ہیں۔ روزانہ کوئی ایک چھوٹا ساڑھے تین اونس یا 100 ملی گرام تک کھانا ضروری ہے۔

پھل بطور خاص سٹرس فروٹس

سٹرس فروٹس میں اسٹرابیری، مالٹے، سنگترے وٹامن سی کا بہترین ذریعہ ہیں۔ ناشپاتی اور سیب میں ریشہ (فائبر) موجود ہے جو خون میں کولیسٹرول کی سطح کو کم کرتا ہے۔ کیلے میں پوٹاشیم اور کاربوہائیڈریٹس دونوں اجزا موجود ہیں۔ روزانہ کوئی چھوٹا ساڑھے تین اونس یا 100 ملی گرام تک کھانا ضروری ہے۔

انڈے

مکمل پروٹین کا ایک اور جزو جس میں وٹامن اے بھی شامل ہے۔ کولیسٹرول بڑھنے کا اندیشہ لاحق ہو تو ایک ہفتے میں 3 یا 4 سے زیادہ انڈے نہیں کھانے چاہئیں۔

دالیں، پھلیاں، مٹر

دالیں سستی لیکن قیمتی پروٹین کی حامل ہوتی ہیں۔ لیکن چونکہ اب مہنگائی نے دالوں کی قیمت میں اضافہ کر دیا ہے۔ لہٰذا تھوڑی مقدار میں سہی، مگر غذا کا جزو بنا لینا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ اناج سے بنے پاستا، چاول، مٹر اور پھلیاں نظام ہاضمہ بہتر بناتے ہیں۔ مٹر اور پھلیاں نظام ہاضمہ بہتر بناتے ہیں۔ مٹر، پھلیاں، سلاد، چاولوں اور سالن میں بھون کر یا Bake کر کے شامل کی جاسکتی ہیں یہ غذائیت سے پُرخوراک ہوسکتی ہے۔ میں نے ان سب غذاؤں میں غذائیت کا ذکر کیا ہے لیکن میں نے کوئی گروپ ایسا نہیں بتایا جس میں کریم کیک، پیسٹری، بوتلیں، بسکٹ، Chips، سلانٹیر، چاکلیٹ، پیزا شوارما وغیرہ میں کتنی غذائیت ہو گی؟ غذا کو جب شکل بدل کر پکایا جاتا ہے تو اس میں غذائیت کا عنصر بہت کم اور Bad Calories بڑھ جاتی ہیں۔ جو ہمارے جسم کی ساخت کو تباہ کر دیتی ہیں ہم بے ڈول ہو جاتے ہیں۔ جو اندر سے قوت مدافعت ختم کر دیتی ہیں اور ہم بیمار پڑ جاتے ہیں۔ یہی بیماری ہمیں نہ دین کا رہنے دیتی ہے اور نہ دنیا کا.....

ذائقہ کی تلاش:

یہ وہ نئی ہوس ہے جو انسان کافی زمانہ کباڑا کر رہی ہے اور ختم ہونے میں نہیں آرہی۔ ہم سادہ غذا میں ذائقہ اور

انجوائے منٹ محسوس نہیں کرتے ہیں۔ جب کہ Complicated غذاؤں میں ہمیں لطف اور ذائقہ ملتا ہے۔

ہمارے پیارے نبی ﷺ کا دسترخوان سادہ اور مختصر ہوتا تھا۔ ہم ان کی امت ہیں اور ہماری میزوں پر عجیب غریب چیزیں آچکی ہیں۔ بچے نوڈلز کھا رہے ہیں۔ کیا چاول پاکستان میں ختم ہو گئے ہیں جو بچوں کو نوڈلز کھلانا اہم ہو گیا ہے۔ پیاری ماؤں کو چاہیے کہ بچوں کو پیار سے دودھ چاول دیں ہلکی براؤن شکر ڈال کر، ان کے ساتھ دشمنی نہ کریں نوڈلز کھلا کھلا کر۔ برگر کھلانا ہے کیا روٹی یا پراٹھا میں کباب بنانا نہیں آتا؟

ضرور برگر کی Patty استعمال کرنی ہے؟ اس کے بجائے گھر کی گندم استعمال کریں۔ اسی طرح باہر سے چاکلیٹ لا کر بچوں کو کھلایا جا رہا ہے۔ کیا آپ اچھا سا تازہ سلاد بنا کر بچوں کو نہیں کھلا سکتیں۔

بچوں کو مایونیز لگا کر بریڈ روٹی کھلا رہی ہیں کیا آپ بچوں کو دیسی گھی کی، چوری نہیں بنا کر دے سکتیں؟ اس لیے Sorry to say!..... مجھے کہنے دیجیے

کاہل ماؤں کے ماڈرن بچے، کُند ذہن اور موٹے ہی نہیں، ضدی بھی ہیں۔ کیونکہ ان میں غذائیت کی کمی اور طرح طرح کا انوکھا فوڈ کھا کر شکر پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ میں تو علاج کرتی جاؤں گی لیکن ہمیں خود کو بدلنا ہو گا۔ ہمیں خود محبت کر کے بچوں کو سادہ غذا اور گھر کے کھانے کی طرف لانا ہو گا اور یہ ہمیں اس وقت نہیں کرنا جب ڈاکٹر نوشین کے کلینک آ کر پلان لکھوانا ہے بلکہ آج ہی کرنا ہے۔ جب میں آج ہی کہہ رہی ہوں تو پلیز پیاری ماؤں! انوکھے ذائقوں اور انوکھی بیماریوں سے اپنے اہل خانہ کو بچائیں یہ میری طرف سے ہر خاتون خانہ کے لیے مفید مشورہ ہے۔ مگر کیا کریں ہماری قوم بغیر فیس کے

☆ فالودہ منگوا کر دیا جا رہا ہوتا ہے۔ کیا آپ بادام، الائچی پیس کر سردائی کی طرح دودھ بچوں کو نہیں دے سکتیں؟

☆ آئس کریم منگوا کر کھلا رہی ہیں کیا آپ برف اور پھل ڈال کر تازہ ملک شیک نہیں بنا سکتیں؟

☆ باہر سے کھیر ربڑی آ رہی ہے کیا آپ بچوں کو گھر میں کھیر یا سویاں بنا کر نہیں کھلا سکتیں؟

مشوروں کو بھی قیمتی نہیں سمجھتی۔

سوال: میرا نام اجمل علی ہے میں کوٹ عبدالمالک ڈسٹرکٹ شیخوپورہ میں رہتا ہوں۔ عمر 37 سال ہے، شادی شدہ ہوں، کام میرا آفس کا ہے۔ قد 5.5 فٹ ہے، وزن 74 کلوگرام ہے، 36 انچ ہے میرا پیٹ بہت بڑھ گیا ہے۔ پلیز میرا وزن کم کرنے کے لیے کوئی ڈائیٹ پلان دیں۔

جواب: اجمل بھائی آپ نے کھانے پینے کی روٹین نہیں بتائی ہے۔ ایسے میں ڈائیٹ پلان کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ آپ Chair exercise کیا کریں جس میں کرسی کے آگے بیٹھ کر اپنی کمر سے پیٹ کو Hold کرنا ہے۔ کم از کم پانچ کی گنتی پھر پیٹ کو Relax چھوڑ دیں۔ یہ ورزش کم از کم دن میں 300 بار دہرائیں۔ پھر foot ورشپ کی ورزش کریں۔ پیروں کو کندھوں کے Distance کے Equal کھول لیں اور پھر جھک کر ان کو چھوئیں۔ پہلے پہل 100 بار Straight angle میں چھوئیں پھر آہستہ آہستہ رائٹ اور لیفٹ کی بھی روٹین بنائیں۔ اس کے علاوہ کھڑے ہو کر Stationary Walking کرنا بھی آپ کے لیے بہترین ورزش ثابت

ہو سکتی ہے۔ آپ کو آفس میں جب وقت ملے آپ سیشنری واک کریں۔ یہ بہت بہترین ہے وزن کم کرنے کے لیے۔ ہر بڑے کھانے کے بعد گرین ٹی یا Lemon grass لیں۔ رات کا کھانا کم از کم تین ماہ تک ایک گلاس دودھ اور ایک فروٹ پر محدود کر لیں اور ساتھ تین بادام لے لیں۔ سونے سے پہلے اسپغول کا چھلکا لیں، نماز میں رکوع اور سجدے پر توجہ دیں۔

سوال: میرا نام پروفیسر زرقا خالد ہے اور راولپنڈی سے ہوں۔ میں نے گزشتہ سال آپ سے ڈائیٹ پلان منگوایا تھا لیکن شروع اب کیا ہے۔ وزن 77 کلو تھا اور 45 دنوں میں 64 کلوگرام ہو گیا ہے۔ میں بہت خوش ہوں اور آپ کے لیے دعا گو ہوں۔

جواب: مجھے بہت خوشی ہے آپ کی اپنی ہمت اور اللہ جی کی نوازش سے آپ کا وزن کم ہوا۔ لیکن پلیز ایک پلان بہت عرصہ نہیں کرتے اسے ہر ماہ ضرور تبدیل کرواتے ہیں۔ پانی ہر کھانے سے پہلے ضرور لیں، ایک Multivitamin ٹیبلٹ ضرور لیں، اگر آپ کے پلان میں کاربوہائیڈریٹس نہیں ہیں تو دوپہر کے کھانے میں ایک روٹی فور گرین آٹے کی ضرور بڑھا لیں۔ پلان ایک ماہ کے لیے بے شک وہی رہنے دیں، خوش رہیں اور دعاؤں میں یاد رکھیں۔

سوال: آپ کا کالم مجھے بہت پسند ہے آپ لوگوں کی اتنی مدد کرتی ہیں۔ میرا نام ماہین ہے میرا تعلق لاہور ہی سے ہے۔ میرا وزن 45 سے 49 کلوگرام تک رہتا ہے اور عمر 18 سال ہے۔ میں روزانہ ایک روٹی سے زیادہ نہیں کھاتی ہوں۔ لیکن باہر کی چیزیں Fast food اور Junk food شوق سے کھاتی ہوں۔ وزن کم ہونے کی وجہ سے بہت کمزوری ہے۔ پندرہ منٹ سے زیادہ ورزش نہیں کر سکتی اور پھر مجھے کسی ورزش کا علم بھی نہیں ہے۔ زیادہ مسئلہ یہ ہے کہ میرا پیٹ اور Hips دونوں بہت بڑھے ہوئے ہیں جو بہت بڑا لگتا ہے۔ میرے نئے کپڑے پہننے کو دل نہیں کرتا، ہر وقت اپنے آپ پر رونا آتا ہے۔ قد بھی بہت کم ہے، اوپر سے اور موٹی ہو گئی ہوں۔ بہت بری لگتی ہوں، ورزش شروع کرتی ہوں تو Monthly Periods کی وجہ سے ایک ہفتے کے لیے چھوٹ جاتی ہے پھر روٹین میں لانا مشکل ہو جاتا ہے۔ بال بھی بہت گرتے ہیں۔ باجی! میرا مر جانے کو جی چاہتا ہے۔ میں مر جاؤں گی۔

آپی! میرے لیے کوئی ڈائیٹ پلان بتا دیں اور ورزش اور ان کی Timing بھی بتا دیں۔ پلیز مجھے جلدی بتا دیں آج کل چھٹیاں ہیں اور میں کنٹرول کر لوں گی۔

جواب: جگہ نہیں ہے اس لئے انشاء اللہ اگلے ماہ۔

خوشخبری:۔

مسز احمد، شیخوپورہ کو اللہ تعالیٰ نے تین سال بعد اولاد کی نعمت سے نوازا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اولاد کی خوشیاں دیکھنا نصیب کرے۔ آپ Folid Acid، اور کیلشیم برابر اور باقاعدگی سے لیں۔

محمد علی۔ سرگودھا

78 سے 72 کلو پر آئے مبارک ہو۔ نئے پلان کے لئے رابطہ کریں۔

جویریہ کراچی سے 98 سے 92 آئی ہیں۔ آپ کو بھی مزید پلان اور مسلسل محنت کی ضرورت ہے۔

مسز ریحان سیالکوٹ سے اللہ نے آپکو پانچ سال بعد اولاد کی نعمت سے نوازا اس خوشی کے موقع پر مجھے اور میری اولاد کے لیے دُعا کیجیے گا کہ ہم سب کو اللہ جی کی خوشنودی حاصل ہو۔

قصہ کوئز1

ناول نویس، ڈراما نگار۔ اصل نام قدسیہ۔ 28 نومبر 1928ء کو فیروز پور میں پیدا ہوئیں۔ 1950ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے (اردو) کی ڈگری لی۔ تکمیل تعلیم کے بعد خانہ داری کا فیصلہ کیا اور مشہور افسانہ نگار اور ڈراما نویس سے شادی کی۔ دونوں نے مل کر ادبی جریدہ بھی جاری کیا جو چند سال کامیابی سے چلتا رہا۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لیے ڈرامے لکھے۔ ہندو پاک کے معیاری ادبی جرائد میں آپ کے افسانے چھپے اور جلد ہی مقبولیت عامہ حاصل کی۔ آپ کی تصانیف یہ ہیں۔ (ناول) ایک دن، پرواز، شہر بے مثال، موم کی گلیاں، چہار چمن، راجا گدھ (افسانوی مجموعے)، ناقابل ذکر، بازگشت، امربیل، کچھ اور نہیں، آتش زیرپا (ڈرامے)، آدھی بات، دوسرا قدم، حوا کے نام، تماثیل۔ آپ نے قدرت اللہ شہاب کے بارے میں ایک تاثراتی کتاب بھی لکھی ہے۔

(الف) دونوں نے کون سا ادبی جریدہ جاری کیا تھا؟

(ب) ان کا پورا نام لکھیے؟

قصہ کوئز2

اسکواش کے کھلاڑی پشاور کے قریب گاؤں نواں کلی میں پیدا ہوئے، جہاں سے ہاشم خان، اعظم خان، روشن خان اور جہانگیر خان جیسے عالمی شہرت یافتہ اسکواش کے چیمپئن ابھرے ہیں۔ انھوں نے آنکھ کھولی تو گھر کے سبھی مردوں کو اسکواش کھیلتے دیکھا۔ اس کے بھائی محب اللہ اور اطلس خان نے اس کی حوصلہ افزائی کی اور وہ آٹھ سال کی عمر ہی سے اسکواش کے میدان میں اتر پڑا۔ انھوں نے آٹھویں دہائی کے وسط میں بین الاقوامی اسکوائش کی دنیا میں قدم رکھا اور کئی بین الاقوامی کھلاڑیوں کو یکے بعد دیگرے شکست دیتے چلے گئے۔ 1985ء میں ہانگ کانگ میں ہونے والی ایشین جونیئر چیمپئن شپ حاصل کی۔ مصر میں ہونے والی عالمی چیمپئن شپ میں شرکت کی اور پاکستان کو فتح سے ہمکنار کیا۔ 1987ء میں ہانگ کانگ اوپن اسکوائش میں انھوں نے عالمی چیمپئن کو پہلی مرتبہ شکست دی۔

(الف) اسکوائش کے کس کھلاڑی کا ذکر ہے؟

(ب) 1987ء میں جس عالمی چیمپئن کو شکست دی وہ کون تھا؟

قصہ کوئز3

اس کے لیے فیتا ایک یکساں چوڑی سبز و سفید ریشمی پٹی کا ہوتا ہے۔ نقد انعام کے علاوہ یہ اعزاز حاصل کرنے والوں کو ماہوار وظیفہ بھی ملتا ہے۔ 1965ء کی پاک بھارت جنگ میں 186 فوجی افسروں نے یہ تمغہ حاصل کیا۔ یہ اعزاز حاصل کرنے والوں میں شہدا بھی شامل تھے۔ اس جنگ کے بعد بھی بہت سے افسروں نے میدان جنگ میں شجاعت و بہادری کے کارناموں پر یہ اعزاز حاصل کیا۔

(الف) اس فوجی تمغے کو کیا نام دیا جاتا ہے؟

(ب) 1965ء کی جنگ میں یہ تمغہ حاصل کرنے والوں کی تعداد کیا تھی؟

انعامات کے لیے تعاون

منشورات

خوبصورت اور معیاری کتب، کم قیمت اعلیٰ معیار

منصورہ، ملتان روڈ لاہور

042-35434909

042-35425356

ماہِ رواں کی شخصیات

محمد خلیل چودھری

اس معلوماتی سلسلہ کو بہت محنت سے مرتب کیا گیا ہے۔ یہ آپ کے لیے اہم معلومات کا ماخذ ثابت ہوگا

ماہ جولائی میں پیدا ہونے والی اہم عالمی و ملکی شخصیات

یکم جولائی 1918ء پیر محمد کرم شاہ الازہری (قانون دان، مترجم و مفسر قرآن)
یکم جولائی 1948ء ڈاکٹر سہیل احمد خان (مشہور نقاد)
یکم جولائی 1910ء پروفیسر احمد علی (اردو، انگریزی ادیب)
یکم جولائی 1915ء مجروح سلطانپوری (اردو شاعر)
یکم جولائی 1961ء لیڈی ڈیانا (برطانوی شہزادے چارلس کی سابقہ اہلیہ)
2 جولائی 1883ء فرانز کافکا (چیکوسلواکیہ کا مشہور ادیب)
2 جولائی 1953ء احمد سہیل (اردو نقاد)
2 جولائی 1925ء پیٹرک لوممبا (کانگو کے سیاسی رہنما)
3 جولائی 1907ء علامہ علاؤالدین صدیقی (عالم دین، خطیب، معلم)
3 جولائی 1952ء وسیم حسن راجہ (مشہور ٹیسٹ کرکٹر)
4 جولائی 1907ء عبدالستار پیرزادہ (قانون دان، سابق وفاقی وزیر)
4 جولائی 1968ء اسد رضوی (شطرنج کے پاکستانی کھلاڑی)
5 جولائی 1905ء چودھری محمد علی (پاکستان کے سابق وزیراعظم)
5 جولائی 1907ء سید امجد علی (سیاستدان، سفارتکار، ماہر مالیات)
5 جولائی 1959ء حنیف خان (ہاکی کے نامور کھلاڑی)
5 جولائی 1971ء ڈاکٹر عامر لیاقت حسین (ٹی وی اینکر)
6 جولائی 1935ء دلائی لامہ (تبت کے روحانی پیشوا)
6 جولائی 1930ء عبدالستار افغانی (بابائے کراچی، سابق میئر کراچی)
7 جولائی 1921ء حافظ سراج الحق (معروف نعت گو شاعر)
7 جولائی 1926ء احم پرویز (منفرد مصور)
8 جولائی 1913ء اقبال عظیم (مشہور اردو شاعر)
8 جولائی 1929ء دلاور فگار (اردو کے مشہور مزاح گو شاعر)
9 جولائی 1908ء علامہ رشید ترابی (شیعہ عالم دین، ذاکر)
9 جولائی 1819ء ایلیس ہو (سلائی مشین کا موجد)
9 جولائی 1929ء شاہ حسن دوئم (مراکش کے سابق حکمران)
10 جولائی 1949ء سنیل گواسکر (مشہور بھارتی کرکٹر)
11 جولائی 1887ء مولانا حسین احمد مدنی (عالم دین)
11 جولائی 1912ء سید احتشام حسین (ممتاز نقاد)
12 جولائی 100 ق م جولیس سیزر (روم کا مشہور حکمران)
12 جولائی 1997ء ملالہ یوسف زئی (سوات کی مشہور طالبہ)
13 جولائی 1926ء نواب محمد اکبر خان بگٹی (بلوچستان کے سابق گورنر)
14 جولائی 1928ء انور جلال شمزا (ممتاز مصور)
14 جولائی 1962ء رمیض راجہ (پاکستانی کرکٹر کمینٹیٹر)
15 جولائی 1895ء راجہ غضنفر علی خان (تحریک پاکستان کے رہنما)
15 جولائی 1936ء مجتبیٰ حسین (معروف مزاح نگار، ممتاز نقاد)
17 جولائی 1955ء تاجدار عادل (اردو شاعر، ٹی وی پروڈیوسر)
18 جولائی 1935ء سرفراز احمد رفیقی (جنگ 1965ء کے فضائی ہیرو)
18 جولائی 1949ء ڈینس للی (عظیم آسٹریلوی فاسٹ باؤلر)
18 جولائی 1918ء نیلسن منڈیلا (جنوبی افریقہ کے نامور رہنما)
19 جولائی 1921ء میر خلیل الرحمٰن (جنگ اخبار کے بانی)
19 جولائی 1894ء خواجہ ناظم الدین (سابق گورنر جنرل پاکستان)
21 جولائی 1816ء پال جولیس رائٹر (خبر رساں ایجنسی رائٹر کا بانی)
21 جولائی 1919ء پروفیسر خورشید الاسلام (معروف نقاد، معلم)
22 جولائی 1914ء میجر طفیل محمد شہید (نشان حیدر)
22 جولائی 1923ء مکیش (مشہور گلوکار)
22 جولائی 1969ء افضل خان عرف جان ریمبو (فلمی اداکار)
24 جولائی 1947ء ظہیر عباس (معروف کرکٹر ایشین بریڈمین)
25 جولائی 1875ء جم کاربیٹ (مشہور شکاری)
26 جولائی 1856ء جارج برنارڈ شا (ادیب، ڈراما نگار)
26 جولائی 1956ء آصف علی زرداری (صدر پاکستان)
26 جولائی 1928ء ابن صفی (اردو کے مشہور جاسوسی ناول نگار)
27 جولائی 1963ء نوید انجم (پاکستان کے سابق ٹیسٹ کرکٹر)
29 جولائی 1321ء خواجہ بندہ نواز گیسو دراز (صوفی بزرگ)
30 جولائی 1907ء ماہر القادری (شاعر، ادیب)
30 جولائی 1880ء منشی پریم چند (مشہور اردو افسانہ نگار)
31 جولائی 1893ء محترمہ فاطمہ جناح (مادر ملت)
31 جولائی 1954ء چودھری نثار علی (معروف سیاستدان)

لیڈی ڈیانا

ابن صفی

جارج برنارڈ شا

چودھری محمد علی

ماہ جولائی میں وفات پانے والی اہم عالمی و ملکی شخصیات

یکم جولائی 1489ء سلطان بہلول لودھی (ہندوستان میں لودھی خاندان کا بانی)
یکم جولائی 1981ء نصیر انور (اردو ادیب، صداکار)
2 جولائی 1982ء کامل القادری (ممتاز شاعر اور ادیب)
2 جولائی 1778ء روسو (فرانس کا مشہور فلسفی اور انشا پرداز)
2 جولائی 1603ء باقی باللہ (سلسلہ نقش بندیہ کے بانی)
3 جولائی 1979ء عالم لوہار (لوک گلوکار، عارف لوہار کے والد)
3 جولائی 1934ء ریاض خیر آبادی (اردو کے نامور شاعر)
4 جولائی 1934ء مادام کیوری (پولش نژاد فرانسیسی کیمیادان)
4 جولائی 1991ء مرزا سلطان بیگ (نظام دین) (ریڈیو پاکستان کے فنکار)
5 جولائی 1986ء محمد طفیل (نقوش کے مدیر)
5 جولائی 2003ء شبیر شاہ (اسلام آباد کے بزرگ صحافی)
6 جولائی 1405ء حضرت اشرف جہانگیر سمنانی (مشہور صوفی بزرگ)
6 جولائی 1989ء میر بشیر (معروف دست شناس، ادیب)
6 جولائی 2003ء حمید کاشمیری (معروف افسانہ نگار، ڈراما نگار)
7 جولائی 1930ء سر آرتھر کانن ڈائل (شرلک ہومز کے خالق)
7 جولائی 2008ء خاطر غزنوی (نامور شاعر)
7 جولائی 2005ء رئیس احمد (ممتاز صحافی)
8 جولائی 1994ء کم ال سنگ (عوامی جمہوریہ کوریا کے صدر)
8 جولائی 2009ء شمیم اعجاز (معروف براڈکاسٹر)
8 جولائی 2005ء مرزا واجد علی بیگ ایڈووکیٹ (ممتاز قانون دان)
9 جولائی 1967ء محترمہ فاطمہ جناح (مادر ملت)
9 جولائی 1850ء علی محمد باب (ایران کی بابی تحریک کے بانی)
9 جولائی 1987ء پروفیسر محمد وارث میر (صحافی اور دانشور)
10 جولائی 1987ء ماسٹر افضال حسین (پاکستان کا پہلا خیاط پرچم تیار کرنے والے)
10 جولائی 1983ء عبدالنبی کانجو (سابق رکن قومی اسمبلی)
11 جولائی 2008ء محمود علی (ریڈیو اور ٹی وی کے نامور فنکار)
11 جولائی 2001ء قتیل شفائی (نامور شاعر)
11 جولائی 2001ء استاد سلامت علی خان (کلاسیکی موسیقار)
12 جولائی 1975ء ذوالفقار علی بخاری (ریڈیو پاکستان کے پہلے ڈی جی)
13 جولائی 1969ء محمد شہید اللہ (نامور لسانیات، شاعر، ادیب)
13 جولائی 1980ء ماسٹر نثار (برصغیر کی پہلی متکلم فلم آرا کے ہیرو)
13 جولائی 1986ء خالد سہگل (ممتاز صنعت کار)
14 جولائی 1958ء شاہ فیصل دوئم (عراق کے بادشاہ)
14 جولائی 1986ء حسن علی عبدالرحمٰن (ممتاز ماہر تعلیم)
15 جولائی 1983ء اختر حسین (مغربی پاکستان کے سابق گورنر)
15 جولائی 1904ء انتون چیخوف (نامور روسی ناول نگار، ڈراما نویس)
15 جولائی 2009ء کے کے عزیز (نامور مورخ)
15 جولائی 1986ء ایوب رومانی (اردو کے ممتاز شاعر)
16 جولائی 1918ء نکولس دوم (آخری زار روس)
16 جولائی 2004ء علامہ رفیق قادری (معروف عالم دین)
17 جولائی 1790ء ایڈم اسمتھ (ماہر معاشیات)
17 جولائی 2004ء البیلا (اسٹیج اور ٹی وی کے معروف فن کار)
19 جولائی 940ء ابن مقلہ (عالم اسلام کے عظیم خطاط)
19 جولائی 1927ء سر گنگا رام (سماجی شخصیت، گنگا رام ہسپتال کے بانی)
19 جولائی 1943ء مولانا اشرف علی تھانوی (برصغیر کے نامور عالم دین)
20 جولائی 1937ء مارکونی (ریڈیو کا موجد)
21 جولائی 1210ء سلطان محمود غوری (نامور فاتح)
22 جولائی 2008ء خالد شہنشاہ (بینظیر قتل کیس کے اہم گواہ)
24 جولائی 1986ء قدرت اللہ شہاب (نامور سول سرونٹ اور ادیب)
25 جولائی 2008ء شہریار قدوسی (ممتاز براڈکاسٹر)
25 جولائی 2003ء اے بی ایوب بخش اعوان (سابق سول سرونٹ)
26 جولائی 1982ء خدیجہ مستور (اردو کی نامور افسانہ نگار)
26 جولائی 1980ء ابن صفی (نامور جاسوسی ناول نگار اور شاعر)
27 جولائی 1948ء کیپٹن محمد سرور شہید (نشان حیدر)
27 جولائی 1959ء مولانا مرتضیٰ احمد خان میکش (ممتاز صحافی، مدیر)
27 جولائی 1980ء محمد رضا شاہ پہلوی (ایران کے سابق شہنشاہ)
28 جولائی 1974ء محمد ادریس کاندھلوی (نامور عالم دین)
28 جولائی 1974ء پیر بہادر شاہ ہاشمی (روحانی اور سیاسی شخصیت)
30 جولائی 1989ء الحاج دلاور خانجی (سابق گورنر سندھ)
31 جولائی 855ء امام حنبلؒ احمد بن (فقہ حنبلی کے بانی)
31 جولائی 2003ء سردار محمد ابراہیم خان (آزاد کشمیر کے پہلے صدر)
31 جولائی 1999ء مرزا ادیب (اردو کے افسانہ نگار، نقاد، مدیر)

■■■

کیپٹن سرور شہید

البیلا

فاطمہ جناحؒ

قتیل شفائی

آیئے .....! کتابوں کی صحبت میں کچھ وقت گزاریئے

زندگی کی سب سے قیمتی متاع اچھی کتاب سے زیادہ کچھ اور نہیں

کتابوں کی کہکشاں

کتابوں پر تبصرے کے روایتی کالم سے تھوڑا مختلف

غلام سجاد

جینے کے ہنر

موجودہ دور میں نوجوانوں کی کافی تعداد ڈگریاں ہاتھ میں لے کے سڑکوں کی خاک چھانتی ہے، یہ وہ نوجوان ہیں جنھیں اپنی تعلیم جاری رکھتے وقت کوئی اچھا گائیڈ نہیں ملا تھا۔ انھیں کسی نے یہ نہیں بتایا تھا کہ آپ جس میدان میں اپنے جوہر دکھاتے ہیں یا پھر جس کام

میں آپ کی دلچسپی زیادہ ہے اس شعبہ سے متعلق ڈگری بھی حاصل کی جائے، اس کے علاوہ کافی جوان ایسے ہیں جو معاشی مسائل کی بنا پر تعلیم جاری رکھنے سے قاصر ہیں، ان دونوں قسم کے نوجوانوں کے لیے عبدالاسلام سلامی کی کتاب ''جینے کے ہنر'' مشعل راہ ہے، یہ کتاب نوجوانوں کو صرف مستقبل کا راستہ ہی نہیں دکھاتی بلکہ منزل تک پہنچنے کے طریقے بھی بتاتی ہے۔ آپ کس قسم کے طالب علم ہیں، آپ کے مستقبل کے لیے کس قسم کی تعلیم اور کون سا کام بہتر ثابت ہوگا، مختلف پیشوں میں سے صرف اسی پیشے کا چناؤ کیسے ممکن ہے جو آپ کے لیے سودمند ہے، آپ کے اندر موجود مہارتیں اور ان کا عملی اظہار کیسے ممکن ہے؟ نوجوانوں کے مختلف قسم کے مسائل، الجھنیں، پریشانیاں اور بے راہروی تک کا حل بھی اس کتاب میں موجود ہے، کسی بھی نوجوان میں خود اعتمادی کا عنصر، اس کے مستقبل کو کس قدر تابناک بنا سکتا ہے اور خود اعتمادی کس درجے تک ضرورت ہوتی ہے۔ اس سب سے متعلق تفصیل کتاب میں درج ہے۔ اپنی نوعیت کی یہ انوکھی کتاب تمام پڑھے لکھے نوجوانوں وہ جو ملازمت کے حصول کے لیے سرگرداں ہیں یا وہ جو تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ملازمت بھی کرنا چاہتے ہیں۔ اس کتاب کا مطالعہ ضرور کریں۔

ناشر: قلم دوست، پوسٹ بکس نمبر 1 کراچی

صفحات: 180

جذبوں کی بازگشت اور رقصِ ابلیس

کوئی بھی شخص ہو وہ عملی طور پر اپنے اس فن میں ماہر ہوتا ہے۔ جس میں اس نے زندگی گزاری ہو اور وہ لکھنے پڑھنے کے حوالے سے بھی اپنے اسی فن میں کام کرتا ہے۔ مگر ادب ایک ایسی چیز ہے جو کسی بھی میدان کے آدمی کو اپنی طرف لبھا لیتی ہے۔ سہیل احمد فرید سہیل کی ''کلیات سہیل'' شاعری سے بھری یا ٹھونسی ہوئی کتاب نہیں ہے کہ جس میں زبردستی اشعار لکھ لکھ کر صفحے کالے کر دیئے گئے ہوں۔ بلکہ سہیل احمد فرید سہیل نے ''کلیات سہیل'' اپنی زندگی کے تجربات اور فطرت کے تقاضوں سے متاثر ہو کر دل میں ابھرنے والی خواہشوں، امیدوں اور سوچ کو نیا رنگ دیتے ہوئے صفحہ قرطاس پر لائے ہیں۔ ان کی شاعری ان کے دل کی آواز ہے اور اندر درد سموئے ہوئے ہے۔ ''کلیات سہیل'' کو جتنا توجہ سے پڑھیں گے اتنا ہی اس کی گہرائی میں اترتے چلے

جائیں گے۔ اس کتاب کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ یہ کتاب اپنے اندر ماضی قریب کی تاریخ بھی سمیٹے ہوئے ہے۔ شاعر نے بڑے خوب صورت انداز میں بیسویں صدی کے آواخر اور جنگ عظیم، مشرق و مغرب کے حالات، طاقتور اور کمزور کی کہانی اور امریکا اور اس کے حواریوں کی داستان کو بڑے خوب صورت انداز میں اپنی

شاعری کے اندر سمیٹا ہے۔

نام کتاب: جذبوں کی بازگشت اور رقصِ ابلیس (کلیات سہیل)

مصنف: سہیل احمد فرید سہیل

صفحات: 280 قیمت: 395 روپے

ملنے کا پتا: فضلی بک سُپر مارکیٹ 507/3 اُردو بازار کراچی

فون: 0321-32629724

دینی مدارس کا نظام تعلیم اور جدید تعلیمی انقلاب

محمد عرفان ندیم کی یہ کتاب موجودہ دور کی اہم ضرورت ہے۔ اس کتاب کے ذریعے انھوں نے دینی مدرسوں میں رائج نظام تعلیم، نصاب تعلیم، ان کے مسائل کی طرف توجہ دلائی ہے۔ دینی مدارس کے نظام و نصاب کو زیادہ سے زیادہ بہتر اور مؤثر بنانے کی کوششیں ایک عرصہ سے جاری ہیں اور مصنف کی یہ کوشش بھی قابل قدر ہے۔ مصنف نے اپنی اس کتاب میں اساتذہ کے لیے تربیتی کورس کی اہمیت و ضرورت، عصر حاضر کے معاشرتی تقاضوں، طبعی، جسمانی، نفسیاتی، جمالیاتی ضرورتوں، طفولیت، بچپن، سن بلوغت، ہر عمر اور سٹیج پر تعلیم کی اہمیت کو بیان کیا ہے۔ مصنف نے عملی تعلیم کو بامعنیٰ اور بامقصد بنانے کے حوالے سے بھی بتایا ہے۔ اس کے علاوہ نظام تعلیم، مقاصد تعلیم کو قرآن کی روشنی

میں بیان کیا ہے اور اس سے متعلق مسلم ماہرین تعلیم کی رائے بھی دی ہے۔ نبوی ﷺ نظام تعلیم سے لے کر پہلی اسلامی یونیورسٹی، اُموی دور، عباسی دور اور موجودہ دور کے نظام تعلیم تک کو مکمل تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اساتذہ کا اپنے شاگردوں کے ساتھ تعلق ذاتی کام اور اخلاقی احتیاط، شاگردوں سے بات کرنے میں احتیاط ہر حوالے سے متعلق موضوعات کو یہ کتاب اپنی تحویل میں لیے ہوئے ہے۔ موجودہ دور کے دینی مدارس کے نظام تعلیم، ان کے مسائل اور ان میں جدید تقاضوں کی ضرورت کے حوالے سے اس کتاب میں سب کچھ موجود ہے۔

نام کتاب: دینی مدارس کا نظام تعلیم اور جدید انقلاب

مصنف: محمد عرفان ندیم

ناشر: المشرق للنشر والتوزیع، صفحات: 235

قیمت: 200 روپے

ملنے کا پتا: دارالکتاب یوسف مارکیٹ اُردو بازار لاہور

جیسے پچھلے پہر کا خواب

نصیر حسن نیئر کی ''جیسے پچھلے پہر کا خواب'' تقریباً 9 خوب صورت مضامین پر مشتمل ایک جامع کتاب ہے۔ جس نے اردو ادب میں ایک خوب صورت پھول کی صورت اضافہ کیا ہے۔ مصنف چونکہ اپنے وطن سے

جھروکے

کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج برصغیر میں کلکتہ کے بعد طب کی تعلیم دینے والا دوسرا بڑا ادارہ ہے جو 1860ء میں قائم ہوا، اس کا نام لاہور میڈیکل کالج تھا، ادارے کی توسیع میں کنگ ایڈورڈ ہفتم کی کوششوں کا بڑا عمل دخل ہے، حتیٰ کہ ان کی وفات کے بعد بھی کنگ ایڈورڈ میموریل فنڈ قائم کیا گیا، جس سے نیلا گنبد کی موجودہ عمارت تعمیر کی گئی، دسمبر 1911ء میں اسے کنگ ایڈورڈ ہفتم کے نام سے منسوب کیا گیا۔

دور انگریزوں کے دیس میں رہے ہیں اسی لیے انھوں نے وہاں پر اپنے ساتھ بیتنے والی تمام کارگزاریاں بڑے ہی خوب صورت پیرائے میں یکجا کی ہیں، بات انھوں نے جہاں کی بھی کی، کی بڑے خوب صورت انداز میں اور دلائل کے ساتھ مگر سب سے پیاری بات یہ ہے کہ امریکا میں بیٹھ کر لکھی جانیوالی کتاب کے ماتھے پر جو جھومر سجا ہے وہ اپنے شہر لاہور کا ہے۔ کتاب کے اندر جن واقعات کا ذکر کیا گیا ہے وہ ہمارے ہی معاشرے کی کہانیاں ہیں، یہیں کہیں اردگرد، آس پاس، کہیں کچھ ہمارے اپنوں ہی کی داستانیں ہیں، جنھیں پڑھ کر ایک عجب سی کیفیت خود پہ طاری ہو جاتی ہے۔ کتاب کا ٹائٹل بہت ہی عمدہ ہے اور پرنٹنگ بھی خوب ہے جس سے پڑھنے میں آسانی ہوتی ہے۔

نام کتاب: جیسے پچھلے پہر کا خواب

مصنف: نصیر حسن نیئر

صفحات: 176، قیمت: 300 روپے

ملنے کا پتا: فرید سنز پبلشرز مکان 877 گلی 50 فیز II

بحریہ ٹاؤن اسلام آباد

دُور کا سوچنے والی دُور جا نکلی

بڑی سوچ کو مالک الملک کی طرف سے خیر پڑتی ہے یا بڑے خواب کو اس کی جانب سے زیادہ بڑی تعبیر ملتی ہے۔ فیصلہ کرنا مشکل ہے، کیونکہ 2 فروری 1995ء کو شیخ زید ہسپتال لاہور میں پیدا ہونے والی بڑی بڑی آنکھوں والی اس بچی کو جب دادا نے اپنے ہاتھوں پہ اٹھایا تو بے اختیار اُن کے منہ سے نکلا ''ارفع''۔

ہر سال فروری آئے گا اور اس میں دو تاریخ ہو گی۔ یہی ارفع کا جنم دن ہے۔ ہر بار یہ دن کافی مختلف ہو گا۔ جلنے کو سپنے ہوں گے، دل ہوں گے اور درد دھواں بن کر اس پورے گھر کو اپنے گھیرے میں لیے رکھے گا جہاں کبھی ارفع اپنی خوب صورت آنکھوں اور زندہ وجود کے ساتھ موجود ہوتی تھی۔ پھر وقت بدلے گا، گھر اور اس کے در و دیوار بدل جائیں گے۔ کچھ نئے مکین آجائیں گے، کچھ پرانے چلے جائیں گے۔ کیا ارفع کا ذکر ہر آنے والے سال کم ہوتا جائے گا۔

اختر عباس کے محبّت بھرے قلم سے رقم ہوئی کتاب ''ارفع کریم۔ دور کا سوچنے والی دور جا نکلی'' اپنے بطن میں ارفع سے متعلق وہ ساری باتیں اور حقیقتیں سموئے ہوئے ہے جو ہر پاکستانی جاننا اور سننا چاہتا ہے، ارفع کون تھی؟

وہ ہر پاکستانی کی آنکھوں کا تارا کیسے بنی؟، اسے ذہین برفی کا نام کس نے دیا؟، باپ اسے بیٹی نہیں بچہ جمہورا کیوں کہتا تھا؟، ارفع کی بل گیٹس سے ملاقات کا خوب صورت تذکرہ، اسے بل گیٹس کیسا لگا؟ اور بل گیٹس کو ارفع کریم سے مل کر حیرت کیوں ہوئی؟، ارفع کو ملنے والی 10 تولے سونے کی اینٹ کا کیا بنا؟ دس سال کی عمر میں سستا طیارہ کیسے اڑایا؟،

ارفع کے قلم سے لکھی گئی اردو اور انگلش نظمیں، ارفع کی زندگی کے آخری 20 دن اور ارفع نے اپنی زندگی کی آخری بات کیا کہی؟، ان سب باتوں کا تذکرہ اختر عباس کی اس کتاب میں موجود ہے۔ ہر وہ شخص جو ارفع کا نام تو جانتا ہے مگر اس کی ذاتی زندگی سے متعلق انجان ہے۔ اس کتاب کو پڑھ کر اسے ایسا لگے گا کہ ارفع اس کی آنکھوں کے بالکل سامنے موجود ہیں۔ اس کتاب کے لفظ صرف ذہنی طور پر ہی قاری کو ارفع سے متعلق نہیں بتاتے بلکہ قاری دل سے محسوس کرتا ہے، کیونکہ جو لفظ دل سے لکھے جاتے ہیں وہ دلوں پر ہی نقش چھوڑ جاتے ہیں۔

ناشر: علم و عرفان پبلی کیشنز الحمد مارکیٹ اردو بازار لاہور
صفحات: 80 قیمت: 200 روپے

تبصرہ نگار: غلام سجاد

چمنِ خیال

قارئین کے تبصروں، مشوروں اور باتوں سے سجا کالم

صحیح املا کا خیال

میں اُردو ڈائجسٹ کا نہتا نیا مستقل قاری ہوں۔ آپ کے سارے مستقل سلسلے مجھے بے حد پسند ہیں۔ قصہ کوئز، بوجھیں تو جانیں، چمن خیال، دردِ دل پہ دستک۔ لیکن اس جون کے شمارے میں ''ماہِ رواں کی شخصیات'' والا مستقل سلسلہ نہیں ہے اگر اس کو ختم کر رہے ہیں تو براہ مہربانی ارادہ بدل دیں اور اس کو دوبارہ شروع کریں۔ اس میں بڑے ہی کام کی معلومات ہوتی ہیں جو کسی اور جگہ میسر نہیں۔

آپ کے میگزین کی ایک اور بات مجھے بہت اچھی لگتی ہے کہ اس میں اردو کی صحیح املا اور تلفّظ کا بڑا خیال رکھا جاتا ہے۔ میں کچھ عرصہ پہلے تک ادائیگی اور ناراضگی کے الفاظ پڑھتا اور لکھتا رہا ہوں لیکن مقتدرہ قومی زبان کہ جس کا درجہ کم کر کے اب اسے ادارۂ فروغ قومی زبان بنا دیا گیا ہے کہ توسط سے میری تصحیح ہوئی کہ یہ الفاظ ادائی اور ناراضی ہیں۔ پھر مجھے یاد آیا کہ آپ کے میگزین میں تو ہمیشہ ہی ایسا لکھا ہوا پڑھا۔ (ضیغم ظہور قریشی۔ بھکر)

شکرانے کے آنسو

☆ ''کتابیں ہیں چمن اپنا'' کے عنوان سے نیا سلسلہ شروع کریں۔ قارئین یا اہم شخصیات اپنے زیرِ مطالعہ کتب کا تعارف اپنے انداز میں کرائیں۔

☆ دوران تحریر ابھی ابھی اسلام آباد سے بڑے بھائی محمد جمیل چودھری (چیف کمپیوٹر انجینئر، ایسوسی ایٹڈ پریس آف پاکستان) کا فون آیا ہے کہ انھوں نے بحریہ یونیورسٹی اسلام آباد سے کمپیوٹر سائنس میں ایم۔فل کی

ڈگری میں گولڈ میڈل حاصل کیا ہے۔ اس وقت ان کی عمر 53 سال ہو چکی ہے۔

☆ نوید اسلام صدیقی کی تحریر کردہ سچی کہانی پڑھی جب بھائی کی کامیابی کا والدہ صاحبہ کو بتایا اور پھر اس کہانی کے بارے میں بتایا تو آنکھوں سے شکرانے کے آنسو نکل آئے۔ میری والدہ صاحبہ بالکل ایسی ہی ہیں جس طرح کہانی میں ہیں۔ (محمد خلیل چودھری۔ دینہ جہلم)

دلچسپ اور معلوماتی قصہ کوئز

قصہ کوئز ایک دلچسپ اور معلوماتی سلسلہ ہے جس کو نوجوان اور بڑے معلومات حاصل کرنے کے لیے پڑھتے ہیں اسے ضرور جاری رکھا جائے۔ اُردو ڈائجسٹ اور نوائے وقت ایک تحریک کا نام ہے جو کہ پاکستان کی اساس کے ترجمان ہیں۔ بلاشبہ موجودہ دور میں بھی اُردو ڈائجسٹ ایک معیاری اہمیت کا ماہنامہ ہے جس کو گھر میں ایک ساتھ ماں، باپ، بہن، بھائی اور بیٹی پڑھ سکتے ہیں۔ غزہ کا سفر نامہ بہت دلچسپ اور معلوماتی ہے۔ اسے جاری رکھیں۔

(محمود منور خاں میانی۔ تحصیل بھیرہ ضلع سرگودھا)

میں ریٹائرڈ نہیں ہوں

میں ماہنامہ اردو ڈائجسٹ کا قاری تو اس وقت سے ہوں جب سے اردو ڈائجسٹ کا اجرا ہوا تھا، مگر غم روزگار سے کبھی اتنی فرصت ہی نہیں ملی کہ اردو ڈائجسٹ کے لیے کچھ لکھتا۔ اب چونکہ عمر رسیدہ ہونے کی وجہ سے فراغت ہی فراغت ہے تو سوچا کہ آپ کے لیے کچھ لکھوں۔ میں نے اپنے لیے ریٹائرڈ کا لفظ اس لیے نہیں لکھا کہ میں نے پاکستان میں کبھی بھی کوئی سرکاری یا غیر سرکاری نوکری نہیں کی۔ جہلم میں اپنی ایک فرنیچر، ایئر کنڈیشنگ کی ورکشاپ تھی جو کہ بجلی کی مہربانی اور خود بھی عمر رسیدہ ہونے کی وجہ سے بند کر دی تھی۔ ویسے بھی میرے جیسا 81 سال کا بوڑھا آدمی اب کر بھی کیا سکتا ہے۔

ساون کے موسم پر ایک مضمون آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں اگر مناسب سمجھیں تو اسے اردو ڈائجسٹ میں جگہ دے کر مشکور فرمائیں اور اگر آپ نے حوصلہ افزائی فرمائی تو ان شاء اللہ آئندہ بھی اپنی عمر اور تجربات کی روشنی میں کچھ نہ کچھ آپ کی خدمت میں حاضر کر دیا کروں گا۔ (منظور بٹ۔ جہلم)

قینچی کی زد میں

''روز'' جب بغیر کوئی پیغام لیے آپ کی خدمت میں پیش ہوتی تھی تو اس کے مقدر میں شریڈر (Shredder) کی قینچی چل گئی۔ ایک پیغام تو چھپ گیا کہ ''مشرقی لڑکی اب اتنی مشرقی نہیں رہی ہے۔'' لیکن دوسرا پیغام جو ایک سوال کی صورت میں تھا..... قینچی کی زد میں آ گیا۔ ''کیا ہمارا معاشرہ ایک مشرقی لڑکی کو اپنا جیون ساتھی منتخب کرنے میں اپنا جائز حق استعمال کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ درخواست ہے کہ کسی طور اس سوال کو بھی اجاگر کر دیجیے گا۔ (حسن رزاقی۔ کراچی)

(رزاقی صاحب! آپ خود ہی سوچیے افسانے کی نازک سی زمین اتنا بھاری بوجھ کیسے اٹھا سکتی ہے۔ اس سوال کو اگر شاملِ تحریر رہنے دیتے تو بیچارہ افسانہ، افسانہ نہ رہتا، ایک مضمون اور کسی حقوق نسواں والی تحریر میں ڈھل جاتا۔ لیجیے سوال تو ہم نے اجاگر کر دیا۔ براہ کرم افسانے کے اندر اسے شامل کرنے پر اصرار نہ کیجیے گا۔ غریب افسانہ احتجاج کرے گا اور کئی قارئین بھی جملوں کا لاٹھی چارج کرنے پہنچ جائیں گے کہ یہ آپ لڑکیوں کو کیا سبق

دے رہے ہیں۔ ہم وضاحتیں کرتے رہ جائیں گے کہ قبلہ یہ حرکت رزاقی صاحب نے فرمائی ہے مگر وہ مان کر ہی نہیں دیں گے۔ ادارہ)

بڑے لوگوں کو یاد رکھنے کا اہتمام

عصرِ حاضر کی بڑی ادبی شخصیت، جناب احمد ندیم قاسمی 10 جولائی کو اپنے بے شمار چاہنے والوں کو داغِ مفارقت دے گئے تھے۔ انتقال کے وقت قاسمی صاحب کی عمر 90 برس کے قریب تھی۔ کم و بیش 75 برس پر محیط آپ کی بھرپور ادبی زندگی، محبت و محنت، ادب پروری اور ادیب گری سے عبارت رہی اور بہت سوں کے لیے ایک قابلِ رشک نمونہ رہی۔ افسانہ، غزل، نظم، بچوں کے لیے نہایت اعلیٰ پائے کا ادب، تنقید و تقریظ، کالم نگاری، فلیپ نگاری اور نعت گوئی۔ نعت تو ایسی عشقِ نبی ﷺ میں سرتاپا ڈوب کر کہی کہ اس حوالے سے بھی اپنا ایک نام پیدا کیا۔ پھر مجلّہ ''فنون'' کے ذریعے مسلسل تین نسلوں تک نئے آنے والے شاعروں اور ادیبوں کی ذہنی آبیاری کرتے رہے۔ غرض یہ کہ

؎ اے باغباں، تجھے کیا کیا نشانیاں بتلائیں

جناب، اشفاق صاحب کے گزر جانے کے بعد آپ کا دم غنیمت تھا کہ ادب نگری کے باسیوں کو ایک چھتر چھاؤں نصیب تھی۔ قاسمی صاحب کیا گئے، ایک پورا عہد رخصت ہو گیا۔ (محمد آصف مرزا۔ لوئر مال مری)

مقاصدِ مدیر

''اسرائیل کی ہیبرو یونیورسٹی کا حیران کن کام'' ہماری کم مائیگی کا ماتم ہے، اس کے ساتھ ساتھ قرآن پاک کی عظمت پر دلیل کہ کیسے واقعاتِ قرآنی سے اسرائیل والوں نے استفادہ کیا۔ حدیثِ مبارک ہے ''قرآنِ کریم کے عجائب کبھی ختم نہیں ہوں گے اور یہ کتاب اپنے پڑھنے والوں کو اکتاہٹ کا شکار نہیں ہونے دے گی لہٰذا تم اسے پڑھا کرو۔'' اس حوالے سے محمود غازی صاحب کا مضمون ''فرانسیسی موسیقار کا انوکھا واقعہ'' قرآن کی سحر انگیزی کا عکاس ہے۔ اگر ممکن ہو تو محاضراتِ قرآنی سے دیگر مواد بھی شاملِ کریں۔ بعض مضامین کی طوالت بوجھل محسوس ہوتی ہے۔ مدیر اور مالی کا کام کئی حوالوں سے مشابہہ ہے۔ مالی کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ قطع و برید کی مقراض سے جھاڑ جھنکار صاف کر کے جنگل کو گلشن اور بے محابا پھیلی ہوئی جھاڑیوں کو نگاہوں کو بھلی لگتی ہوئی دل نواز کیاریوں میں تبدیل کر دے۔ بقول ڈاکٹر وزیر آغا ''مدیر کی حیثیت اس دکاندار کی سی نہیں جو تھوک سے مال حاصل کر کے پرچون میں فروخت کرتا ہے۔ اس کی حیثیت اس ملاح کی سی ہے جو کشتی کے لیے مواج سمندر میں رستہ بناتا ہے۔

(ڈاکٹر صاحب! اب آپ یہ نہ کہیے گا کہ متن نہ ہوا قبلہ ہوا کہ جسے درست کرنا مدیر کی ذمہ داری ہے۔ ویسے ہم آپ کے خیال سے پوری طرح متفق ہیں مگر دیگر قارئین کی دلداری بھی لازم تھی۔ کچھ کا اصرار تھا کہ مضامین بے شک اچھے ہیں مگر مختصر نہ دیا کریں۔ ان میں Depth ہو۔ انہی کے احترام میں ہم نے طویل مضامین دینے شروع کر دیئے۔ جن کی طرف آپ نے نشاندہی کی ہے۔ ایڈیٹر کا کام گسی ہوئی رسی پر چلنے جیسا ہوتا ہے۔ تالیاں بجانے والوں کے ہاتھوں اور باتوں دونوں پر نگاہ رکھنی پڑتی ہے۔ ایڈیٹر)

(ڈاکٹر ندیم اکرام، راولپنڈی)

بڑا ہی مشکل ہے یہ ڈائجسٹ

جب اسکول کی طالبہ تھی اور اپنے بڑے بہنوئی کے

گھر ڈائجسٹ سے بچوں کے صفحات اور آسان آسان کہانیاں پڑھا کرتی تھی اور یہ تاثر دل میں رکھتی تھی کہ ''بڑا ہی مشکل ڈائجسٹ ہے یہ اردو ڈائجسٹ بھی'' لیکن آج عمر کی 47 بہاریں دیکھنے کے بعد بھی اردو ڈائجسٹ سے دوستی چھوٹی نہیں۔ وہی مشکل لگنے والا ڈائجسٹ اب سب سے اچھا، سب سے آسان اور آج کے دور کی سب سے اہم ضرورت لگتا ہے کہ اس کے مضامین دور حاضر کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ خاص کر ''دردِ دل یہ دستک'' تو یوں لگتا ہے کہ جو کچھ میں سوچ رہی تھی لیکن نہ کہہ پا رہی تھی نہ لکھ پا رہی تھی اسے آپ نے لکھ دیا کس کس عنوان کی تعریف کروں، الفاظ کم پڑ جائیں گے۔

ایک چھوٹی سی کوشش میں نے بھی کی ہے، میں لکھاری نہیں البتہ درس و تدریس کے شعبے سے وابستہ ہونے کی بنا پر ایک حساس دل ضرور رکھتی ہوں جو کچھ اپنے آس پاس ہوتا دیکھتی ہوں اس پر گھنٹوں کُڑھتی ہوں بقول مشتاق (میرے شوہر) کے ''آپ اُردو ڈائجسٹ نہ پڑھا کریں ہر وقت کُڑھ کُڑھ کے اور رو رو کے آپ وقت سے پہلے بوڑھی ہوگئی ہیں۔'' لیکن آپ ہی بتائیں کہ آج کے اس زخم زخم معاشرے میں کوئی کیسے بے حس ہو کر جیے۔ بس اسی احساس کے تحت یہ تحریر بھیج رہی ہوں اگر ہو سکے تو نوک پلک سنوار کے شائع کر دیجیے گا ورنہ یہ احساس تو ہے ہی کہ ''میں اور آپ کے قافلے میں شامل لکھاریوں کے برابر کہاں۔'' (نائلہ مشتاق)

سخت سردی میں اتنی دور

ڈاکٹر محمود احمد غازی کا فرانسیسی موسیقار کا انوکھا واقعہ پڑھ کر ایمان تازہ ہوگیا۔ یہ حقیقت ہے کہ اکثر دین کو سمجھ کر ایمان لانے والے پیدائشی مسلمانوں سے بہت بہتر مسلمان ثابت ہوتے ہیں۔ اس حوالے سے ایک واقعہ یاد آگیا جو کہیں پڑھا تھا۔

''کچھ عرصہ پہلے ایک غیر مسلم ملک کی سیر کو گئے۔ سخت سردی کے دن تھے۔ درجہ حرارت منفی صفر سے کہیں کم تھا۔ شہر میں مسجدیں کم کم تھیں اور ان کے درمیان فاصلہ بہت زیادہ۔ جس جگہ ہم رہائش پذیر تھے، اس کے ساتھ ہی ایک مسجد تھی۔ ایک سخت سرد صبح فجر کی نماز کے لیے مسجد گیا تو دیکھا کہ ایک انگریز مسلمان تیز تیز قدم اٹھاتا مسجد کی طرف آرہا ہے۔ آیا تو شاید گاڑی میں تھا مگر اب وقت کی کمی کے باعث جلدی میں تھا۔ نماز ہو چکی تو تعارف ہوا۔ باتوں باتوں میں پتا چلا کہ ان کا گھر یہاں سے 30 میل دور ہے اور وہ روزانہ وہیں سے نماز پڑھنے آتے ہیں۔ میں نے حیرانی سے کہا کہ ''آپ اتنی سخت سردی میں اتنی دور سے آتے ہیں، گھر ہی پر نماز ادا کر لیا کریں۔'' اس نومسلم انگریز نے تعجب سے میری طرف دیکھا۔ چند لمحے توقف کیا اور پھر بولا:

"My dear! You are muslim by birth but I am Muslim by choice."

اور میرے پاس سوائے شرمندگی کے کچھ نہ تھا۔

(رانا محمد شاہد۔ بورے والا)

عزتِ نفس

یہ سال 2009ء کی بات ہے، مہینا، دن اور تاریخ مجھے ٹھیک طرح سے یاد نہیں ہے۔ بس وہ چند لمحات یاد ہیں۔ ہائی اسکول کے کمرے میں ہم بہت سی لڑکیاں اکٹھی بیٹھی تھیں۔ دو ٹیچرز بھی کمرے میں موجود تھیں۔ ٹیچرز نے باری باری لڑکیوں سے نعتیں سنیں۔ جتنی بھی نعتیں یاد تھیں وہ سب میں نے ٹیچرز کو سنائیں۔ انھیں میری کسی بھی نعت کی طرز اچھی نہ لگی۔

سرخا اور چتکبرا

اوائل عمری میں بچوں کے مشہور جریدہ ''پھول'' کی ادارت اشاعت میں سرگرم حصہ لیا۔ نقوش کے اولین شماروں میں محمد طفیل مرحوم کی معیت میں اپنی بھرپور تخلیقی صلاحیتوں کا مظاہرہ فرمایا اور نقوش کے خدوخال اور اس کی ظاہری و معنوی خوبیوں میں گراں قدر حصہ ڈالا۔ 'امروز' کے مشہور نکاسی کالم حرف و حکایت میں ''عنقا'' کے نام سے ان کی ظریفانہ تحریریں اور شگفتہ تبصرے اہلِ نظر کے نزدیک بڑے مقبول ہوئے۔ اس دور میں ''نوائے وقت'' کے سرِ راہے کے مدیر مشہور زمانہ ادیب اور صحافی وقار انبالوی مرحوم تھے۔ امروز کے ''عنقا'' اور نوائے وقت کے ''سرِ راہے'' میں معاصرانہ چشمک بڑی طرح دار تھی۔ وقار انبالوی عنقا کے مدیر کو 'سُرخا' کہتے اور اس کی باتوں کے خوب لتے لیتے۔ جبکہ عنقا کے مدیر سرِ راہے کے لکھنے والے کو 'چتکبرا' کہہ کر اسے اشتعال دلاتے اور پھر قلم کاریوں کی شگفتہ بیلوں اور ٹہنیوں پر خوشگوار شگوفے کھلتے اور نظریات کے اس تصادم سے قارئین خوب محظوظ ہوتے۔ لیکن کمال یہ ہے کہ قاسمی صاحب اور انبالوی مرحوم کی تحریروں میں کہیں بھی سُوقیانہ پن اور لچرپن کی نمود نہیں تھی۔ 1964ء کے لگ بھگ احمد ندیم قاسمی صاحب نے ماہنامہ ''فنون'' کا معرکہ آرا اجرا کیا اور بہترین ادبی اصناف میں گوہر افشانی کرنے والوں کو ''فنون'' کے اوراق میں طبع آزمائی کے مواقع فراہم کیے۔ ''فنون'' اپنے دور کا بہترین ادبی جریدہ تھا جس میں ہر اچھے لکھنے والے کی اونچی سطح پر پذیرائی ہوتی تھی۔ بالخصوص نئے لکھنے والوں کا خیر مقدم کیا جاتا اور ان کی تحریروں میں ہلکی پھلکی کانٹ چھانٹ کر کے انھیں منصۂ شہود پر ابھرنے کے زرّیں مواقع بے دریغ نصیب ہو جاتے۔ (پروفیسر ریاض حسین زیدی، ساہیوال)

25،20 کی تعداد کی لڑکیوں کے سامنے انھوں نے غصے اور سخت لہجے میں میری بہت بے عزتی کی کہ تمھارے پاس اتنا زیادہ وقت تھا، کوئی اچھی نعت تیار کر لیتی۔ میں نے جواباً عرض کی کہ مجھے جتنی بھی نعتیں آتی تھیں وہ سب تو سنا دی ہیں، لیکن انھوں نے بہت غصہ کیا۔ مجھے سب کی نظروں میں ذلیل کیا گیا۔ تمام لڑکیاں جو کمرے میں موجود تھیں وہ میری طرف مڑ مڑ کر دیکھنے لگیں کہ جیسے مجھ سے کوئی بہت بڑا گناہ سرزد ہو گیا ہو۔ جس ٹیچر نے میری اتنی بے عزتی کی، ان کے ساتھ ایک ٹیچر بھی بیٹھی تھیں جو منہ پہ ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگیں۔

اگر یہ مذاق تھا تو ایسا مذاق میری عزتِ نفس کو مجروح کر دینے کے لیے کافی تھا۔ دوسری ٹیچر کا ہنسنا، لڑکیوں کا میری طرف مڑ مڑ کر دیکھنا اور اس ٹیچر کا مجھ پہ بلاوجہ غصہ کرنا وہ اب بھی یاد ہے۔

انھیں اگر میری نعتیں پسند نہیں آئی تھیں تو وہ مجھے صرف اتنا کہہ سکتی تھیں کہ ''تم حصہ مت لو۔''

اگلے دن میلاد پہ جانے کے لیے میں تیار نہیں تھی۔ لیکن اپنی دوستوں کے کہنے پر چلی گئی۔ وہاں جتنی دیر بھی رہی، ان ٹیچرز سے نظریں چراتی رہی۔ حالانکہ میرا کوئی گناہ یا غلطی نہیں تھی۔

اب بھی اس واقعے کے اثرات میری زندگی میں حائل ہیں۔ جو بھی استاد ہو، میں بات کرتے ہوئے ایک انجان سی شرمندگی میں گھر جاتی ہوں۔ میں نے کئی بار بھلانا چاہا لیکن وہ قاتل الفاظ تھے۔ احساسات و جذبات کے ساتھ ساتھ روح کو بھی قتل کر گئے۔

میں نے ''اشفاق احمد'' کی کتاب ''زاویہ'' پڑھی تو اس میں انھوں نے اپنی زندگی کا ایک واقعہ بیان کرتے

ہوئے لکھا ''1946ء کی بات ہے۔ ایک اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے، وہاں کے بچوں کو کہا گیا کہ وہ اپنے آپ میں اعتماد پیدا کریں اور تختہ سیاہ (بلیک بورڈ) پر لکھنا پڑھنا سیکھیں۔ ایک بچے کو پہاڑے بہت اچھی طرح آتے تھے لیکن وہ بلیک بورڈ پر لکھنا نہیں چاہتا تھا۔

اس کو لکھنے کو کہا لیکن لڑکے نے انکار کر دیا۔ اس کو سزا دی گئی کہ اسے ہر کلاس میں پھرایا جائے اور بتایا جائے کہ یہ نافرمان بچہ ہے۔

پاکستان بن جانے کے بعد عید کے موقع پر لوگوں سے گلے ملتے ہوئے اشفاق احمد نے اس لڑکے کو دیکھا کہ اس نے اپنے استاد کے گلے ملنے کی بجائے اسے ہاتھ سے پرے دھکیل دیا۔ یہ وہی لڑکا تھا جس کی انھوں نے بے عزتی کی تھی۔ بظاہر تو یہ اتنی بڑی کوتاہی نہیں تھی۔ لیکن یہ واقعہ جس طرح سے اس کے دل پر گزرا وہ زخم کتنے ہی سال گزرنے کے بعد بھی اس کے دل پر چلا آرہا ہے۔

استاد کی ذات شاگرد کے لیے بہت اہم مقام رکھتی ہے۔ استاد ہی جب شاگردوں کی حوصلہ شکنی کرے گا تو شاگرد کے ذہن میں بہت سے منفی خیالات پیدا ہو سکتے ہیں۔ (رافعہ علیزائی۔ ڈگری کالج ڈے والا)

فون پتا

روشانے ظفر کا انٹرویو پڑھا، کشف فاؤنڈیشن کے حوالے سے ان کی خدمات قابل تعریف ہیں۔ بہت سی خواتین کی طرح میں بھی ان کے چاہنے والوں میں سے ایک ہوں۔ شمارے میں ایڈریس اور فون نمبر درج نہ ہونے کی وجہ سے میں اردو ڈائجسٹ کے پتے پر یہ خط بھیج رہی ہوں۔ امید ہے ضائع نہیں کیا جائے گا۔

(عظمیٰ عفت اسلام)

(اس حوالے سے قارئین سے گزارش ہے کہ ہمارے لیے یہ ممکن ہی نہیں ہوتا کہ کسی کا خط کسی کو بھجوایا، پہنچایا جائے۔ یہ بوجھ ہم پر نہ ڈالا کریں اکثر لوگ فون اور پتا پوچھنے کی ضد کرتے ہیں۔ کسی شخصیت کا انٹرویو اشتہار تو ہوتا نہیں ہے کہ ساتھ فون اور پتا بھی دیا جائے۔ ایسے رابطوں کی کوشش کرنی بھی ہو تو اپنے طور پر ہی ہونی چاہیے)

''اخوت فاؤنڈیشن'' ڈاکٹر امجد ثاقب کا انٹرویو بھی آنا چاہیے۔ بلوچستان کا نگران وزیر اعلیٰ کا انٹرویو سنگلاخ علاقوں میں بسنے والے ایک نرم و ملائم شخص کی روداد تھی۔ ''ماں کے بدن میں بچے کے زندہ خلیے'' جناب عبدالہادی سید صاحب کا پُر مغز مضمون سہل ممتنع کا بہترین عکاس ہے۔ مبشر الحق عباسی صاحب تو آتے ہی چھا گئے ہیں۔ پمن خیال میں ایک صاحب نے اُردو ڈائجسٹ کی چھپائی کے نئے انداز کو پسند کیا ہے۔ لگتا ہے اکثر لوگوں کو چھپائی کا یہ انداز پسند آگیا ہے۔ مجھے پرانا انداز پسند تھا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ادارہ اردو ڈائجسٹ تحریر و تخلیق کے حوالے سے مضامین یا ورکشاپس کا اہتمام کرے جس میں لکھنے والوں، خصوصاً نوجوانوں کو، تحریر لکھنے، انٹرویو، فیچر اور دیگر لوازمات کے حوالے سے رہنمائی فراہم کی جائے۔

(ڈاکٹر ندیم اکرام، راولپنڈی)

پروفیسر مجیب ظفر کا خط

(کراچی سے پروفیسر مجیب ظفر انوار ہمارے بہت محترم قاری ہیں۔ گزشتہ ماہ ان کا تفصیلی خط شائع ہوا مگر آخر میں ان کا نام طبع ہونے سے رہ گیا۔ پروفیسر صاحب شکریہ کے ساتھ نوٹ فرمائیے)

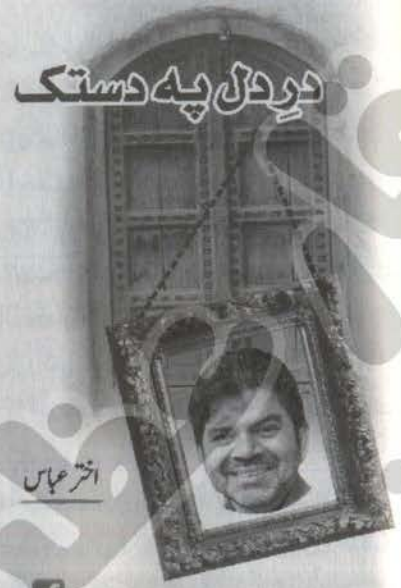

urdudigest.pk
akhterabas@ymail.com

اللہ جی کو میرا بھی سلام کہنا

خاموشی ہمارے درمیان یوں بیٹھی تھی مانو اسی کا راج ہو۔ پچھلے ایک گھنٹے سے ہم میں سے کوئی ایک بھی نہیں بولا تھا۔ صرف ایمبولینس کے ہوٹر کی آواز تھی جو اندر باہر گونج رہی تھی۔ سامنے سٹریچر پر برف کے ڈالوں کے درمیان سوئے ہوئے طالب بھائی کے چہرے پر پڑا کپڑا ایک بار بھی نہیں سرکا تھا۔ ان کی پانچ، چھ اور سات سال کی تینوں بیٹیاں اس دوران ایک بار بھی نہیں روئی تھیں۔ حتیٰ کہ ان کی ماں بھی نہیں جسے اب عمر بھر بیوگی کا بوجھ اکیلے اٹھانا تھا۔ اوکاڑہ پہنچ کر میں نے ایدھی ایمبولینس کے ڈرائیور کو ایک بیکری پر رکنے کو کہا۔ ہوٹر بج رہا تھا، اندر میت نہ ہوتی تو یہی ہوٹر پروٹوکول کی گاڑی پر لگا ایسی ہی آوازیں نکال رہا ہوتا۔ وہاں سے جوس، بسکٹ، کباب، بند جو جو کھانے کی چیزیں تازہ بنی نظر آئیں وہ خریدنے کے بعد ایمبولینس پھر سفر پر روانہ ہوئی۔ ابھی چار گھنٹے کا سفر باقی تھا۔ ساری رات گھر میں کوئی نہیں سویا تھا۔ کھانے کا ہوش کسے ہوتا، صبح صبح نماز جنازہ کے بعد ہم چشتیاں جانے کے لیے روانہ ہو گئے تھے۔

جب ساہیوال بھی گزر گیا اور بچوں نے اور ان کی ماں نے کچھ کھا لیا تو میں نے بڑی ہمت کر کے اپنی چھوٹی بہن نوید، جسے بیوہ ہوئے 24 گھنٹے بھی نہیں گزرے تھے اور اس کا ایک دم سے پورا مستقبل ہی تاریکی کی لپیٹ میں آگیا تھا، پوچھنا چاہا، کہاں رہے گی، کیا کرے گی، تین بیٹیاں ہیں، کیسے پالے گی؟ بچیاں باپ کے بغیر کیسے جی پائیں گی، قسم کے سوالات قطار اندر قطار سر جھکائے سامنے آرہے تھے اور اپنا جواب نہ پا کر منہ بسورتے ہوئے سزا پانے والے لڑکوں کی طرح قطار میں کھڑے ہوئے جا رہے تھے۔ آخر دل کڑا کر کے پوچھا ''طالب بھائی تم چاروں سے بہت محبت کرتے تھے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ برڈ ووڈ روڈ پہ واقع سابقہ علامہ اقبال میڈیکل کالج کی بلڈنگ جہاں

وہ لائبریرین تھے، کی زندگی کا محور ہی تم لوگ تھے، کل سے تم ایک بار بھی نہیں روئی، حتیٰ کہ تمھاری بیٹیاں بھی بس خالی آنکھوں سے اپنے باپ کو تکتی اور اس کے دوستوں کو روتے دیکھتی رہی ہیں نہ اس سے لپٹی ہیں نہ چیخیں مار کر بین ڈالے ہیں۔''

سوال سخت تھا۔ خدا جانے کرنا چاہیے تھا یا نہیں مگر جسم کے اندر بیٹھا ہوا صحافی صحافت کی ٹوپی موڑ کر الٹی بھی پہن لے تو بھائی بعد میں ہوتا ہے۔ نوید نے پہلی بار نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا، ''بھائی! رونا کیوں نہیں آئے گا، سوچ کیا کچھ نہیں دکھا اور بتا رہی مگر ہر بار جب آنسو بے قابو ہونے لگتے ہیں، چیخیں سینہ چیر کر نکلنے کو راہ پانے والی ہوتی ہیں تو مجھے ایک بات روک لیتی ہے۔ آنحضور ﷺ نے فرمایا تھا ''صبر غم کے ابتداء وآغاز میں ہے، اسی کا اللہ کے ہاں اجر ہے۔'' یہی طرز عمل اس کو عزیز اور محبوب ہے۔ دھاڑیں مار مار کر رونے کے بعد بھی تو صبر کرنا پڑتا ہے مگر تب اس میں اللہ کی رضا شامل نہیں رہتی۔ میں جسے آنے والے ہر دن ہر لمحے بس اسی کے سہارے کی طلب ہے کہ اپنا سب سے قیمتی سرمایہ کھو بیٹھی ہوں، اس مالک کو بار بار بتاتی جا رہی ہوں کہ صبر کرنا بہت مشکل ہے۔ مگر آپ کے لیے کر رہی ہوں۔ آپ کے سہارے کر رہی ہوں۔''

ٹھیک دس سال بعد پھر ایک فون نے دل کو عجیب بے بسی، خوف، درد اور صبر سے بھر دیا ہے۔ یہ فون منصورہ سے پہلی بار آیا تو میں نے پوری توجہ سے سنا ''آپ جاننا چاہتے ہیں کہ درد کیا ہوتا ہے، میرا بیٹا میرے سامنے لیٹا ہے۔ ڈاکٹر اس کی زندگی کے اختتام کا اعلان ہی نہیں کر چکے، اصرار سے یقین بھی دلاتے ہیں مگر وہ زندہ ہے، سانس لیتا ہے، باتیں کرتا ہے، آرزوئیں رکھتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ آپ سے ملنا ہے، وہ پوچھنا چاہتا ہے بیماری سے کوئی بدصورت ہو جائے تو اس کے اپنے سگے عزیز واقارب اسے ملنے اور دیکھنے سے کیوں بھاگنے لگتے ہیں۔''

میں نے برسوں سے اپنے آپ کو یقین دلا دلا کر پکا کیا ہوا ہے کہ میں ایک بہادر آدمی ہوں کیونکہ بہت پہلے میں نے جان لیا تھا کہ جو ہم نہیں ہوتے اسی کی تکرار کرتے ہیں۔ اسی کو دہراتے اور اپنے علاوہ دوسروں کو اسی کا یقین دلانے کے لیے کبھی تو اداکاری بھی کرنے بیٹھ جاتے ہیں، جو اکثر پکڑی جاتی ہے۔ مسز ساجدہ احسان کا پھر فون آیا۔ ''آپ ہمارے گھر آسکتے ہیں۔'' میں خاموش ہو گیا، مجھے سرگودھا سے چند سال پہلے آنے والی ایک کال یاد آئی جب ایک ماں نے روتے ہوئے کہا کہ ''ہم آپریشن تھیٹر کے دروازے پر ہیں۔ میری نو سال کی بیٹی نے کہا ہے کہ پہلے میری بھیا جی سے بات کراؤ پھر جاؤں گی۔ اگلے ہی لمحے ایک کمزور سی آواز آئی ''بھیا جی! آپ تو کہتے تھے کہ اللہ جی بہت اچھے اور مہربان ہیں، پھر مجھے موت سے ڈر کیوں لگتا ہے، موت سے نہیں مرنے سے۔'' ''بھئی سب کو لگتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''آپ کو بھی؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''شاید یہی واحد چیز ہے جس سے ڈر نہیں لگتا۔'' بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔ ''مگر سبھی اسی سے

ڈراتے ہیں۔ اللہ سے ڈراتے ہیں۔ آپ اس سے کیوں نہیں ڈرتے۔'' کوئی اور موقع ہوتا تو شاید میں طرح دے جاتا۔ اس لمحے ممکن نہیں رہا تھا، اسی لیے کہا:

''بیٹے جی! جس نے دنیا میں سب سے زیادہ میرا خیال رکھا ہو، عزت دی، اچھا رزق دیا، ڈھیروں خوشیاں دیں، پل پل ساتھ رہا، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جب اس کے ہاں جاؤں تو میرے ساتھ اس سے سوگنا اچھا سلوک نہ کرے۔ اس سے اچھا میزبان ہو ہی نہیں سکتا، اس نے خود کہا ہے کہ میرے بارے میں تم جیسا گمان، تصور اور یقین رکھتے ہو تو میں ویسا ہوں۔''

''بھیا جی! آپ جاتے ہوئے کوئی سوال نہیں کرو گے۔ اس مہربان رب سے، مزید زندگی نہیں مانگو گے۔ چند دن اور۔'' اس نے کھلکھلا کر پوچھا تھا۔ اب اس کی آواز میں وہ کمزوری اور بے بسی نہیں تھی۔

''تم بھی مت مانگنا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ ''رب کے کچھ کاموں میں فرمائشیں نہیں ڈالنی چاہئیں، بندہ مشکل میں پڑ جاتا ہے۔ بس اتنا یاد رکھنا اس پوری دنیا میں ہی نہیں اس پوری کائنات میں اس سے اچھا اور مہربان کوئی اور ہے ہی نہیں۔'' آپریشن تھیٹر پر رکی لڑکی نے بے اختیار کہا ''بھیا! اب میں زندگی نہیں مانگوں گی۔ آپ نے مرنا آسان کر دیا''۔ فون بند کر کے بھی میں کتنی دیر اس عالم میں بیٹھا رہا کہ میری آنکھیں، دل، گال سبھی آنسوؤں سے گیلے تھے۔ مجھے لگا اس بچی کو نہیں آج میں نے اپنے آپ کو اپنے رب کی مہربانی سے ملوایا اور یقین دلوایا ہے۔ کیا اس لمحے میں واقعی بہادر ہو گیا تھا۔ بہادری کی اداکاری میں آنسوؤں اندر باہر سے آپ کو شرابور نہیں کرتے۔

مسز ساجدہ احسان کے بیٹے کا آدھا سر نہیں تھا۔ چند ماہ پہلے تک وہ اپنی سن کالج میں پڑھتا تھا اور اپنے نام حشیم علی (علی کا شیر) کی طرح وہ مزے اور سکون میں تھا کہ جب پانچویں کا اس کے طالب علم بڑے بھائی حسان ابوبکر نے گھر آکر کسی بچے کے تنگ کرنے کا ذکر کیا تو حشیم نے آگے بڑھ کر کہا تم کل مجھے ساتھ لے چلنا۔ ڈیڑھ سال ہونے کو آیا جب بچے نے سر درد کی شکایت کی۔ وقتی علاج سے بات نہ بنی پھر ٹریٹمنٹ شروع ہوئی۔ معلوم ہوا ''یورنگ سرکوما'' ہے۔ یہ کینسر کی ایک قسم ہے۔ جس سے ملتے، مشورہ ملتا شوکت خانم لے جاؤ۔ وہاں لے گئے۔ 21 ہزار کی ایم آر آئی سے لے کر لاکھ روپے کے چھوٹے بڑے سارے ٹیسٹ کر ڈالے۔ کسی ٹیسٹ سے انکار نہیں کیا۔ ہاں علاج سے انکار کر دیا۔ شوکت خانم سے یہ شکایت عام ہے کہ صرف ٹھیک ہونے والے مریضوں کو پکڑتے ہیں۔ بیماری کی کیفیت دیکھ کر داخلہ تو دور کی بات ٹریٹمنٹ سے ہی انکار کر دیتے ہیں۔ ٹیومر مین سنسر پر تھا۔ ایک دوسرے سرجن نے کہا آپریٹ کیا تو بچہ اپاہج ہو سکتا ہے۔ پھر بھی آپریشن کرا لیا۔ ٹیومر نکال دیا گیا۔

کیموتھراپی ہوتی رہی، بہت ہی تکلیف دہ انجیکشن ہوتے تھے۔ 48 گھنٹے اثر رہتا تھا۔ انمول والے آپریشن نہیں کرتے، حالانکہ وہ کینسر کا ایسا بہتر ادارہ ہے کہ جہاں ایک ہی چھت تلے تینوں ڈاکٹر ہونے چاہئیں، جس نے علاج کرنا ہے، جس نے آپریٹ کرنا ہے اور جس نے بعد میں ٹریٹمنٹ دینا ہے۔ نیوروسرجن

تو الگ چیز ہے وہ کینسر کا ماہر نہیں ہوتا۔ اگر آپریشن کے وقت کینسر کا ماہر ڈاکٹر بھی ساتھ ہوتا تو سارا کینسر نکالا جاتا، بعد میں پتا چلا کہ اس کی جڑیں کھوپڑی تک پھیل گئی ہیں۔ دوبارہ آپریشن ہوا تو انھوں نے پچھلا آدھا سر کاٹ دیا۔ پھر بھی امید تھی کہ بیٹا بچ جائے گا۔ اسلام آباد ''پمز'' بھی گئے، احسان اللہ صاحب نے بتایا انھوں نے 25 سال میں پہلا ایسا مریض دیکھا۔ جس بیڈ روم میں ہم بیٹھے تھے، اسی میں ایک طرف نو سال کا بچہ پچھلے پانچ ماہ سے لیٹا ہوا ہے۔ اس کی کمر میں بیڈ سورز ہو رہے تھے۔ محبت کرنے والے باپ نے الیکٹرک پمپ منگوایا۔ اس پانچ ماہ میں اس خاندان پر کیا بیتی اس کا کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا۔

ان کی آنکھیں خشک تھیں۔ البتہ سوال نمی لیے ہوئے تھے۔ ''کسی کے پیارے کو ڈاکٹر جواب دے دیں تو وہ کیا کریں۔ علاج نہیں کرسکتے تو ہسپتال والے گائیڈ تو کرسکتے ہیں۔ ریسرچ ادارے کس لیے ہوتے ہیں، وہ ایسے مریضوں پر تجربے کرکے دوسروں کے لیے خیر کیوں نہیں ڈھونڈ سکتے۔''

مسز ساجدہ بولیں میں نے امریکا میں مقیم اپنے ماموں ڈاکٹر زاہد باجوہ سے کہا تو انھوں نے کیلی فورنیا یونیورسٹی میں اس مرض پر ہوئی تحقیق کے 16 قیمتی صفحات بھجوائے جنھیں انمول کے ڈاکٹر منیب نے دیکھے بنا یوں اٹھا کر پھینکا جیسے کچرا ہو۔ جب تک اس کے پاس علاج کے لیے جاتے رہے منہ نیچے کرکے چنے کھاتا رہتا۔ لیپ ٹاپ پر دیکھتا رہتا، مجال ہے کبھی تسلی کے دو لفظ کہے ہوں یا کوئی بات کی ہو۔ 4 دسمبر کو پہلی بار بولا ''دی اینڈ۔'' دوبارہ نہیں آنا.... تب سے گھر پر ہیں۔

میں نے دل بڑا کرکے بچے کو دیکھا اس کا سر دو فٹ سے لمبا ہو چکا ہے۔ کھوپڑی کا پچھلا حصہ کٹنے کے باہر کینسر وہاں سے نکلا اور پھیلتا چلا گیا۔ سر پر تین کلو سے زائد کا بوجھ بڑھا تو پوری آنکھ باہر نکل آئی۔ کبھی نہ بند ہونے کے لیے۔ آنکھ کے آئی بال کو جو قدرتی نمی آنکھ میں ملتی ہے وہ ملنا بند ہوگئی اور آئی بال خشک ہوگیا۔

دروازے سے ٹیک لگائے کھڑی اریج احسان (10th) اور فائقہ احسان (9th) خاموشی سے باتیں سن رہی تھیں۔ ان سے کیا پوچھتا۔ میں نے بنا سوال ان کی طرف دیکھا۔ اریج میرا سوال پا گئی۔ بولی ''اس کا درد دیکھا نہیں جاتا۔ آج صبح سے اسے تکلیف تھی، ہم دونوں بہنیں اسکول نہیں جاسکیں۔''

کیا میں اس سے بات کرسکتا ہوں۔ میرا سوال اندر تک سہما ہوا تھا۔

مسز احسان بولیں ''جسم مفلوج ہے۔ سر اور گردن تک کینسر پھیل چکا ہے۔ دماغ ابھی زندہ ہے، باتیں کرتا ہے، آرگو کرتا ہے۔ قرآن پاک سنتا ہے۔ ایک آنکھ سے کبھی کارٹون بھی دیکھتا ہے۔''

میں نے صوفے سے اٹھنا چاہا تو لگا پاؤں من من کے ہوگئے ہیں۔ بچے نے اپنی واحد آنکھ کھول کر سلام کیا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اس سے ہاتھ ملایا، اس کی واحد سلامت گال پر ہاتھ رکھا۔ پھر پوچھا ''سارا دن لیٹے کیا سوچتے ہو؟''

بولا ''جنت میں اللہ مجھے سر اور پورے ہاتھ پیر ہلانے دے گا ناں!''

کچھ سوال ہی بے بسی سے بھرے ہوتے ہیں۔ ایئر ٹکٹنگ کے کاروبار سے منسلک احسان صاحب نے کہا کہ بچہ بیمار ہوا تو میں نے اپنے پورے کاروبار کا جائزہ لیا، اپنا جائزہ لیا۔ اپنے تعلقات کو دیکھا پھر اللہ کے آگے ہاتھ باندھ دیئے۔ جب سگی بہن نے کہا ''ناراض نہ ہونا تمھارے گھر نہیں آسکتی۔ تمھارا بچہ دیکھا نہیں جاتا۔'' کتنے ہی اور رشتے داروں نے ان پانچ ماہ میں ادھر کا رخ نہیں کیا۔ قاضی حسین احمد کی صاحبزادی ڈاکٹر سمیحہ راحیل قاضی آئیں تو دل کے زخموں پر یہ کہہ کر پھاہا رکھ گئیں ''جو آزمائش اللہ کے قریب کردے وہ بالآخر اجر اور اس کی مہربانی کا باعث بنتی ہے۔''

بچے کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔ بے شک میں اندر تک سہما ہوا تھا مگر وہ مجھے اچھا لگ رہا تھا۔ ایک ایسی معصوم روح جس کا کوئی بوجھ نہیں، جس پر کوئی گناہ نہیں اور جو بظاہر ہم سب سے پہلے اپنے رب سے ملنے والا تھا۔

اس کے والد کی آواز آئی۔ ''عباس صاحب! میں سرمایہ لگانے کو تیار ہوں جیسے ایدھی نے ایمبولینس سروس بنائی۔ ایسے ہی کوئی ہمت کرے تو مرتے مریضوں کے لیے کوئی عالی شان ادارہ بنائے جہاں وہ آخری دن سکون اور آرام سے گزاریں۔ ان پر کوئی تحقیق ہو جائے تو اور بھی اچھا ہے۔ اپنی تکلیف کی انتہا دوسروں کی تکلیف کو محسوس کراتی اور خدمت کا کوئی راستہ نکالتی ہے۔''

کوئی اور وقت ہوتا تو مسز احسان کو بتاتا کہ ان کے ماموں ڈاکٹر زاہد باجوہ مجھے کتنے عزیز تھے۔ علامہ اقبال میڈیکل کالج میں 80 کی دہائی کے جن برسوں میں وہ لاہور تھے۔ اسلامی جمعیت طلبہ کے سیکرٹری جنرل تھے۔ ایک خوب صورت، خوش فکر اور قطعی غیر جماعتی انداز رکھنے والے ڈاکٹر، جس کے حلقہ دوستاں کے سبھی لوگ اس وقت جگہ جگہ دنیا کے بہترین سرجن اور ڈاکٹر ہیں اور بے بسی میں بھی برابر۔ اچانک مسز احسان نے کہا ماموں نہ ہوتے تو جانے یہ مشکل وقت کیسے گزرتا۔ اس کے علاج سے لے کر بے بسی کے سارے دنوں میں جب یہاں سے مارفین کا انجیکشن بھی نہیں ملتا وہ وہاں سے بھجواتے ہیں۔

میں نے اپنی ہمت کے غبارے میں جتنی ہوا بھری تھی وہ اب تک قائم تھی۔ اس لیے حشیم علی سے پوچھا ''آپریشن کے بعد شیشہ دیکھا تھا؟''

بولا ''اپنا آدھا سر دیکھ کر تکلیف تو ہوئی مگر صرف یہی کہا تھا اللہ کی مرضی۔ میں کیا کرسکتا ہوں، پھر کبھی آئینہ دیکھا ہی نہیں۔''

''اللہ جی سے کیا کہو گے سب سے پہلے''، اس نے تکلیف سے واحد آنکھ بند کرتے ہوئے کہا ''مجھے ٹھیک کردیں۔''

اسے اور بچیوں کو پیار دے کر جب میں گھر سے رخصت ہو رہا تھا تو غم کے آغاز پر صبر کا مفہوم ایک بار پھر سامنے کھڑا تھا۔ میرا بہت دل چاہا تھا کہ ننھے حشیم سے کہوں جب اللہ جی سے ملنا تو میرا بھی سلام کہنا۔ مگر میں سدا کا بہادر اندر سے جانتا تھا کہ یہ کہتے ہوئے میری دھاڑ نکل جائے گی۔